زبان وبیاں کی چاشنی اور عشق کے سوز وگداز کے ساتھ
کمالات سیرت کی عکاس ایک دلنشیں تحقیقی کتاب

محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں

(مقام مصطفیٰ ﷺ)

تقاریظ

مولانا مفتی سید مختار الدین شاہ صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث مولانا ڈاکٹر شیر علی شاہ صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث مولانا زاہد الراشدی صاحب دامت برکاتہم
شیخ الحدیث مولانا عبد السلام صاحب دامت برکاتہم

تالیف

حافظ محمد بدر عالم

مکتبہ حمادیہ
عقب جنرل بس سٹینڈ
اٹک شہر 057-2702702

محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں

(مقامِ مصطفیٰ ﷺ)

مئولف: مولانا بدر عالم صاحب

پیشکش: طوبیٰ ریسرچ لائبریری

toobaa-elibrary.blogspot.com

نام	محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں
تالیف	حافظ محمد بدر عالم
تعداد	گیارہ سو
قیمت	روپے
ناشر	مکتبہ حمادیہ اٹک

مکتبہ رحیمیہ اکوڑہ خٹک

کتب خانہ رشیدیہ راولپنڈی

مکتبہ دار الایمان الہ آباد ویسٹریج راولپنڈی

مکتبہ شہدا اسلام لال مسجد اسلام آباد

فہرست عنوانات

تقاریظ

مرجع العلماء، عمدۃ الاصفیاء، راس الاتقیاء، سیدی وسندی ومرشدی ومشفقی حضرت مولانا مفتی **سید مختار الدین شاہ** صاحب لازالت شموس فیوضھم بازغۃ علینا

الحمد لله رب العلمين والصلوة والسلام على خير البرية خاتم الانبياء والمرسلين محمد ذى الخلق العظيم وعلى اله واصحابه اجمعين امابعد

نبی کریم ﷺ فداہ ابی وامی کی سیرت مطہرہ اور حیات طیبہ قرآن کا عملی نمونہ اور حق کے متلاشیوں کے لئے ھدایت کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ہمارے لئے اسوۂ حسنہ اور عمدہ نمونہ قرار دیا ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت پڑھنے سے دلوں میں نبی کریم ﷺ کی محبت (جو کہ شرعاً مطلوب اور شرط ایمان ہے) بڑھتی ہے۔ ایمان ویقین میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کی وجہ سے نیک کام کرنے اور برے کاموں فواحش ومنکرات سے بچنے کی، اور آپ ﷺ کی پیروی کرنے کی توفیق ملتی ہے۔ جو شخص سیدھے دل سے اس کا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ اپنی ظرف واستعداد کے بقدر اس سے مستفید ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی سیرت مطہرہ اور اخلاق فاضلہ اور حالات کریمہ کو کوئی کیسے بیان کر سکے گا۔ جس کے متعلق خود اللہ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بے شک تم عظیم (حسن) اخلاق پر ہو۔ (القلم، آیت ۵)

جو شخص جس شخص کی اچھائی یا برائی، تنگدستی یا مالداری کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کو اپنے پیمانے میں ناپ کر بیان کرتا ہے۔ ایک نادار جو ایک ایک لقمہ کیلئے ترستا ہے سو روپے کے مالک کو مالدار قرار دیتا ہے۔ لیکن ایک کروڑ پتی اگر کسی کو مالدار کہتا ہے تو وہ اگر کروڑ پتی نہ ہو لاکھ پتی ضرور ہوتا ہے۔ یہاں سے اندازہ لگایئے کہ اللہ تعالیٰ جس بندے کے متعلق یہ فرمائے کہ!

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ بے شک تم عظیم اخلاق پر ہو

ان کے ایمانی صفات، حسن اخلاق اور خوبیوں کا اندازہ کرنا اللہ تعالیٰ کے بندوں کے لئے کس

طرح ممکن ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے ان کے بلند، عمدہ اخلاق اور خوبیوں کا اندازہ اللہ تعالیٰ کی عظیم ذات ہی کو ہو سکتا ہے۔ جس نے ان کو عظیم اخلاق اور خوبیوں کے ساتھ پیدا فرمایا ہے۔ اور ان کو رحمۃ للعالمین، سید الاولین والآخرین اور ختم نبوت کا تاج پہنایا ہے۔

چند روز قبل مولانا قاری بدر عالم صاحب زید مجدہم کی تالیف محمد (رسول اللہ ﷺ) قرآن کے آئینے میں کے پہلے حصے کے مطالعہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ بڑی خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے بڑی محبت، عقیدت اور عظمت کے ساتھ قرآن مجید کی آیتوں اور مستند تفاسیر کی عبارتوں کی روشنی میں آپ ﷺ کی سیرت طیبہ کو پیش کیا ہے۔ اور اس میں انہوں نے اس بات کی پوری کوشش کی ہے کہ توحید اور عقیدت ومحبت دونوں خلط ملط نہ ہونے پائے۔ نہ تو عقیدۂ توحید پر کوئی آنچ آئے اور نہ عقیدت ومحبت اور آپ ﷺ کے ادب واحترام میں کوئی خلل آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اپنے حدود کے اندر حسب مراتب اللہ تعالیٰ کی محبوب چیزوں اور شخصیتوں کا ادب واحترام بھی توحید میں داخل اور اللہ تعالیٰ ہی کی تعظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے

وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ ذٰلِكَ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ (سورۃ حج آیت ۳۱،۳۲)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو گویا وہ آسمان سے گر پڑا پھر یا تو پرندے اسے اچک لیں جائیں یا ہوا اس کو دور دراز مقام پر لا پھینکے یہ (بات) تو سن لی اور (اب یہ بات بھی سن لو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کی نامزد چیزوں کی تعظیم کرتا ہے تو یہ دلوں کی پرہیزگاری سے ہے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلٰهُكُمْ إِلٰهٌ وَاحِدٌ فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا

(اے پیغمبر لوگوں سے) کہہ دو کہ (جو حقائق اور معارف اور غیب کی خبریں تمہیں بیان کرتا ہوں یہ میرے ذاتی کمال واختیار سے نہیں بلکہ) میں بھی تمہاری ہی طرح ایک آدمی ہوں (اور تمہارے سامنے جو کچھ بیان کرتا ہوں یہ سب کچھ) میری طرف وحی کی جاتی ہے۔ (اور

اس رب کائنات نے مجھے یہ بنیادی وحی کی ہے کہ) تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ پس جس کو اپنے رب سے ملنے کی امید ہو اس کو چاہئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ ٹھہرائے (سورہ کہف۔ ۱۱۰)

اور دوسری جگہ ایسے الفاظ کے استعمال اور ایسے عمل جس میں نبی کریم ﷺ کی شان میں بے ادبی یا ایذا رسانی کا احتمال ہو کو کفر تک پہنچانے والا گناہ قرار دیتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو راعنا کہنے سے منع فرمایا ہے نیز یہ فرمایا ہے کہ

يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ أَنْ تَحْبَطَ أَعْمَالُكُمْ وَأَنْتُمْ لَا تَشْعُرُونَ إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ

اے ایمان والو: تم اپنی آوازیں نبی کی آواز سے بلند مت کرو اور نہ (اس سے بات کرتے ہوئے) اس طرح زور سے بولا کرو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال برباد ہو جائیں اور تم کو پتہ بھی نہ چلے بے شک جو لوگ رسول اللہ ﷺ کے حضور میں اپنی آوازیں پست رکھتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کیلئے جانچ لیا (اور منتخب کرلیا) ہے۔ ان کے لئے مغفرت اور اجر عظیم ہے۔ (الحجرات۔ آیت ۲،۳)

خلاصہ یہ کہ مولانا بدر عالم زید مجدہم نے اپنی اس تالیف میں عقیدۂ توحید اور عقیدت دونوں کا خیال رکھا ہے۔ اور اس باب میں صحیح راہ نمائی کی کوشش کی ہے۔

امید ہے کہ اس کے مطالعے سے نبی کریم ﷺ کی محبت بڑھے گی اور اخلاص کے ساتھ نبی کریم ﷺ کی پیروی واتباع نصیب ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس کاوش ومحنت کو قبول ومقبول فرمائے۔ اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو مستفید فرمائے۔

بندہ مختار الدین کربوغہ شریف

۲۷ ربیع الاول ۱۴۳۰ھ

(نوٹ) حضرت کی تقریظ عنوان "سید الوسط" کے متعلق نہیں ہے۔

مخدوم العلماء مرشد المجاہدین مولانا ڈاکٹر **شیر علی شاہ** المدنی صاحب دامت برکاتہم العالیہ پی۔ ایچ۔ ڈی (گولڈ میڈلسٹ) مدینہ یونیورسٹی، شیخ الحدیث دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

الحمدللہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی: اما بعد

محترم حضرت مولانا محمد بدر عالم صاحب کی گرانقدر وقیع تالیف ﴿محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں﴾ کے بالاستیعاب مطالعہ سے دل ودماغ منور ومعطر ہوئے ماشاءاللہ

تمام کتاب من البدایۃ الی النہایۃ اپنی پرکشش، روح پرور، ایمان افروز، تفسیری جواہر، زرین حقائق وموضوعات کے پیش نظر دو ہی نشستوں میں پورے وجد وکیف، ذوق وشوق کے عالم میں پڑھ لی ہے۔ زینت کون مکان فخر الانبیاء ﷺ کی سیرت مبارکہ پر ہر زمان وہر زبان میں کئی کئی جلدوں میں ضخیم کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر

ہر گلے را رنگ وبوئے دیگر است

محترم مولانا محمد بدر عالم نے محبوب رب العلمین ﷺ کے ساتھ بے پناہ محبت وعقیدت، انتہائی عظمت واحترام کی فضاؤں میں اللہ تعالی کی مقدس کتاب ہی سے معتمد ومستند تفاسیر کی روشنی میں سیرت مطہرہ کے متنوع خصائص وکمالات، اوصاف ومناقب، فضائل وشمائل کو ایک نرالے جاذب قلب ونظر انداز میں فصاحت وبلاغت سے مرصع ادیبانہ لہجہ، سلیس شگفتہ اردو زبان میں محبان مصطفی ﷺ کو عظیم الشان تحفہ عسل مصفی کی شکل میں پیش کیا ہے۔

یقیناً رب ذوالجلال، خالق حسن وجمال نے اپنی ازلی ابدی کتاب میں اپنے برگزیدہ پیغمبر ﷺ کو توصیف ومدح سے جو سرفرازی بخشی ہے۔ اس سے بڑھ کر کسی بھی واصف اور مداح کی تعریف وتوصیف نہیں ہوسکتی۔

خدا مدح آفرین مصطفی بس — محمد حامد حمد خدا بس

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ اور دیگر متعدد آیات کریمہ میں شان مصطفی کو مطالعہ کرنا چاہئے۔ خاص کر حضرت مولانا عبدالحق حقانی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر فتح المنان میں

وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے ذیل میں جو تفسیر بیان کی ہے وہ ہر عاشق صادق کو حرز جان بنانا چاہئے۔

محترم مولانا محمد بدر عالم صاحب کو قرآن مجید کے عجائب ونکات، حقائق ودقائق، اسرار ورموز کے بحر ذخار سے علمی جواہر ویواقیت نکالنے کا حد درجہ شوق وشغف ہے۔ جس کے لئے وہ متعدد تفاسیر پر عمیق ودقیق نظر رکھتا ہے۔ جس کی بدولت یہ مایہ ناز گنج گرانمایہ ﴿محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں﴾ منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوکر پڑھنے والوں سے خراج تحسین وسپاس وصول کر رہا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے کیا خوب فرمایا ہے

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب — گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف

ان شاء اللہ تعالی سعید الارواح، خوش قسمت حلقہ بگوشان اسلام، فدایان مصطفی ﷺ اس زرین کتاب کو پورے اخلاص، بصدق نیت، خلوص قلب سے خود بھی اور اپنے حلقہ احباب سے بھی استفادہ کی تلقین فرمائیں گے

پروردگار ذوالمنن محترم مولانا محمد بدر عالم صاحب حفظہ اللہ تعالی ورعاہ کی اس عالمانہ محققانہ کاوش کو شرف قبولیت عطا فرماوے اور مداحین مصطفی ﷺ کی فہرست میں ان کا نام مسجل فرماوے۔ وماذالک علی اللہ بعزیز

وصلی اللہ تعالی علی سید الاولین والآخرین وقائد الغر المحجلین وسائق المؤمنین الی جوار رب العلمین رسول الرحمۃ ونبی السلام وامام الھدیٰ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

کتبہ شیر علی شاہ کان اللہ لہ
خادم اھل العلم، بجامعۃ دارالعلوم حقانیہ
۲۵-۱-۱۴۳۰ھ

مفکر اسلام، ژرف نگاہ دانشور حضرت مولانا **ابو عمار زاهد الراشدی** صاحب
ممتاز کالم نگار، مدیر مجلہ الشریعہ و شیخ الحدیث جامعہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ

نحمدہ تبارک وتعالیٰ ونصلی ونسلم علیٰ رسولہ الکریم وعلیٰ آلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین ام المومنین حضرت عائشہؓ نے جناب نبی اکرم ﷺ کے اخلاق مبارکہ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "کان خلقہ القرآن"۔ نبی اکرم ﷺ کے اخلاق وعادات کا سرچشمہ قرآن کریم ہی ہے۔ گویا قرآن کریم میں جو کچھ بیان فرمایا گیا ہے، اسے اگر عملی شکل میں دیکھنا چاہو تو جناب نبی اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کو دیکھ لو۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے اوصاف وکمالات کو جس خوبی اور کمال کے ساتھ قرآن کریم نے بیان کیا ہے، کسی اور جگہ اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ کے خالق اور انھیں کمالات واوصاف عطا فرمانے والے ہیں اور وہی انھیں صحیح طور پر بیان بھی کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے جناب نبی اکرم ﷺ کی بہت سی خوبیوں اور حیثیتوں کا تذکرہ فرمایا ہے جن کی تشریح وتوضیح میں امت کے اہل علم گزشتہ چودہ سو برس سے مصروف ہیں اور ہر دور میں علم ومعرفت کے اس بحر ناپیدا کنار کے شناور اس میں غوطہ زن ہو کر نئے نئے موتی ارباب ذوق کی خدمت میں پیش کرتے رہے ہیں جس کا سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔ زیر نظر کتاب "محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں" بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے باذوق مصنف نے قرآن کریم میں جناب نبی اکرم ﷺ کے بیان کیے جانے والے اوصاف وکمالات کا ذوق ومحبت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور ممتاز اہل علم کی عبارات کی روشنی میں ان کی وضاحت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ مصنف کی اس محنت کو قبول فرمائیں اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نفع بخش بنائیں۔ آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۲۵ رجنوری ۲۰۰۹

استاذ الاساتذہ وتصویر اکابر شیخ الحدیث والتفسیر حضرت مولانا **عبدالسلام** صاحب
دامت فیوضہم العالیہ مہتمم جامعہ اشاعۃ القرآن حضرو

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم پیش خدمت کتاب «محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں» اسم بامسمی کتاب ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ آپ کے اخلاق وہ ہیں جو قرآن میں ہیں۔

عظمت رسول کا پہلا عنوان: اللہ تعالیٰ نے رسول پاک ﷺ پر نبوت ختم فرمائی تھی۔ آپ کے بارے میں بعثت سے پہلے چار اشارے قرآن ذکر فرماتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ نے ازل میں ایک وعدہ تمام ارواح بنی آدم سے لیا اور سب سے اپنی ربوبیت اور توحید کا اقرار کروایا جسے عہد الست کہا جاتا ہے۔ (الاعراف) دوسرا وعدہ تمام انبیاء کرام کی ارواح سے لیا "اگر میرا وہ رسول جو تم سب کی تصدیق کرنے والا ہے تمہارے دور میں آ گیا تو تم نے اس پر ایمان بھی لانا ہے۔ اور اس کی مدد بھی کرنی ہے" (ال عمران) اور تمام نبیوں کی تصدیق کرنے والے حضرت محمد ﷺ ہی ہیں۔

(۲) رسول پاک ﷺ کی بعثت سے کئی صدیاں پہلے تعمیر کعبہ کرتے وقت ابراہیم نے ایک ایسا رسول بھیجنے کی دعا مانگی جو قرآن پاک سنائے کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور تزکیہ کرے (البقرہ) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہارے باپ ابراہیم کی دعا ہوں، مجھے بھیج کر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم کی دعا قبول فرمائی ہے۔

(۳) آپ کی بعثت سے کئی صدیاں پہلے موسیٰ نے اپنی امت کی دنیا وآخرت کی بھلائی کیلئے دعا مانگی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ دنیا وآخرت کی بھلائی میں نے الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ ... الخ اسی نبی کے پیروکاروں کے لئے لکھ دی ہے وہ نبی جس کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے۔

(۴) رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے ۵۷۰ سال پہلے حضرت عیسیٰ نے نام لیکر آپ کی آمد کی بشارت دی وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِن بَعْدِي اسْمُهُ أَحْمَدُ ... الخ یہ صراحت اس لئے فرمائی تا کہ اس رسول کی

تعین میں ابہام نہ رہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی پیش گوئیاں جو قرآن پاک میں موجود ہیں بائبل میں تحریف کے باوجود آج بھی یہ پیش گوئیاں موجود ہیں۔ جیسا کہ کتاب استثناء کے باب ۳۳ میں ہے کہ" خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور ہزاروں قدسیوں کے ساتھ آیا اس کے داہنے ہاتھ پر آتشیں شریعت ان کے لیے تھی"۔

خداوند کے سینا سے آنے کا مطلب موسیٰ کو تورات عطا فرمانا ہے۔ کوہ شعیر سے طلوع ہونے کا مطلب عیسیٰ کو انجیل دینا ہے۔ اور فاران سے جلوہ گر ہونے کا مطلب اللہ تعالیٰ کے قرآن پاک نازل کرنے کا اشارہ ہے۔ کیونکہ فاران مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۱، آیت ۲۰ میں اسماعیل کے حال میں ہے کہ وہ فاران کے بیابان میں رہتا تھا۔

دوسری بشارت یہ پیش گوئی جو انجیل یوحنا کے آخری باب میں ہے "اگر تم مجھ سے محبت کرتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا فارقلیط بخشے گا کہ ابد تک وہ تمہارے ساتھ رہے" (باب ۱۴ آیت: ۱۵)

فارقلیط کا ترجمہ "محمد" یا "احمد" ہے ان دو بشارتوں کے علاوہ اٹھارہ بشارتیں ہیں جو موجودہ بائبل میں موجود ہیں جن کا مصداق محمد کے سوا کوئی نہیں ہے۔ انہی بشارتوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اہل کتاب رسول اللہ ﷺ کو بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ)

دوسرا عنوان: ان فضائل کے باوجود قرآن عزیز میں رسول اللہ ﷺ سے یہ اعلان کرائے گئے۔

(۱) قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (الکہف) آپ کہہ دیجیے یقیناً میں بشر ہوں تمہاری مثل

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا۔ (بنی اسرائیل) آپ کہہ دیجیے میرا رب شریکوں سے پاک ہے۔ میں تو بشر رسول ہوں۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (حم سجدہ۔ ۶) آپ کہہ دیجیے میں تمہاری طرح کا انسان ہوں میری طرف وحی کی جاتی ہے یقیناً تمہارا الہ ایک ہی الہ ہے۔

ان تین مقامات پر آپ سے یہ اعلان کروایا گیا کہ میں تمہاری طرح انسان ہوں۔ صحیح بخاری میں آپ نے فرمایا "میری شان میں اس طرح مبالغہ آمیزی نہ کرو جیسے عیسائیوں نے عیسیٰ کے بارے میں غلو

کیا۔ بلکہ میرے بارے میں کہو اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔" (صحیح بخاری)

(۲) اس آیت میں تین باتیں آپ سے کہلوائی ہیں

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ آپ کہہ دیجیے میں تمہیں نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ اور نہ ہی میں غیب جانتا ہوں وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ اور نہ میں تمہیں کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں (الانعام)

واقعہ معراج میں جو تمام انبیاء علیہم السلام میں صرف آپکو کرایا گیا آپ کی تمام صفات کمالیہ میں سے "عبدہ" کی صفت ذکر کی گئی۔ سُبْحٰنَ الَّذِيْٓ اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ

(۳) قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (الجن) آپ کہیے تمہارا برا اور راہ پر لانا میرے اختیار میں نہیں۔

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۖ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ

آپ کہیے میں اپنی جان کے بھلے برے کا مالک نہیں مگر جو اللہ چاہے۔ اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو بہت کچھ بھلائیاں حاصل کر لیتا اور مجھے برائی کبھی نہ پہنچتی۔ میں تو بس ڈرا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ایمان والوں کو (الاعراف)

اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذکر خیر کو بلند کرنے کے لئے کلمہ طیبہ و کلمہ شہادت میں پہلے توحید پھر آپ ﷺ کے نام و رسالت کی گواہی لازمی قرار دی، پانچ وقت کی اذان و اقامت، نماز کے آخر درود میں آپ کا ذکر خیر ہے۔ جمعہ اور عیدین کے خطبوں میں بھی آپ کا ذکر خیر ہے۔ حدیث پاک میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

اِذَا ذُكِرْتُ ذُكِرْتَ میرے پیغمبر جہاں میرا ذکر ہو وہاں آپ کا بھی ذکر ہوگا

تیسرا عنوان:

اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰۗىِٕكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَي النَّبِيِّ ۭ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا

اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں۔ اے ایمان والو تم بھی ان پر صلوۃ اور خوب سلام بھیجو۔

اللہ تعالیٰ کا صلوۃ رحمت اور فرشتوں کا صلوۃ استغفار ہے۔ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا ہم سلام پڑھنا جانتے ہیں اس سے مراد نماز میں السلام علیک ایھا النبی پڑھنا ہے اور صلوۃ کیسے پڑھیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللھم صل علی محمد ... الخ نماز والا درود پڑھو

قرآن حکیم کے بعد رسول اللہ ﷺ کی سیرت پر ہر دور میں کتابیں لکھی گئیں لیکن آپ کی سیرت کا حق ادا نہ ہوا ہے اور نہ کوئی کتاب حرف آخر ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت کی جامعیت ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کا کوئی پہلو مخفی نہیں رہا جبکہ یہود و نصاریٰ اپنے انبیاء کرام کی سیرتیں جمع کرنا تو در کنار تورات و انجیل اللہ کی کتابیں بھی محفوظ نہ رکھ سکے۔

پیش نظر کتاب (محمد ﷺ قرآن کے آئینے میں) کے مصنف حضرت مولانا حماد حسینؒ فاضل دیوبند کے پوتے ہیں۔ حضرت مولانا حماد حسین کی اولاد میں علماء کرام، قراء عظام، حفاظ کرام کثیر تعداد میں دینی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ فاضل محترم مولانا قاری بدر عالم صاحب مہتمم مدرسہ قاسم العلوم حماد یہ اٹک نے یہ کتاب تصنیف کی ہے۔ قرآن عزیز کی روشنی میں صاحب قرآن ﷺ کی سیرت کے مختلف پہلو بیان کیے گئے ہیں کتاب کا موضوع اور عنوان اور اس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کا کلام آفتاب آمد دلیل آفتاب کی طرح عیاں ہے۔ عقیدت اور حقیقت کا یہ مجموعہ مصنف مذکور کا سیرت رسول ﷺ کے میدان میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سعی کو قبول فرمائے اور مصنف کو دنیا آخرت میں اس کی بہتر جزائے خیر عطا فرمائے۔

راقم نے مسودہ کا مطالعہ مناظر اسلام حضرت مولانا قاری چمن محمد صاحب مدظلہ استاذ حدیث جامعہ عربیہ اشاعت القرآن سے کرایا اور اس تبصرہ کے لکھنے پر عزیز مکرم مولوی محمد رضوان بن شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد صابر صاحب نے معاونت کی۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء

راقم التحریر

عبدالسلام خادم جامعہ عربیہ اشاعت القرآن حضرو اٹک

۱۳ جمادی الثانی ۱۴۳۰ھ 7 جون 2009 یوم الاحد

انتساب

سہ پہر ڈھل چکی ہے۔ ایک معصوم صورت سات آٹھ سالہ بچہ گھر کی دہلیز سے باہر کھڑا ہے۔ یتیمی کا داغ اور بیسری کی تنگی اس کے چہرے سے نمایاں ہے۔ اس کی بے تاب نگاہیں گلی کی نکڑ پر کسی کو کھوج رہی ہیں۔ کسی ان دیکھے جذبے کی حدت اور ڈھلتے سورج کی تمازت سے اس کی پیشانی تمتما رہی ہے۔ موڑ کاٹ کے ایک بزرگ سائیکل سوار اچانک سامنے آئے۔ نظر پڑتے ہی وفور محبت سے بچہ چلایا! جی اوروں پہلوں میں دیکھا۔ جی اوراں پہلوں میں دیکھا۔ یوں جیسے اس نے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو۔ اس کے لئے یہ پہچان معرکے سے کم نہ تھا کیوں کہ اس نے گھر کی بزرگ خاتون سے جی اوروں کو سب سے پہلے دیکھنے کی شرط لگا رکھی تھی۔ بچپن ماضی کی یاد اور مستقبل کے غم سے آزاد زندگی۔ ہر عام کو خاص بنا لینے کی عمر۔ معصوم خواہشوں اور ننھی ننھی خوشیوں کا زمانہ۔ شکیں چاہتوں کا ہالہ اور حجریں محبتوں کا حوالہ۔ معصوم محبت کی یہ بھی ایک ادا تھی۔

جی اوری قریب آئے۔ دراز قد، دبلا پتلا جسم، چھریرا بدن، سیاہ شیروانی، طرے دار کلاہ، کتابی چہرا، بلند ناک، بچھی ہوئی سفید داڑھی، برسوں پرانی رفیق سائیکل کے کیریئر پر گھاس کی بوری لدی ہوئی، بزرگوں کی طرح اگلی طرف سے ٹانگ نکال کر نیچے اترے۔ جسم ابھی کمان تھا کہ بچے کے ہاتھ پھیلے اور ہنستے مسکراتے جی اوروں نے ایک آنہ بچے کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ایک آنہ، چھ پیسے روزانہ کا جیب خرچ اور ہر روز کا معمول

کچھ وقت کھاریاں کینٹ گزار کر واپس آیا اور ساتھ اس ماحول کا تحفہ تھری پیس سوٹ بھی لیتا آیا۔ چند دن بعد یہی کپڑے پہنے۔ خراماں خراماں باہر آیا۔ جی اوری سامنے ہی کھڑے تھے۔ دیکھتے ہی نگاہوں کا زاویہ اور چہرے کا رنگ بدل گیا۔ محبت کی نرمی کے بجائے غصے کی کرختگی جھلکنے لگی۔ پہلا اور آخری زوردار تھپڑ مار کر کپڑے اتروا دیے۔ بچے کی برکت تھی یا تھپڑ کی کرامت۔ اس دن سے انگریزی تمدن کی نفرت بچے کی طبیعت کا حصہ بن گئی۔

انتساب ایک ریت ہے۔ یہی ریت پوری کرتے ہوئے کتاب ان سے منسوب کرتا ہوں جن کے عکس میری یاد کی جھیلوں میں اب تک جھلملاتے ہیں۔ مرحوم و مغفور مولانا حافظ **حماد حسین** نور اللہ مرقدہ دیوبند کے طالب علم، حضرت مدنیؒ کے فیض یافتہ، حضرت کشمیریؒ کے شاگرد، علامہ حقانیؒ کے تلمیذ، جامعہ اسلامیہ ڈابھیل کے اولین فاضل، میری چاہتوں کے سب رنگ اور جی اوری تھے۔ ان کی بڑی خواہش اور دعائیں تھیں میرا پوتا عالم فاضل بنے۔ یہی خواہش لئے 1983ء کی ایک صبح دار فنا سے عالم بقا کو سدھار گئے اور میں ان دعاؤں کی قبولیت کا منتظر فریادی ہوں

تم کیا گئے روٹھ گئے دن بہار کے

دیباچہ

اللہ ہی حمد وستائش کا مستحق ہے جس نے چار سو پھیلی رنگ و نور سے مزین کائنات بنائی ہے۔ یہ حسن کا مرقع اور بداعت کا نمونہ ہے۔ صناعت کا شاہکار اور تخلیق کا کمال ہے۔ دل آویز اور خوش نظر ہے۔ حرکت وگردش میں منظم ومرتب ہے۔ اصولوں میں محکم اور ضابطوں میں اٹل ہے۔ تخلیق میں عیب سے خالی اور نقص سے عاری ہے۔ بناوٹ میں کجی اور ٹیڑھ سے پاک ہے۔ اللہ کے وجود کی دلیل اور ایک مقصود کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ وہ رب کائنات بصد ہزار لائق حمد کیوں نہ ہو جس نے تسخیر کائنات کی ان دیکھی لگامیں عقل کے ہاتھوں میں تھما کر اس کا چراغ انسان کے دماغ میں روشن کیا تاکہ وہ دال سے مدلول اور واسطے سے مقصود تک پہنچ سکے اور خالق کائنات کی معرفت کے دروازے اس پر کھل جائیں۔

ہم پر اس کے لطف وعنایات کی بارش اور مہر ومحبت کا وہ تسلسل ہے جس میں کہیں انقطاع و روک نہیں۔ اس کی کریمانہ عطاؤں اور خسروانہ مراحم کا یہ بھی ایک مظہر ہے کہ اس نے صرف ہماری عقل کو اپنی شناخت کا معیار نہیں بنایا بلکہ اس کے لئے اپنے فرستادے بھیجے۔

ان مرسلین میں مقصود کائنات محمد ﷺ کی ہستی نمایاں مقام رکھتی ہے۔ وہ جو نفس کمال اور قدم قدم جمال ہے۔ جو خوبیوں کا جھرمٹ، بلندیوں کا حوالہ اور عظمتوں کی معراج ہے۔ بے عنواں مسافتوں کے شب گذار راہیوں کے لئے ہدایت کا آخری چراغ ہے۔ وہ جو کرن کا پیراہن ور کا تڑکا اور مامون دن کا اجالا ہے۔ قدسیوں کی جماعت جس کا حلقہ اور کونین جس کا ہالہ ہے۔ نقش کائنات کے ہر نقطے پر جس کا سایا ہے۔ آپ پر اللہ کی رحمتیں برکھا کی رت بن کے اتریں۔ آپ خدا کا خاص انتخاب اور اس کے ہر کرم کا عنوان ہیں۔ مجتبی و مصطفیٰ، دلیل توحید اور زینت کائنات ہیں۔ آپ کی اتباع خوش بختی کی علامت اور اطاعت نجات کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی معرفت آپ کے بغیر حاصل نہیں ہو

سکتی۔ اتباع اور اطاعت کے لئے عشق کا گداز اور محبت کی گرمی چاہیے۔

محبت نہاں خانہ دل میں پوشیدہ وہ جذبہ ہے جو کمال ونوال سے بیدار ہوتا ہے۔ جمال کی دل ربا ادائیں اسے جذب کرتی ہیں۔ عظمت ورفعت سے محبت عقیدت میں ڈھل جاتی ہے۔ دل کی بستی میں اگر کوئی مکیں ہو جائے تو قلب ونظر اس کے حضور جھک جاتے ہیں اور زبان اس کی مدح وثنا سے تر ہو جاتی ہے۔

من أحب شيئاً أكثر ذكره

جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ کثرت سے اسکا ذکر کرتا ہے

اطاعت وانقیاد محبت کی آبرو ہیں۔ اطاعت میں کمزوری محبت میں ضعف کی دلیل ہے۔ محبت کی پختگی اطاعت میں اضافے کا سبب ہے۔ حضور ﷺ کی ذات جامع الکمالات ہے۔ آپکی ہر شان امتیازی اور منفرد ہے۔ کوئی آپ کے کمالات کی گرد بھی نہیں پا سکتا۔ کسی شخص میں تاب نہیں کہ آپ کے مکمل اوصاف بیان کر سکے۔ ہر ایک آپ کی خوبیاں اپنے علم کی بساط تک ہی بیان کرتا ہے۔ آپ کے اوصاف اور کمالات سامنے آئیں گے تو آپ کی محبت میں اضافہ ہوگا۔ اطاعت واتباع اس محبت کا پھل ہیں۔ یہی ہمارا مقصود ہے۔ آپ کے کمالات کا تذکرہ آپکی تعریف ہے۔ آپکی تعریف بجائے خود موجب اجر وثواب ہے۔ محبت اس کا اضافی فائدہ ہے۔

آپ کا مداح خود خدا ہے۔ جس نے آپ کا ذکر قرآن کے سینے میں نقش کر کے آپ کو قرآن کا محور بنایا۔ اللہ نے آپ کے جو کمال بیان کئے ان سے بڑھ کر کیا کمال ہو سکتا ہے؟ جن خوبیوں کا اللہ نے تذکرہ کیا ان سے عمدہ خوبی اور کون سی ہو سکتی ہے؟ جن الفاظ میں اللہ نے آپکی تعریف کی ان سے بہتر الفاظ کیا ہو سکتے ہیں؟ وہ الفاظ سب سے بہتر وہ خوبیاں عمدہ ترین اور وہ کمالات سب سے اعلیٰ ہیں جو اللہ نے ارشاد فرمائے۔ محمد ﷺ قرآن کا نگینہ ہیں۔ آپکی خوبیاں قرآن کے ماتھے کا جھومر ہیں۔ صفات قرآن کا بانکپن ہیں۔ قرآن کے الفاظ محمد کی گزرگاہیں ہیں۔ محمد ﷺ گلستان قرآن کا اعلیٰ ترین پھول ہیں۔ ہر صفحے کے بین السطور محمد کی جھلک ہے۔ ہر مضمون میں آپ پوشیدہ ہیں۔ قرآن آپ کے کمالات سے یوں آراستہ ہے جیسے ستاروں سے آسمان

مزین ہے۔

خدا کے کلام سے محمدی کمالات بیان کرنا بڑی خوش نصیبی ہے۔ مقدر کی یاوری اور اللہ کی توفیق ہے۔ اس میں قندِ مکرر کا مزہ، عنبر و گلاب کا لطف اور شراب تسنیم کی ترنگ ہے۔ اللہ کا ذکر بھی محمد ﷺ کی تعریف بھی۔ قرآن کی تلاوت بھی اور آپ ﷺ ذکر خیر بھی۔ اللہ کی شان بھی مصطفیٰ کا کمال بھی۔

اللہ کے کلام سے اخذ کر کے شان مصطفیٰ میں کچھ اوراق میں نے نقل کیے ہیں۔ یہ قرآن کی آیتوں پر مشتمل ہیں۔ مستند کتابوں سے انکی تفسیر و توضیح لی گئی ہے۔ ان سے جہاں آپ کی شان نمایاں ہوتی ہے وہیں کلام الٰہی کے محاسن بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ آپ کی تعریف و توصیف میں قرآن ہی اصل اور معیار ہے۔ قرآن آپ کا مداح و ثنا خواں بھی ہے اور آپ کے مقام و مرتبے کا محافظ بھی۔ ہر عاشق صادق نے قرآن کے نور سے اقتباس کر کے ہی آپ کی مدح و ثنا سے اپنی عاقبت سنواری ہے۔

سبب تالیف:

اس تالیف کا سبب درج ذیل وجوہ ہیں

ا۔ میرے لئے صدقہ جاریہ ہو۔ میں اس پر اجر ثواب کا طلب گار اور اللہ کے فضل کا امیدوار ہوں۔

ب۔ عشق مصطفیٰ کی آرزو اور دولت اتباع کے حصول کی خواہش۔

ج۔ روز محشر آپ کی شفاعت نصیب ہو جائے۔ کسی کے دل میں اس کے مطالعہ سے حُبّ مصطفیٰ کی کرن پھوٹی اور الفت پیغمبر کی کلی کھل گئی تو یہ نور علیٰ نور ہوگا۔

یہ اوراق پریشاں عقیدت کے پھول اور احترام کے موتی ہیں۔ حمد و نعت کے گجرے اور مدح و ثنا کی سوغاتیں ہیں۔ ادب کی لڑی میں پروئے ہوئے محبت کے مروارید ہیں۔ انہیں لے کر سرور کونین ﷺ کے حضور حاضر ہوا ہوں۔ کلام اللہ کا ہے شان رسول اللہ کی ہے اس نسبت سے جواہر ریزے ہیں۔ پھولوں کی ٹوکری اور ہیروں کا ہار ہیں۔ مجھ کمترین کی نسبت سے دیکھو تو سنگریزوں سے زیادہ وقیع نہیں۔ بضاعت مزجات ہے۔ سوت کی انٹی ہی سہی یوسف کے خریداروں میں نام

تو آجائیگا۔

میری قسمت سے الٰہی پائیں یہ شرف قبول پھول کچھ میں نے چنے ہیں گلستان کے لئے

خیال سے الفاظ اور ارادے سے تحریر تک کے سفر میں رسالے کا روپ کتاب کا ہو گیا ہے۔ گمان تک نہ تھا کہ ذہن میں جس کا حجم پچیس تیس صفحات سے زیادہ نہیں اس کا مضمون ایسی ہی مزید کتابوں کا تقاضا بھی کرے گا۔ محمد کی کہانی خدا کی زبانی یہ ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا کا مصداق ہے۔ مجھے یہ موضوع بہت پیارا ہے۔ ابتدائی طور پر آپ کے مقام اور سیرت کے حوالے سے کچھ آیات جمع کیں۔ خیال تھا ان کا ترجمہ اور سرسری نظر میں سامنے آنے والے کچھ نکات بیان کرنا کافی ہوگا۔ اس مقصد کے لئے جب تفسیروں کی ورق گردانی شروع کی تو معلوم ہوا یہاں تو ہر گام ایک نیا منظر نگاہوں کے سامنے ہے اور ہر رخ اک نیا پھول اپنی بہار دکھلا رہا ہے۔ تفاسیر علم کی ایسی وادیاں ہیں جہاں ہر راستے پر شان مصطفیٰ کے رنگ چمک رہے ہیں اور حرکت و سکون کے ہر پتے پر مقام مصطفیٰ کے چراغ روشن ہیں۔ ان وادیوں میں چاروں طرف مصطفیٰ کی خوشبو بسی ہوئی ہے۔

کس منظر سے نگاہیں چراؤں اور کس پھول کی خوشبو۔ کون سا دیا اٹھاؤں اور کس راہگذر سے ہاتھ؟ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا۔ بنام خدا قلم سنبھالا اور حاصل مطالعہ لکھنا شروع کر دیا۔ بارہا ایسے مقام آئے جہاں قلم کند ہو گیا۔ اللہ کی رحمت نے دستگیری کی۔ ایک غیبی ہاتھ میں نے اپنی پشت پر محسوس کیا۔ ارادے کو تحریک اور جذبے کو توانائی ملتی رہی۔ بالآخر ایک سال کے عرصہ میں یہ ایک حصہ تیار ہو گیا۔ یہاں یہ بتانا بے معنی نہ ہوگا کہ مجھ میں اس کام کی لیاقت اور صلاحیت نہیں تھی۔ کیونکہ یہ موضوع جتنا مبارک اور پر اثر ہے اتنا ہی نازک اور مشکل بھی ہے۔ جتنا رنگین ہے اتنا ہی سنگین بھی ہے۔ تعریف میں بھی کمی نہ ہو۔ مقام کو بھی نقصان نہ پہنچے۔ فرق مراتب بھی ملحوظ رہے اور رشتہ عقیدت بھی ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ یہ عام آدمی کی بات نہیں اللہ کے محبوب کی بات ہے۔ بس اللہ کی توفیق تھی اور اس کے محبوب کی نسبت جس سے یہ کام انجام پایا۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اسی کے زیر اثر میں نے اس کی ترتیب میں بہت کاوش کی۔ ایک ایک عنوان کئی

بارلکھا۔ الفاظ کے چناؤ میں کوشش اور احتیاط سے کام لیا۔ پھر بھی نادانستہ غلطی کا امکان ہے۔ غلطی میری لغزش قلم کا نتیجہ اور خوبی اللہ کی طرف سے ہے۔ آپ نشان دہی فرمائیں گے تو کار ثواب ہوگا۔

ناسپاسی ہوگی اگر حضرت مولانا مفتی فتح محمد صاحب کا تذکرہ نہ کروں۔ بہت خوبیوں کے مالک، مخلص دوست اور قدر دان بزرگ ہیں۔ دوران تالیف انہوں نے ہر طرح سے میری اعانت اور راہ نمائی فرمائی۔ میں تہہ دل سے حضرت کا ممنون ہوں۔ عزیز برخوردار خاور محمود کا شکر گذار ہوں جس نے دل جمعی سے اس کا کافی حصہ ٹائپ کیا۔ اور ان تمام دوستوں کا شکریہ بھی ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس سلسلے میں کسی طرح کا تعاون بھی کیا۔ اللہ ان تمام حضرات کو جزائے خیر دے اور جنت کی ابدی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ امین

محمد بدر عالم اٹک

ibntaqi1970@gmail.com

ابتدائے سخن

تقریباً پندرہ سو سال پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھو۔ زمین پر ایک بڑا فساد برپا ہو چکا ہے۔ انسانیت اپنا راستہ بھٹک چکی ہے۔ گنتی کے دو چار نفوس ہیں جنہوں نے توحید کی شمع سنبھال رکھی ہے۔ یہ لرزتی کانپتی لو بجھنے ہی والی ہے۔ شرک کا اندھیرا عفریت کی طرح چھا چکا ہے۔ یہ کمزور روشنی اسے دور کرنے کی تاب نہیں رکھتی۔ ہدایت کا راستہ تاریک ہو چکا ہے۔ نجات کا دروازہ بند ہو چکا ہے۔ اللہ کے فرستادے وقت کے دھندلکوں میں کھو چکے ہیں۔ انکا پیغام بدل دیا گیا ہے۔ عبادت رسموں کی اسیر ہو چکی ہے۔ مذہب خواہشات کا قیدی بن چکا ہے۔ عقیدہ افیون کی پڑیا ہے۔ دین رسوم کی چڑیا ہے۔ کچھ لوگ اسکے اجارہ دار ہیں۔ دھرم کے یہ بیوپاری گناہوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ دین انکا لبادہ، شریعت ان کا کھیل اور مذہب ان کے گھر کی لونڈی ہے۔ خدا کے نام پر آباء اور اکابر پرستی ہو رہی ہے۔ رسمیں پاؤں کی بیڑیاں ہیں۔ رواج گردنوں کا طوق ہیں۔ وہم عقیدے بن چکے ہیں۔ اخلاق دفن ہو چکے ہیں۔ طاقت اور اقتدار ان کے نائب ہیں۔ نفس پرستی زندگی کا اصول ہے۔ عیاشی اور بدکاری اس کا حاصل ہے۔ جبر کی چکی چل رہی ہے۔ ظلم کے دانت تیز ہو چکے ہیں۔ انصاف بھکاری ہے۔ انسان ہی انسان کا غلام اور انسان ہی انسان کا خدا ہے۔ ملک گیری کی ہوس لاکھوں آدمیوں کی بھینٹ لے چکی ہے۔ معاشرہ کئی طبقوں میں بٹ چکا ہے۔ علم کے سوتے خشک ہو چکے ہیں۔ مظاہرہ پرستی نے نگاہوں پہ عقیدت کے پردے ڈال دیے ہیں۔ یہ دیوتاؤں کے روپ ہیں۔ ان کے بارے میں سوچنا بھی ناقابل معافی جرم ہے۔ ہر چیز اپنے مقام سے ہٹ چکی ہے۔

آسمان ورطہ حیرت میں ہے۔ فضاؤں میں سناٹا ہے۔ دیکھئے پردہ غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔ فساد انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے۔ ایسی ہستی کی طلب ہے جو کایا پلٹ دے۔ حالات کی رفتار اس ذات کی طلب گار ہے جو توحید کی زمزمہ خواں ہو۔ ایسی توحید جسے

شرک کا میل مکدر نہ کر سکے۔ وہ ذات جو ہدایت کا تاریک راستہ روشن کر دے۔ نجات کے بند دروازوں کی کلید ہو۔ پچھلے رسولوں پر پڑی ہوئی وقت کی گرد صاف کر دے۔ انکی رسالت و عظمت کی تصدیق کرے۔ روح کو بالیدہ، دماغ کو مجلیٰ، فکر کو مصفیٰ اور دل کو روشن کر دے۔ توہمات کو دفن کر دے۔ مضبوط اور صحیح عقائد پر دین کی بنیادیں استوار کرے۔ ایسا دین جو زندگی کی حرارت سے لبریز ہو۔ رسموں کی بیڑیاں کاٹ دے۔ رواجوں کے طوق اتار دے۔ اخلاق کو بلند کرے۔ انسان کو انسان کی غلامی سے نجات دے۔ مظاہر پرستی کا قلع قمع کر دے۔ عقل کو اس کا صحیح مقام بخشے۔ کمند عقل سے فصیل کائنات کو مسخر کرے۔ نفع بخش علوم کو زندہ کرے۔ عیاشی اور نفس پرستی کے بجائے قناعت اور خدا پرستی کی تعلیم دے۔ ظلم و ستم کے بجائے عفو و شفقت اور رحم و کرم کا سبق سکھائے۔ تعصب کے بجائے تصلب اور رواداری کا درس دے۔

اچانک ایک تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ زمین کی تنی نسیں ہوئی ڈھیلی پڑ جاتی ہیں۔ آسمان جھوم اٹھتا ہے۔ کلیاں مہکنے لگتی ہیں۔ غنچے مسکرانے لگتے ہیں۔ پھول مہکنے لگتے ہیں۔ بوئے گل سے لبریز باد بشارت اک خرام ناز سے لہرا کے گزرتی ہے۔ آوارہ خرام جھونکے خوشی سے مست ہو کر ادائے ناز سے ہم آغوش گل ہو جاتے ہیں۔ موسم کا رنگ نکھر جاتا ہے۔ رحمتوں سے جہاں مشکبار اور صحن چمن پر بہار ہو جاتا ہے۔ ہاں اب مخلوق خدا نے اطمینان کا سانس لیا ہے۔ کائنات میں جان سی پڑ گئی ہے۔ پژمردہ حیات میں تازگی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ وقت کے دریا میں بہتے تارے وجد کرنے لگے ہیں۔ چاندنی نے زعفران کا لباس پہنا ہے۔ سورج کی کرنوں نے سونے کا پانی پیا ہے۔ شبنم کی آنکھیں خشک ہو گئیں ہیں۔ اجڑے ہوئے وقت نے نئے سرے سے کمر ہمت باندھی ہے۔ زمانے کا عروج شروع ہو چکا ہے۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی ہیں۔ نوید ہو۔ خوشخبری ہو۔

کائنات کا مقصود آ چکا ہے۔ عبدالمطلب کے پوتے عبداللہ کے یتیم تشریف لائے ہیں۔ جنکے انتظار میں وقت نے ہزاروں پینترے بدلے۔ زمین نے لاکھوں چکر کاٹے۔ سورج کروڑوں بار طلوع ہوا۔ پہاڑوں کی گردنیں تن گئیں۔ آسمان کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ صدیوں کی آنکھوں سے ماہ وصال کے آنسو ٹپکے۔ جن کی طلب میں انسانیت دم بلب ہوئی۔ آج ابراہیم کی دعائے مستجاب کا

ظہور ہوا۔ عیسیٰ کی بشارت پوری ہوئی۔ آمنہ کا خواب سچا ہوا۔ ہاں محمدؐ نے وجود کا جامہ پہنا۔ توحید کا لباس زیب تن فرمایا۔ محبوبیت کی طلعت سجائی۔ ختم نبوت کا تاج پہنا۔ رسالت عامہ (عموم رسالت) کے تخت کو رونق بخشی۔ اور خلاصہ کائنات بن کر جلوہ آرائے جہاں ہوئے۔ ﷺ

آپ مردہ دلوں کی زندگی، ژولیدہ دماغوں کے سلجھاؤ، بیماروں کے مسیحا، زخموں کے مرہم، غلاموں کے مولیٰ، غریبوں کے والی، فرائض کے نگہبان، حقوق کے پاسبان، ہدایت کے درخشاں چراغ، نجات کی کنجی، رحمت کا مجسمہ، شفقت کا پیکر، انسانیت کے نجات دہندہ، آدمیت کی معراج، علم و حکمت کے معلم، مکارم اخلاق کے متمم، انسان کے مربی، ہر شعبہ زندگی کے مصلح، درد کشوں کے درماں اور وحدت کے نقیب بن کر تشریف لائے۔

آپ ﷺ کی شان کیا کہئے۔ ظہور سے پہلے ہی زمین تیار کر دی گئی۔ اور آمد سے پہلے ہی آپکی بشارتیں اتار دی گئیں۔ تشریف آوری کو سینکڑوں برس گزرے۔ تب سے اب تک جہان پر کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جس میں آپکی تعریف نہ کی گئی ہو۔ ہر زاویے اور ہر انداز سے آپکی ثناء خوانی ہوئی۔ آپکی نعت کو نئے انداز دیے گئے۔ تعریف کے نئے طور وضع کیے گئے۔ آپکی منقبت کے نئے ڈھنگ تراشے گئے۔ مدح کے اچھوتے اسلوب متعین کیے گئے۔ ستائش و توصیف کے نرالے رخ تخلیق ہوئے۔ نایاب نکات، نادر استعارات، معطر الفاظ، مطہر کلمات، اچھوتے مضامین اور عجوبہ روزگار مقالات کو آپکی تعریف و توصیف سے زینت بخشی گئی

ماان مدحت محمداً بمقالتی ۔ لکن مدحت مقالتی بمحمد

محمد ﷺ کی شانیں ان گنت اور خوبیوں کے رنگ الگ الگ ہیں۔ ہر طبقے پر آپکی محبت کے نئے رنگوں اور اچھوتی شانوں کا جلوہ ہے۔ ہر ایک نے اپنے رنگ ڈھنگ سے مدح و ستائش کے ایوان سجائے ہیں۔ مدحت کی مالائیں باندھیں ہیں اور تعریف کے موتی پروئے ہیں۔ کسی نے الفاظ کو اظہار عقیدت کا ذریعہ بنایا اور نثر پاروں میں سیرت و تعریف کے رنگ بھرے۔ کسی نے شعری قصیدوں میں محمد ﷺ کے پیکر تراشے اور تشبیہات کی مینا کاری کی۔ کسی نے شان مصطفیٰ کی دھنک میں قلم کے سات رنگ سمو دیے۔ کسی نے عمل کی سان پر زندگی کو صیقل کر

کے محبت کے نمونے پیش کیے۔ کسی نے خون کی سرخی کو تعریف کے چہرے کا غازہ بنادیا۔ کسی نے حلقہ دار پر سر رکھ کے محمد ﷺ کے گیت گائے۔ کسی نے گولیوں کی بوچھاڑ میں محمد ﷺ کے نعرے لگائے۔

دیکھیں گے مرے سر کی طرف لوگ حشر میں چمکے گی تاج بن کر غلامی رسول کی

محمد ﷺ کے فیض علم نے کسی کو قال مست بنایا اور بادہ عرفان نے کسی کو حال مست بنادیا۔ کوئی صائم الدہر بنا اور کوئی قائم اللیل کہلایا۔ کسی پر زہد واتقا کا رنگ چڑھا تو کسی پر جود وعطا کا سکہ چلا۔ کسی پر دعوت وارشاد کی بارش برسی تو کسی کے لئے جہاد وقتال کے در وا ہوئے۔ کسی پر جمال کا پرتو پڑا تو کوئی جلال کا مظہر بنا۔ کوئی استقامت کا پہاڑ اور شجاعت کا کوہ گراں کہلایا تو کوئی حکمت وبصیرت کا سمندر ٹھہرا۔ استغناء کامل سے کسی کی گردن تنی ہوئی اور عبدیت وتواضع سے کسی کا سر جھکا ہوا ہے۔ کوئی کلام کا مفسر ہوا تو کسی نے حدیث کی تفہیم کی۔ کوئی تزکیہ نفس اور اصلاح باطن میں مشغول ہوا تو کسی نے فقہ کی تدوین کی۔ کسی نے الفاظ کے پیچ وخم درست کئے تو کسی نے معانی کی گرہ کشائی کی۔ کسی نے آپکے اصول جہاں داری سے عالم کو روشناس کیا تو کسی نے دوشیزۂ سیاست کے خال وخد سنوارے۔ کبھی کے دل آپ کی محبت میں پارہ پارہ اور جگر آپ کی الفت میں چھلنی ہیں۔

لیکن کیا آپکی ثناء وتوصیف کی انتہا ہوگئی؟ کیا آپکی مدح وستائش تمام ہوگئی؟ کیا آپکی سیرت کے اطراف وجوانب سمیٹ لئے گئے؟ کیا کوئی آپکی تعریف کا حق ادا کرسکا؟ ہے کوئی اس بات کا دعویٰ رکھنے والا؟ لکھنے والے لکھتے رہے۔ کہنے والے کہتے رہے۔ پڑھنے والے پڑھتے رہے۔ فکر تھک گئی۔ الفاظ ختم ہوگئے۔ قلم ٹوٹ گئے۔ زبانیں گنگ ہوگئیں۔ آپکی تعریف ہنوز باقی ہے۔ کوئی بھی اس سلسلہ کمال کی انتہا تک نہ پہنچ سکا۔ سبھی نے سپر ڈال دی کوئی بھی اس سمندر کی تہہ نہ پاسکا۔ ہر زمانہ محمد ﷺ کا زمانہ ہے۔ زمانہ گزرتا جارہا ہے آپکے رنگ گہرے اور نمایاں ہوتے جارہے ہیں۔ محمد ﷺ کی طلب اور پیاس بڑھتی جارہی ہے۔ آپکی سیرت کے نئے گوشے اور تعریف کے انوکھے دریچے کھلتے جارہے ہیں۔ ایوان نعت میں کتنے ہی بالا خانے ہیں جن تک

ابھی کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ گلشن ستائش میں کتنے ہی پھول ایسے ہیں جن کی خوشبو ابھی تک کوئی نہ سونگھ سکا۔ محمد ﷺ کمالات کا وہ سمندر ہیں جسکا کوئی چھور اور کنارہ نہیں۔

تھکی ہے فکر رسا مدح باقی ہے قلم ہے آبلہ پا مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا مدح باقی ہے ورق تمام ہوا مدح باقی ہے

اور کیوں نہ ہو آپ کو یہ شان اس نے عطا فرمائی جو تمام شانوں کا مالک ہے۔ ہر روز ایک نئی شان سے جلوہ گر ہے۔ بنانے والے نے خود آپکی تعظیم کی ہے۔ خالق خود آپ پر نثار ہوا ہے۔ اس نے آپ کو اسم سامی محمد عطا فرمایا۔ اپنی خوشنودی کو آپ کی رضا میں پوشیدہ کیا۔ محبت کا حکم ہی نہیں دیا آداب محبت بھی خود سکھائے۔

اس لئے خبردار! محبت کو وہ رنگ نہ دینا جو آپکے مقام سے میل نہ رکھے۔ وہ الفاظ استعمال نہ کرنا جو محمد ﷺ کے شایان شان نہ ہوں۔ ہاں ہاں!!! یہ بارگاہ تعظیم وادب ہے۔ **با محمد ہوشیار**۔ یہ وہ ہستی ہے زبان جس کے اظہار مقام سے درماندہ ہے۔ اس کا اوج حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ جبرائیل اس کا دربان ہے۔ زمانہ اس کے پابوس ہے۔ شجر وحجر اس کے گواہ ہیں۔ ارض وسما اس کا دم بھرتے ہیں۔ شمس وقمر اس کے نوکر ہیں۔ نجوم وکواکب اس کے چاکر ہیں۔ اس کی رضا جنت کا پروانہ ہے۔ اس کی ایذا جہنم کی رسید ہے۔ برق کی لپک یہاں ماند پڑ جاتی ہے۔ راہوار خیال یہاں خوش خرام ہوجاتا ہے۔ طائر فکر کے یہاں پر جلتے ہیں۔ اظہار یہاں منجمد ہوجاتا ہے۔ سکوت کے لبوں پر مہر لگ جاتی ہے۔ الفاظ یہاں کفایت نہیں کرتے۔ تشبیہات یہاں حوصلہ ہار دیتی ہیں۔ استعارے یہاں تھک جاتے ہیں۔ نگاہیں یہاں جھک جاتی ہیں۔ جلال بادشاہی یہاں گرد پا بن جاتا ہے۔

یہاں بات کہنے کا ہنر اور اظہار کا طریقہ چاہئے۔ نطق کا قرینہ اور کلام کا سلیقہ چاہئے۔ الفاظ چنیدہ ہوں۔ شہد پوتر ہوں۔ زبان کوثر وتسنیم سے ڈھلی ہوئی ہو۔ لفظوں کی سیپ میں معانی کے موتی بھے ہوئے ہوں۔ تعظیم کی سمرن میں انہیں ہیروں کی طرح پرو دیا گیا ہو اور ادب کی لڑی میں محبت کے پھولوں کی طرح باندھا گیا ہو۔ انہیں خلوص کی مٹھاس لگاؤ۔ عشق کی حرارت میں

تپاؤ۔ ندامت کے عرق میں بجھاؤ۔ شریعت کی کسوٹی پر پرکھو اور عقیدت کے کٹورے میں عجز و نیاز کے ہاتھوں سے دربار رسالت میں پیش کرو۔

شوق و نیاز و عجز کے سانچے میں ڈھل کے آ — یہ کوچہ حبیب ہے پلکوں پہ چل کے آ
امت کے اولیاء بھی ادب سے ہیں دم بخود — یہ بارگاہ سرورِ دیں ہے سنبھل کے آ
سوز و تپش سخن میں اگر چاہتا ہے تو — عشق نبی کی آگ میں تا تاب پگھل کے آ

محبت حد سے سوا ہونا چاہتی ہے۔ عشق بے پناہ ہونا چاہتا ہے۔ محبت پائے محبوب پر جبین رکھ کے بھی مطمئن نہیں ہوتی۔ پر خبردار!! اس عشق و محبت کو شریعت کی لگام ڈالنا۔ است عظیم و تعریف پر شریعت کا سایہ رکھنا۔ ورنہ تعظیم شرک بن جائے گی۔ تعریف پر توہین کا لیبل لگ جائے گا۔ محبت زمرہ عداوت میں شمار ہوگی۔ اجر ضائع ہوگا اور عمل حبط ہو جائے گا۔

اس پیغمبر کا مقام بہت بلند اور شان بہت اونچی ہے۔ آپ شہنشاہ مطلق کے رسول مطلق ہیں۔ آپکی تشریعی حیثیت میں کوئی کلام نہیں۔ ادب کے طریق میں کوئی حجاب نہیں۔ حدود محبت میں کوئی پردہ نہیں۔ تعظیم بجالانے میں کوئی خفا نہیں۔ آپکی بابت ایک ایک بات کھول کھول کر بتا دی گئی ہے۔ آپکے نام لیوا آپکی محبت و تعظیم میں اسقدر افراط و تفریط کا شکار ہو جائیں۔ نہایت افسوس کا مقام ہے۔ قرآن کا سہارا لیکر صاحب قرآن کا انکار کیا جاتا ہے۔ کتاب اللہ کی آڑ لیکر سنت رسول اللہ کی تشریعی حیثیت پر حرف گیری کیجاتی ہے۔ عشق و محبت کے راستے شرک و بدعت کو فروغ دیا جاتا ہے۔ توحید کے پردے میں تعظیم رسول سے روکا جاتا ہے۔ بشریت کے ثبوت میں عصمت انبیاء کو پامال کیا جاتا ہے۔ کوئی صیغہ خطاب سے درود پڑھنا علامۃ القوم سمجھتا ہے اور اسکا ترک گستاخی قرار دیتا ہے تو دوسری طرف درود میں سید و مولیٰ کے اضافے سے کسی کی توحید لٹ جاتی ہے۔ ایک طبقہ آپ سے شرف انسانیت چھیننا عین ایمان سمجھتا ہے اور دوسرا آپکے تبرکات سے برکت حاصل کرنا بھی جرم قرار دیتا ہے۔ کسی کے نزدیک آپ کے حضور سجدہ کرنا بھی روا ہے اور کوئی آپکے دست و پا کو بوسہ دینا بھی شرک سمجھتا ہے۔ ایک کے نزدیک آپ گناہ معاف کرنے کے بھی مجاز ہیں اور دوسرے کے نزدیک آپ سے توسل و استمداد بھی جرم عظیم ہے۔ کسی کے

نزدیک آپکا جسم اطہر معاذ اللہ جماد محض ہے اور کسی کے نزدیک پوری دنیا روضہ منورہ میں مثل کف دست آپکے سامنے ہے۔ ایک طبقے کے نزدیک آپ مختار کل ہیں اور دوسرا آپ کے معجزات کا بھی منکر ہے۔ ان میں سے ایک افراط ہے اور دوسری تفریط۔ صحیح راستہ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔

میری کم نصیبی و بے بختی ہے کہ میں اپنے شیخ و مرشد سے کچھ حاصل نہ کر سکا۔ ہاں حضرت اقدس سے مرے دل نے عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حرارت ضرور حاصل کی ہے۔ میں نے آپکی مجالس میں حب رسول کی گرمی اور نشہ محبت کی سرشاری دیکھی ہے۔ حضرت شیخ کو شرک کی بو سے بھی جتنی نفرت ہے اتنی ہی حب رسول کی مہک آپ کے رگ و پے میں بسی ہوئی ہے۔ آپکے در اقدس پر حاضری کی برکت سے الفت رسول کی چاشنی نصیب ہوئی اور میں نے جانا

ہو نہ یہ پھول تو بلبل کا ترنم بھی نہ ہو — چمن دہر میں کلیوں کا تبسم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزم توحید بھی دنیا میں نہ ہو تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے — نبض ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

وہاں مجھے معلوم ہوا جو محبت حد اشراک تک پہنچ جائے وہ محبت نہیں عداوت ہے۔ اور جو توحید آپکی تعظیم و توقیر میں رکاوٹ بن جائے وہ توحید نہیں توہین ہے۔ مجھے معلوم ہوا حب مصطفیٰ کے بغیر توحید کچھ بھی نہیں۔ شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کا تقویٰ ہے تو کیا آپ کا مرتبہ ان سے بھی کم ہے؟ یہ الفاظ کا کھیل نہیں ہے حال کی بات ہے۔ توحید کے راستے میں پہلا مقام پہلا پڑاؤ مصطفیٰ ہیں۔ محمد ﷺ توحید کا دروازہ ہیں۔ توحید نغمہ محمدی ہے۔ ﷺ۔ جو مصطفیٰ شناس نہیں وہ توحید شناس بھی نہیں۔ جس دل میں مصطفیٰ نہیں اس دل میں خدا نہیں۔ جسکے حضور آواز بلند کرنے سے توحید کا درخت سوکھ جائے کتاب توحید اسکے بغیر کیسے مکمل ہو سکتی ہے؟ صحابہؓ نے پہلے مصطفیٰ کو جانا پھر توحید کو قبول کیا۔ ہاں تعظیم کے نام پر توہین اور محبت کے نام پر عداوت کے تیروں سے توحید کا سینہ فگار نہ کرو۔ یہ محمد ﷺ کا لگایا ہوا پودا اور جلایا ہوا چراغ ہے۔

میں نے اس عظیم ترین ہستی کو دیکھا۔ فاران کی چوٹی پر کھڑا ہو کے لا الہ الا اللہ کی صدا لگا رہا

ہے۔ اس کی خاطر مکہ کی گلیوں میں ستایا جا رہا ہے۔ طائف کی سنگلاخ زمین اسکے مقدس ترین خون سے سرخ ہو چکی ہے۔ اسی کی خاطر بالآخر یہ اپنا وطن انبیاء کا مسکن اور کعبہ کا پڑوس چھوڑنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ میں نے جان لیا توحید سے قیمتی متاع کوئی اور نہیں۔ کوئی اور چیز توحید سے قیمتی ہوتی تو مصطفٰی کی جان اس کے لیے تھی۔ میں نے جان لیا شرک سے بڑھ کے خباثت اور کوئی نہیں۔ اس سے بری کوئی چیز ہوتی تو آپ ﷺ پہلے اسکی نفی کرتے۔

میں نے اس بزرگ ترین ہستی کو دیکھا۔ اللہ کے لامتناہی علم اور غیر محدود قدرت کا تذکرہ کر رہی ہے۔ غیر سے علم، قدرت، طاقت اور اختیار مطلق کی نفی کی جا رہی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے لیے بھی شراکت تو کیا اسکا وہم بھی گوارہ نہیں۔ میں نے جان لیا اللہ صفات میں بھی لاشریک ہے۔

میں نے اس مقصود کائنات انسان کو پایا۔ اللہ کے خوف سے لرزہ بر اندام ہے۔ ہر حال میں اس کا شکر گزار اور اسکی رضا پر راضی ہے۔ ہر حال میں اسکی تعریف کرنے والا اور ہر بات میں اس کا ذکر کرنے والا ہے۔ ہمہ وقت اسکا دل اللہ کی طرف متوجہ ہے۔ تو مجھے پتہ چل گیا مطلوب و مقصود بنانے کے قابل بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں۔

میں نے اس فخر بشر کو دیکھا۔ اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑا ہے۔ اسکے حضور زار و قطار رو رہا ہے۔ مشکلوں میں اسکو پکارتا ہے۔ فتح و نصرت کا اسی سے سوال کرتا ہے۔ اسی کی پناہ مانگتا ہے تو جان لیا دعا اور پکار کے لائق بھی خدائے مصطفٰی کے سوا کوئی نہیں۔

کامل انقیاد اور بھرپور اطاعت محبت کا ثمر ہے۔ جس محبت کو یہ پھل نہیں لگا وہ ابھی ناپختہ و خام ہے۔ آئندہ تحریر میں آپکے کمالات، مناقب، محامد، اوصاف، القاب، اعزازات، خصائص، اخلاق، عادات، احسانات اور آداب کا قرآن کی روشنی میں ذکر کیا جائے گا۔ ان شاء اللہ یہ تحریر اس پھل کو حاصل کرنے میں مدد و معاون ہو گی۔ اللہ اسے قبول فرما کر نافع و مبارک بنائے۔ آمین۔

الفت کے ساتھ ساتھ اطاعت حضور کی
کیتی خدا نصیب کرے اپنے فضل سے

مقصود کائنات

حضور پرنور ﷺ کی ذات سامی صفات وجہ وجود کائنات ہے۔ آپکو پیدا کرنا نہ ہوتا تو یہ جہاں تخلیق نہ ہوتا۔ بیکراں آسماں کا وجود ہوتا نہ روشن قندیلوں سے اسکی تزئین ہوتی۔ جھولا جھولتی زمین ہوتی نہ کوہان کی طرح ابھرے ہوئے پہاڑ اسکی پیٹھ پر گاڑے جاتے۔ رنگ و نور کے سلسلے اور آب و گل کے یہ نمونے نہ ہوتے۔ گئے دنوں کی یاد بن کر دامن دل پہ اتر جانے والی رتوں کا سراغ ملتا نہ جی بہلانے والے شاداب موسموں کا پتہ ہوتا۔ سماعت نواز نغموں کا الاپ ہوتا نہ باصرہ نواز رنگینیوں کا امتزاج ہوتا۔ بجلیوں کی کھلکھلاہٹیں نہ ہوتیں۔ کلیوں کی مسکراہٹیں نہ ہوتیں۔ بادلوں کا سانا نہ ہوتا۔ خوش منظر نظارے اور ساون کے فوارے نہ ہوتے۔ چھلکتے سمندر نہ ہوتے مچلتی آبشاریں نہ ہوتیں۔ زرخیز فصلیں اور بیابان وسعتیں نہ ہوتیں۔ گل کی رعنائیاں اور صحرا کی پہنائیاں نہ ہوتیں۔ سبھی کا کارن آپکی ذات ہے۔ آپ ہی کائنات کے منظر نامے کا مقصود تھے سو یہ جہاں آپکی خاطر سجایا گیا اور آپکو خدا کیلئے بنایا گیا۔ آپ نہ ہوتے تو زمین پر خدا کی عبادت نہ ہوتی۔

بزم کونین پہلے سجائی گئی   پھر تری ذات منظر پہ لائی گئی

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اللہ حکیم مطلق ہے۔ حکمت والا عبث اور بے کار کام نہیں کرتا۔ تخلیق کائنات بھی حکمت سے خالی نہیں قرآن مجید سے اس کی تین بڑی حکمتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہاں یہ یاد رہے ایک چیز کی کئی حکمتیں اور علتیں ہو سکتی ہیں۔ جیسا کہ حضرت شیخ الہند نے تفسیری فوائد (البقرہ۔۱۵۰) میں اشارہ فرمایا۔

۱۔ تخلیق کائنات کی پہلی حکمت

اس سے اللہ کے وجود، قدرت، علم اور دیگر صفات کا اظہار ہو۔ یہ انسان کیلئے اللہ کی شناخت کا ذریعہ بن جائے۔ جہان کی یہ پہلی غایت ہے اس مضمون کی کئی آیتوں میں سے ایک پیش خدمت

ہے۔ اللہ ﷻ ارشاد فرماتے ہیں

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا

اللہ وہ ہے جس نے بنائے سات آسمان اور زمین بھی اتنی ہی۔ اترتا ہے اس کا حکم ان کے اندر تا کہ تم جانو کہ اللہ ہر چیز کر سکتا ہے اور اللہ کے علم میں سمائی ہے ہر چیز کی۔

اس کی تفسیر میں عبدالرحمٰن بن ناصر اپنی تفسیر موسوم بہ تفسیر السعدی میں فرماتے ہیں

كل ذالك لاجل ان يعرفه العباد وليعلموا احاطة قدرته بالاشياء كلها واحاطة علمه بجميع الاشياء فاذا عرفوا باوصافه المقدسة واسمائه الحسنى وعبدوه واحبوه وقاموا بحقه فهذه الغاية المقصودة من الخلق والامر معرفة الله وعبادته

اس لیے تا کہ بندے اسے پہچان لیں اور جان لیں کہ تمام چیزیں اسکی قدرت اور علم کے گھیرے میں ہیں۔ جب انہوں نے مقدس اوصاف اور اچھے ناموں کے ساتھ اسے پہچان لیا۔ اسکی عبادت اور محبت میں لگے اور اسکے حق کے ساتھ کھڑے ہوئے تو یہی اللہ کی معرفت و عبادت ہے جو خلق اور امر کا مقصود ہے۔ (الطلاق۔۱۲)

اس جہاں کا ہر ذرہ اس بات کی دلیل ہے کہ خدا ہے۔ وہ واحد ہے۔ احد ہے۔ لاشریک ہے۔ زندہ ہے۔ قادر ہے۔ علیم ہے۔ صاحب حکمت ہے۔ خبردار اور نگران ہے۔

مفسر اسماعیل حقی ایک دوسری آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں

وفي الاية اشارة الى ان المخلوقات كلها ما خلقت الا لمعرفة الله تعالى

اور آیت میں اشارہ ہے کہ ہر مخلوق صرف اللہ کی معرفت ہی کیلئے پیدا کی گئی (حقی۔الاحقاف۔۳)

۲۔تخلیق کائنات کی دوسری حکمت

اس معرفت کے لیے مکلف مخلوق پیدا کی جائے۔ یہ جہاں اس کا مسکن ہو جہاں اس کی تمام ضرورتیں پوری کی جائیں۔ نور عقل سے اسے منور کیا جائے جس سے یہ نفع حاصل کرے۔ نقصان سے خود کو بچا سکے۔ اللہ کے احکام کو سمجھے۔ انکے رد و قبول میں مختار ہو۔ دیکھا جائے کون بااختیار خود

اللہ کی طرف آتا ہے اور کون دور بھاگتا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا

اور وہی ہے جس نے بنائے آسمان اور زمین چھ دن میں۔ اور تھا اسکا تخت پانی پر تا کہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں سے اچھا کرتا ہے کام۔ (ھود۔۷)

اچھے کاموں میں انسانوں کو جانچنا تخلیق کی دوسری حکمت ہے۔ جانچ کا مقصد اچھے اعمال کرنے والے افراد کو ظاہر کرنا ہے۔ امتحان اسی لئے ہوتا ہے۔ اعمال اگر چہ اچھے اور برے یا حسین اور حسین ترین درجوں میں تقسیم ہوتے ہیں لیکن قید اچھے اور حسین اعمال کی لگائی گئی کیونکہ کامیابی حُسن عمل سے مشروط ہے۔ اس میں محسنین کا شرف بھی ہے۔ نیز اللہ کو صرف حسن عمل نہیں حسین اعمال میں بھی درجۂ کمال مطلوب ہے۔

وحید دہر علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں۔

والتحضيض على الترقي دائما لدلالته على ان المقصود بالاختبار ذالك الفريق ليجازيهم اكمل الجزاء (روح المعانی۔ھود۔۷)

اور (جو صیغہ تفضیل لایا گیا وہ) انکی ترقی پر ابھارنے کیلئے ہے جو دائمی ہوتا کہ یہ واضح ہو جائے کہ امتحان کا مقصود یہی گروہ ہے تا کہ اللہ انہیں کامل ترین جزا دے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

وفي الاية اشارة الى ان من حكمة خلق الارض صدور الاعمال الفاضلة من شرف المخلوقات فيها

اور آیت میں زمین بنانے کی حکمت کا اشارہ ہے کہ اس میں انسانوں سے اچھے اعمال صادر ہوں (التحریر والتنویر۔ھود۔۷)

تمام نیکیوں میں زیادہ سے زیادہ حسن مطلوب ہے۔ جو اخلاص اور اتباع سنت سے حاصل ہوتا ہے انکی جز اللہ کی معرفت ہے۔ ناصر الدین فرماتے ہیں

فالله تعالى خلق الخلق لعبادته ومعرفته باسمائه وصفاته وامر

اللہ نے اپنے اسماء و صفات کے ساتھ مخلوق کو اپنی معرفت و عبادت کیلئے پیدا کیا اور اسی کا

هم بذالك (السعدی ۔ هود) حکم دیا۔

اللہ کی معرفت تمام ظاہری باطنی اعمال کی بنیاد ہے۔ اس کا محل انسان کا دل ہے اور اسی کا حاصل توحید ہے۔

۳۔ تخلیق کی تیسری حکمت

امتحان کا مقصد بامراد اور بے مراد افراد کو نمایاں کرنا ہے۔ اس لئے تخلیق کائنات کی تیسری حکمت جزا و سزا ہے۔ مقررہ وقت پر جہان فنا کر کے پھر زندگی دی جائے۔ ہر نفس کو کیے کا پھل ملے۔ اچھے کام کرنے والوں کو اکمل جزاء، سرمدی خوشی اور ابدی نعمتیں عطا ہوں۔

قرآن مجید میں اس مضمون کی بیسیوں آیتیں ہیں۔ مثلاً فرمایا

وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اور بنائے اللہ نے آسمان اور زمین جیسے چاہئیں
بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ	اور تا کہ بدلہ پائے ہر کوئی اپنی کمائی کا۔ (الجاثیہ)

ابوحیان ؒ فرماتے ہیں

فكان الخلق معللا بالجزاء	پس پیدا کرنے کی علت وحکمت
(البحر المحیط ۔ الجاثیہ ۔ ۲۲)	اعمال کا بدلہ دینا ہے

مرنا اور بدلہ پانا نہ ہوتا تو موجودات کا نظام بے کار ٹھہرتا۔

اصل حکمت

اپنی جگہ تینوں میں سے ہر حکمت اصل ہے لیکن مجموعی اعتبار سے دوسری حکمت اصل اور مقصود معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ پہلی حکمت تحقیق کیلئے لازم ہے اور تیسری اس کا تقاضا ہے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

والخلق دليل امكان العدم لان	اور مخلوق ہونا عدم ممکن ہونے کی دلیل ہے کیونکہ
المخلوق لم يجب عليه القدم	اس کیلئے ازلیت ثابت نہیں لہذا اس کا ختم
فجاز عليه العدم	ہونا جائز ہے۔ (رازی ۔ روم ۔ ۷)

اور اس کا مقصود ہونا اس لئے بھی کہ اللہ کو جو چیز مطلوب ہے وہ اختیاری معرفت ہے اور اس

کی اہلیت انسان میں ہے نہ کہ باقی مخلوق میں۔ پھر اس بات کی دلیل بھی کوئی نہیں کہ حصول معرفت اور جزاء پوری کائنات کا مقصد ہے جہاں مقصود لغیرہ ہے اور وہ انسان ہے۔ یہ اسکے لئے معرفت کا ذریعہ ہے۔

اس لئے تخلیق کائنات کی اصل حکمت ابتلاء ہوئی۔ اور ابتلاء کا مقصد کامیاب اور بامراد افراد کا ظہور ہوا۔ کیونکہ امتحان ذریعہ مقصود ہوتا ہے۔ لہذا کائنات کا مقصود انسان ہے اور انسان کا مقصود معرفت ہے۔ چنانچہ کئی آیتوں میں یہ بات بیان ہوئی کہ سب کچھ تمہارے لئے ہے اور تم الا لیعبدون ہمارے لئے ہو۔

ان المراد بالذات و المقصد الاصلی	بے شک ابتلاء کی ذاتی مراد محسنین کے احسان کا
من الابتلاء هو ظهور كمال احسان	کمال ظاہر ہوتا ہے اور یہی اصلی مقصد ہے
المحسنين مع تحقق اصل الایمان و	اگر چہ ایمان کی بنیاد اور اطاعت باقیوں میں
الطاعة فی الباقين ايضا	بھی متحقق ہے۔ (آلوسی ۔ ہود ۔ ۷)

ایک اور پہلو سے دیکھا جائے تو بھی انسان ہی تینوں حکمتوں کا مرکز اور محور نظر آتا ہے۔ لتعلموا۔ تا کہ تم جان لو۔ لیبلوکم۔ تا کہ تمہیں آزمایا جائے۔ ولتجزی۔ اور تا کہ تمہیں بدلہ دیا جائے۔ اے انسانو تم اللہ کی معرفت حاصل کرو۔ اسی معرفت میں تم آزمائے جاؤ گے اور اسی کے مطابق دار آخرت میں تمہیں اچھا یا برا بدلہ ملے گا۔ اسکا حاصل اور خلاصہ دو باتیں ہیں معرفت اور انسان۔ کونین کی تخلیق تو انسان کیلئے ہوئی اور انسان کی تخلیق توحید اور معرفت کیلئے ہوئی۔ جب معلوم ہو گیا جہاں کا مقصد اصلی انسان ہے اور انسان کی غایت اللہ کی توحید اور معرفت ہے تو اب دو باتیں سمجھیں۔

شرف کا سبب

شرف کمالات سے حاصل ہوتا ہے۔ جو جتنا با کمال ہو گا اتنا ہی برتر اور اشرف ہو گا۔ جیسے انسان کو کمال عقلی حاصل ہے جس سے باقی مخلوق محروم ہے اسلئے باقی مخلوقات سے اشرف ہے۔ یا کسی چیز کا نفع اس سے فائدہ اٹھانا ہو اور اس کے بعض افراد بعض سے نفع بخش ہوں تو جو زیادہ نفع

پہنچائے وہ دوسرے سے اشرف ہوگا۔ مثلاً پانی کا نفع طہارت حاصل کرنا اور پینا ہے۔ اور صاف پانی فائدے میں دوسرے سے نفع بخش ہے اس لئے اشرف ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں

فکذالك العبد الذی وجد فیه ما هو المطلوب منه علی وجه ابلغ — پس اسی طرح وہ بندہ اشرف ہے کہ جسمیں مقصود زیادہ بلیغ طور پر پایا گیا۔ (الذاریت۔ ۶۵)

انسان کا اصلی کمال اللہ کی معرفت ہے۔ عقل اسکا سبب ہے۔ یہ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ کو معرفت کا درجہ کمال مطلوب ہے۔ جس انسان کا اسمیں جتنا نصیب اور حصہ ہوا وہ اتنا ہی باکمال ہوگا۔ دیگر بے بہا کمالات کے ساتھ اس کمال میں بھی آپ سب سے فائق ہیں۔ اسکی دلیل یہ کہ آپ داعی الی اللہ ہیں۔ اس لئے آپ ہی سب سے اشرف ہیں۔ جو اشرف ہو وہ ہی مقصود بھی ہوتا ہے۔ انسان میں کمالات کی طلب اسکی واضح دلیل ہے۔ ایک جنس میں کھرا کھوٹا ہو تو مجبوری کے سوا کھوٹے کا کوئی طلبگار نہیں اور کھرا ہر ایک کا مقصود ہے۔ ہزاروں پھولوں میں جو شان گلاب کی ہے اوروں کی نہیں۔ پرندے ہزاروں ہیں لیکن دوسروں کی وہ بات کہاں جو عقاب کی ہے۔

مقصود کونین

پس آپ ہی کونین کا مقصود اور اسکی تخلیق کا سبب ہیں۔ اور آپ کا مقصود اللہ کی وہ معرفت ہے جس کا درجہ کمال اللہ کو انسان سے مطلوب ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں

حاصل یہ ہوا کہ آسمان و زمین کی پیدائش سے اصل مقصود انسان ہے بلکہ انسان میں بھی اہل ایمان ہیں اور ان میں بھی وہ انسان جو سب سے اچھا عمل کرنے والا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ سارے بنی آدم میں سب سے اچھا عمل کرنے والے ہمارے رسول ﷺ ہیں اسلئے یہ کہنا صحیح ہوا کہ تمام کائنات کے پیدا کرنے کا اصل مقصد رسول کریم ﷺ کا وجود باجود ہے (معارف القرآن۔ ھود۔ ۷)

اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں۔

فھو صلی اللہ علیه وسلم علی الحقیقة — پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی خلق خدا میں سب

الخلیفة الاعظم فی الخلیقة والامام — سے بڑے خلیفہ اور ارض و سماء میں مقدم امام ہیں

المقدم فی الارض والسموت العلی — آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو آدم بھی پیدا

ولولاہ ماخلق ادم بل ولا ولا (البقرہ۔ ۳۰) — نہ ہوتے بلکہ آپ نہ ہوتے تو وہ بھی نہ ہوتے

اسماعیل حقی سورہ توبہ میں فرماتے ہیں

وکان علیه السلام علة غائیة للوجود — اور حضور علیہ الصلاۃ والسلام وجود کائنات کی علت

کل کون موجودہ الشریف وعنصرہ — غائی ہیں پس آپ کا بزرگ وجود اور اس کے لطیف

اللطیف افضل الموجودات الکونیة — عناصر تمام موجودات میں سب سے افضل ہیں (۱۲۸)

کتاب فطرت کے سرورق پر جو نام احمد رقم نہ ہوتا — تو نقش ہستی ابھر نہ سکتا وجود لوح و قلم نہ ہوتا

زمین نہ ہوتی فلک نہ ہوتا عرب نہ ہوتا عجم نہ ہوتا — یہ محفل کن فکاں نہ ہوتی اگر وہ شاہ امم نہ ہوتا

توحید کی اعظم دلیل

وجود خدا

کائنات وجود میں ایک ہے۔ اسکی ذات میں کثرت ہے۔ ہر ذات ایک جہان ہے۔ فکر بالغ اور عقل کی نظر ہو تو ہر ذرہ آئینہ ہے۔ ہر آئینے میں خدا کا عکس ہے۔ ہر قطرہ سمندر ہے۔ ہر سمندر توحید کی علامت ہے۔ ہر ستارہ کہکشاں ہے۔ ہر کہکشاں خالق کی دلیل ہے۔

کوئی تو ہے جس نے تتلی پر رنگ بکھیرے۔ موسموں کو حسن بخشا۔ کلی کو کھلنا بتایا۔ پرندوں کو اڑا میں دیں۔ زرافے کو قامت دی۔ ہاتھی کو جسامت دی۔ مچھلی کو تیرنا، چوزوں کو دانہ چگنا اور شاہین کو شکار کرنا سکھایا۔ رینگتے سانپوں میں زہر بھرا۔ زہر کو تریاق بنایا۔

وہ کون ہے جس نے تنوع میں یکسانیت رکھی اور یکسانیت میں تنوع پیدا کیا؟ وہ کون ہے جو ماں کے پیٹ میں نقش اتارتا ہے اور زمین کی تہوں میں صورت گری کرتا ہے؟ گٹھلی میں آم کس نے چھپائے اور آم میں گٹھلی چھپانے والا کون ہے؟ آخر بینائی کیلئے رعنائی اور سماعت کیلئے صدا کس نے پیدا کی؟ ہر مد کے بعد جزر کس نے رکھا؟ پانی بلندی سے اترتا ہے۔ ہوا نشیب سے بلند ہوتی ہے۔ اس کے برعکس کیوں نہیں؟ پانی کی طبیعت میں بہاؤ اور ہوا کی طبیعت میں اٹھاؤ کس نے رکھا؟ چاند کو فضا میں کس نے اچھالا؟ وہ کون ہے جس نے سمندر کو کناروں پر سنبھال رکھا ہے۔ وہ کون ہے جس نے دن کو رات کے پیچھے لگا دیا اور چاند کو سورج کے پیچھے دوڑا دیا۔ ایک جیسے قوانین میں باندھ کر گردش کے راستے متعین کر دیے۔ لطیف ہوا کو روئی کے گالوں جیسے بادلوں کی سواری بنا دیا۔ یہ وہی ہے جو پردوں میں رہ کر بے حجاب ہے۔ جو مخفی ہے مگر ظاہر ہے اور مستور ہو کر بھی مکشوف ہے۔

ہر شے اس کا پتہ دیتی ہے۔ یہ بل کھاتی چکراتی کائنات، محیط آسمان، بلند پہاڑ، مہیب

گڑھے، رنگارنگ پھول، قسم ہا قسم کے درخت، انواع واقسام کے جانور اور یہ انسان ہر ایک اسکی خلاقی، قدرت، علم، حکمت اور تدبیر کا گواہ ہے۔ ایک عقل مند جب بھی آفاقی وانفسی دلائل پر غور کرتا ہے۔ موجودات کے محکم، منظم، مربوط ومضبوط نظام کو دیکھتا ہے۔ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا	اے ہمارے پروردگار یہ نظام تو نے بے فائدہ نہیں بنایا
سُبْحٰنَكَ !	بے فائدہ کام کرنے سے تیری ذات پاک ہے

اسکی بناوٹ تو حق کے ساتھ ہے۔ روح المعانی میں ہے۔

والباطل العبث وھو مالا فائدۃ	باطل بے کار ہوتا ہے جس میں کوئی
فیہ مطلقا او مالا فائدۃ فیہ یعتد	فائدہ نہ ہو یا ہو لیکن قابل شمار نہ ہو
بھا او مالا یقصد بہ فائدۃ (آل عمران۔۱۹۱)	یا اس سے فائدہ کا ارادہ نہ ہو۔

مراتب دلائل

پچھلے مضمون میں جہان کے تین مرکزی فائدے بیان ہو چکے ہیں۔ توحید پر دلالت اور یکتائی کا اظہار ان میں سے ایک ہے۔ پوری کائنات بھی اور الگ الگ اس کا ہر جزء بھی توحید کی دلیل ہے۔ قرآن مجید کائنات کے ساتھ اسکے افراد و اجزاء کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ ایسی آیات کا شمار سیکڑوں میں ہے۔ دلیل ہونے میں سبھی یکساں ہیں۔ لیکن کسی عاقل سے پوشیدہ نہیں بعض بعض پر فوقیت رکھتی ہیں۔ مخلوق ہونے میں سبھی یکساں ہیں۔ لیکن شرف ومنزلت میں بھی ایک جیسے نہیں۔ تمام مخلوق میں بزرگی اولاد آدم کو ملی۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ	اور ہم نے عزت دی آدم کی اولاد کو

نفس رسالت ونبوت میں تمام انبیاء ورسل برابر ہیں مگر درجات میں پھر بھی فرق ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ	یہ سب رسول ہیں۔ ہم نے ان میں سے بعض
عَلٰى بَعْضٍ	کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ (بقرہ۔۲۵۳)

مدلول پر جسکی دلالت جتنی تام ہوگی۔ وہ دلیل اتنی ہی اشرف ہوگی

حق باطل کی ضد ہے۔ باطل بے فائدہ اور حق وہ ہے جو فائدہ مند ہو۔ کائنات کی تخلیق بالحق ہے۔ اس لیے فائدوں سے بھرپور ہے۔ قرآن میں اکثر و بیشتر اشیاء کے منافع اور فوائد ہی بتائے گئے ہیں۔ کسی چیز میں فوائد کے اضافے سے حجم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ حجم میں کمی سے فوائد کم ہو جاتے ہیں۔ یہ مشاہدہ ہے۔ کم حجم میں فوائد زیادہ ہوں تو ان کے حصول میں مشکل اور تنگی ہوتی ہے۔ یہ کمال تخلیق ہے کہ چھوٹی چیز میں فوائد بے حساب ہوں اور ان کے حصول میں تنگی بھی نہ ہو۔

لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ

البتہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا لوگوں کے پیدا کرنے سے بڑا ہے۔ (المومن: ۵۷)

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ جس شے میں مذکورہ خوبی ہوگی اسکی دلالت تام ہوگی۔ اور اسے باقی دلائل قدرت پر فوقیت ہوگی۔ فوائد کمال ہی کا نام ہے۔ وہی چیز باکمال ہوتی ہے جو فائدہ مند ہو۔ اور باکمال شے کا حامل بھی باکمال ہوتا ہے۔ جو باکمال ہے وہ اشرف ہے۔ مزید تفصیل کے بغیر کہنا یہ ہے کہ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اسے عقل ملی، منصب خلافت ملا، حامل امانت ہوا۔ مہبط وحی بنا۔ اللہ کے اخلاق سے مزین ہوا۔ فرمایا

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

ہم نے آدمی اچھے انداز ے پر بنایا ہے۔ (التین: ۴)

اعلی دلیل

ہر مخلوق دلیل توحید ہے۔ لیکن یہ تمام دلائل توحید میں اشرف و افضل ہے۔ تمام انسانوں میں اعلی، اولی، ارفع، اشرف، اکمل اور اتم ہستی مصطفی کی ذات ہے۔ اس لیے محمد ﷺ اللہ کی یکتائی کے سب سے بڑے گواہ اور توحید کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔ آپکی گواہی ہمہ جہت ہے۔ زبان حال اور زبان قال سے اللہ کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ آپ شاھد مطلق ھیں۔ آپکی گواہی یہ ہے کہ اللہ ذات و صفات میں یکتا ہے۔

تفسیر کبیر میں شاھد کی ایک تفسیر کرتے ہوئے امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

ثانيها انه شاهد ان لا اله الا الله وعلى هذا لطيفة وهو ان الله جعل النبي شاهدا على الوحدانية والشاهد لا يكون مدعيا فالله تعالى لم يجعل النبي في مسئلة الوحدانية مدعيا لها لان المدعي من يقول شيئا على خلاف الظاهر والوحدانية اظهر من الشمس والنبي عليه السلام كان ادعى النبوة فجعل الله نفسه شاهدا في مجازاة كونه شاهدا لله فقال تعالى وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ

اس کی دوسری تفسیر یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کلمہ طیبہ کے گواہ ہیں۔ اور اس میں ایک لطیف نکتہ ہے۔ نبی کو اللہ نے اپنی وحدانیت پر شاھد بنایا گواہ مدعی نہیں ہوتا۔ اس مسئلے میں مدعی نہ بنانے کی وجہ یہ ہے کہ مدعی ظاہر کے خلاف بات کرتا ہے اور وحدانیت سورج سے زیادہ ظاہر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے توحید کی گواہی دی خود نبوت کا دعوی فرمایا آپکے شاھد ہونے کی مجازات میں اللہ نے خود کو آپکے دعوائے رسالت پر گواہ بنایا فرمایا اللہ خوب جانتا ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں (الاحزاب۔ ۴۵)

زینت کائنات

مقصود کونین محمد ﷺ زینت کائنات ہیں۔ اس جہاں کی رونق آپکے دم قدم سے ہے۔ آپ ﷺ نہ ہوتے تو کائنات کو وجود کی روشنی کہاں سے ملتی؟ کبھی عدم کی تاریکیوں میں پڑے ہوتے۔ آپکو منظر پر لانا نہ ہوتا تو سورج میں نور ہوتا نہ چاند کو چاندنی ملتی۔ جھرنوں کی نغمگی ہوتی نہ آبشاروں میں ترنم ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ ہوتے تو بارش کے قطرے ہوتے نہ شبنم کے آنسو ہوتے۔ گل کو رعنائی ملتی نہ حسن کو دلربائی عطا ہوتی۔ آپ زینت کائنات کا سبب بھی ہیں اور اس جہاں کی اصل زینت بھی ہیں۔

زینت کیا ہے؟

زینت آراستگی اور خوبصورتی کا نام ہے۔

الزینة شدة الحسن   غضب کی خوبصورتی کو زینت کہتے ہیں۔

خوبصورتی بھی زینت ہے اور جس چیز سے خوبصورتی حاصل کی جائے وہ بھی زینت ہے۔ زیور زینت بھی ہے اور زینت کا سبب بھی۔ اسباب زینت کی آگے کئی اقسام ہیں۔ خلقی، وصفی حسی، معنوی وغیرہ۔ سورہ کہف میں فرمایا

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا

زمین پر جو کچھ ہے اسے ہم نے زمین کی رونق بنایا ہے۔

اور فرمایا

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ   رونق دی ہم نے آسمان دنیا کو ایک رونق جو ستارے ہیں (الصافات۔۶)

مزید ارشاد ہوا۔

الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا   مال اور بیٹے دنیاوی زندگی کی زینت ہیں

کائنات کے تمام افراد اس کی زینت ہیں۔ انسان بھی انہی میں سے ہے۔ آلوسی فرماتے ہیں

فان للمکلف جهتین جهة یدخل بها تحت الزینة وجهة یدخل بها تحت الابتلاء۔   پس مکلف کیلئے دو جہتیں ہیں۔ ایک رخ سے زینت اور ایک رخ سے امتحان میں شامل ہے (روح المعانی۔الکہف۔۷)

انسان کائنات کی حسی زینت بھی ہے اور معنوی زینت بھی ہے۔ اسکی تقویم تمام مخلوق سے احسن اور خوبصورت ہے۔ اور ظاہر ہے زیور جتنا بھی خوبصورت ہوگا اتنی ہی خوبصورتی پیدا کرے گا۔ احسن تقویم والے سے عمل بھی احسن مطلوب ہے۔ یہ اس کی معنوی زینت ہے۔ عقل سے آراستہ ہے۔ علم سے پیراستہ ہو سکتا ہے۔ فضائل کو حاصل کر سکتا ہے۔ کمال کی بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔

اصل زینت

تقویم اور عمل دونوں میں آپ کے مثل اور برابر کوئی نہیں۔ ظاہری اور باطنی حسن کے کمالات آپ پر ختم ہیں۔ اس لئے آپ ہی کائنات کی اصل زینت ہیں۔

جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے۔ یہاں سے انسان اور دوسری مخلوق میں ایک بڑا فرق معلوم ہوتا ہے۔ تمام مخلوق ذاتی اور وصفی زینت سے انتہائی حد تک مزین کر کے پیدا کی گئی۔ انکی خلقی وضع جس زینت کا تقاضا کرتی تھی وہ ان کو عطا کر دی گئی۔ البتہ انسان کو زینت کی گنجائش کے ساتھ پیدا کیا۔ یہ خوب سے خوب تر ہو سکتا ہے۔ تزئین اور خوبصورتی میں ممکن حد تک اضافہ کر سکتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَاللَّهُ أَخْرَجَكُم مِّن بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ لَا تَعْلَمُونَ شَيْئًا

اور اللہ نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے نکالا کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔ (النحل۔۷۸)

سورۃ کہف آیت نمبر ۷ کی تفسیر میں مفسرین فرماتے ہیں۔

حرف ماعام لیکر یوں کہا جائے کہ ہر چیز زمین کی زینت ہے۔ تو موذی اشیا مثلاً سانپ، بچھو وغیرہ کس طرح زینت ہوں گے؟ اسکا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

فلکو نه دالا علی خالقه فکانه	اس لئے کہ ہر چیز اپنے خالق پر دلالت
زینة الارض من هذه الجهة	کرتی ہے۔ پس اس جہت سے ہر چیز
(ادالمسیر۔الکہف۔۷)	زمین کی زینت ہے۔

اور آپ ﷺ جہان میں توحید کی سب سے بڑی دلیل ہیں۔ اس رخ سے بھی آپ ﷺ زینت کائنات ہیں۔ ہر چیز کا مقصود اس کی اصل زینت ہوتا ہے۔ مکان کی اصل زینت اس کے مکین سے ہے۔ صدر جلسہ نہ ہو تو جلسہ کا رنگ پھیکا پڑ جاتا ہے۔ کائنات کا ایک مقصد توحید پر دلالت تھی تا کہ اللہ کی معرفت حاصل کی جا سکے۔ اور یہ مقصود نبی کریم ﷺ سے پورا ہوا۔ پس آپ ﷺ زینت کائنات ہوئے۔ آپکے قدوم میمنت لزوم سے جہاں کو رونق ملی

رونق اس جہاں کو تمہارے دم قدم سے ہے

نبی الانبیاء

محمد ﷺ نبوت کا گل سرسبد ہیں۔ نبوت کے کمالات آپ پر ختم ہوتے ہیں اور اس کے مراتب کی آپ پر انتہا ہوتی ہے۔ نبوت وہ منصب ہے جو انسانوں کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن انسانی کد و کاوش کا اس میں دخل نہیں۔ یہ بارش ہر کس و ناکس پر برسائی نہیں گئی۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر گایا نہیں گیا۔ منتخب افراد کو ہی یہ رتبہ ملتا تھا۔ ازل سے ہی اس کے حاملین چھانٹ لئے گئے تھے۔ نبوت بھی انبیاء کو ملی آپکو بھی عطا ہوئی۔ لیکن امامت انبیاء کی دستار آپ ﷺ کے سر مبارک پر رکھی گئی۔ مجلس انبیاء کے صدر نشین آپ ہیں۔ ﷺ آپ آخر میں آئے۔ زمانہ تمام انبیاء سے پہلے شروع ہو گیا۔ نبوت کا تاج سب سے پہلے آپ کے سر پر سجایا گیا۔ باقی انبیاء کو بعد میں سرفراز کیا گیا۔ جیسا کہ صاحب تحذیر الناس اور صاحب ترجمان السنۃ نے از روئے حدیث فرمایا، آپکی نبوت ذاتی ہے کہ آپکو منصب نبوت سے براہ راست نوازا گیا۔ دوسرے انبیاء کی نبوتیں آپ کا فیض ہیں کہ ان میں نبوت کی خلعتیں آپکی وساطت سے تقسیم کی گئیں۔۔ جیسے سورج کو اللہ نے براہ راست منور فرمایا اور چاند کو روشنی سورج کے واسطہ سے دی۔

نبیوں سے میثاق

ارشاد فرمایا۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ	اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ کتاب اور
اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ	علم میں سے جو کچھ میں نے تمہیں دیا پھر تمہارے
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ	پاس کوئی رسول آئے جو تمہارے پاس والی کتاب
لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	کو سچا بتائے تو ضرور اس رسول پر ایمان لاؤ گے اور

وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِكُمۡ اِصۡرِیۡ قَالُوۡۤا   اسکی مدد کرو گے فرمایا کیا تم نے اقرار کیا؟ اور اس
اَقۡرَرۡنَا قَالَ فَاشۡهَدُوۡا وَاَنَا مَعَكُمۡ   شرط پر میرا عہد قبول کیا؟ بولے ہم نے اقرار کیا
مِّنَ الشّٰهِدِيۡنَ (آل عمران ۸۱)   فرمایا تو اب گواہ رہو میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں

اللہ نے اولاد آدم سے اپنی ربوبیت کا اور انبیاء سے آپکی نبوت کا عہد لیا۔ ربوبیت کا عہد سادگی سے لیا۔ اور اس عہد کے لئے خاص اہتمام فرمایا۔

(۱) کلمہ اذ سے شروع کیا اس سے پہلے اذکر فعل مقدر ہوتا ہے اور اہم خبر کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یعنی انتہائی قابل ذکر ہے وہ وقت جب ۔۔۔۔۔۔ الخ۔

(۲) عہد میثاق کے طور پر لیا۔ میثاق خوب پختہ اور پکے عہد کو کہتے ہیں۔

(۳) نبیوں سے عہد لیا گیا حالانکہ وہ ہیں ہی حکم کے بندے اور تعمیل کے لئے مستعد۔ تاکید اور زیادہ ہوگئی۔

(۴) وہ حروف اور کلمے استعمال کیے جن سے زیادہ تاکید کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً لام تاکید اور نون تاکید۔

(۵) اسی پر اکتفا نہیں کیا تاکید کے لئے پھر سوال کیا۔ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ ؟ کیا تم اقرار کرتے ہو۔

(۶) اقرار کیلئے ءَاَقۡرَرۡتُمۡ پر بس نہیں کی مزید فرمایا وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِكُمۡ اِصۡرِیۡ (اور کیا اس شرط پر میرا عہد قبول کرتے ہو) اِصر کہتے ہیں

العهد المؤكد الموثق ایسے پختہ وعدے کو جس میں بہت زیادہ تاکید ہو۔ (ابن عاشور)

(۷) اقرار کے بعد انہیں گواہ بنایا۔

(۸) خود اس پر گواہ بنا۔ هذا توكيد عليهم وتحذير من الرجوع

یہ عہد کس سے لیا گیا؟ کس کیلئے لیا گیا؟ مختلف تفاسیر میں سے قابل ترجیح بات یہ ہے۔

عہد انبیاء اور ان کی امتوں سے لیا گیا۔ اور امتوں کا ذکر حذف کر دیا کیونکہ تابع کا عہد متبوع کا عہد بھی ہوتا ہے۔ جن کیلئے یہ عہد لیا گیا وہ محمد ﷺ ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں۔

لم يبعث الله نبيا ادم فمن بعده   اللہ نے آدم علیہ السلام اور ان کے بعد جس نبی کو

الا اخذ عليه العهد فی محمد   بھیجا ہر ایک سے محمد صلی علیہ وسلم کیلئے پکا وعدہ لیا
صلى الله عليه وسلم لئن بعث   اگر آپ آئے اور وہ نبی زندہ ہوا تو ضرور آپ پر
وهو حی ليؤمنن به ولينصرنه و   ایمان لائے گا۔ اور آپکی مدد کرے گا۔ اللہ کے
يأمره فيأخذ العهد على قومه   حکم کے مطابق ہر نبی نے اپنی قوم سے بھی وعدہ
ثم تلا الاية (روح المعانی سال عمران)   لیا پھر دلیل میں آپ ﷺ نے یہ آیت پڑھی

اس عہد کے بارے میں ابن عاشور فرماتے ہیں۔

وفی اخذ العهد على الانبياء زيادة تنويه   اور انبیاء سے عہد لینے میں آپکی رسالت
برسالة محمد صلى الله عليه وسلم   کو مزید شہرت عطا کرنا پایا جاتا ہے۔
وهذا المعنى هو ظاهر الاية   ظاہر آیت کے یہی معنی ہیں۔

روح المعانی میں ہے۔

وفی اخذ الميثاق من النبين له صلى   انبیاء سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے میثاق لیا
الله عليه وسلم على مادل عليه كلام   حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا کلام اس بات کی
الامير كرم الله وجهه مع علمه سبحانه   دلیل ہے۔ حالانکہ اللہ جانتا تھا کہ نبی آپ کا
انهم لايدركون وقته لا يمنع من   زمانہ نہیں پائیں گے اللہ کا علم اس میں رکاوٹ
ذالك لمافيه مع ما علمه الله تعالى   نہیں کیونکہ اس میثاق میں اللہ کے علم کے ساتھ
من التعظيم له صلى الله عليه و   آپ کی تعظیم، قدر و منزلت، شان کی بلندی
سلم والتفخيم ورفعة الشان والتنويه   اور ذکر کے ساتھ آپ کی شہرت ہے جو صرف
بالذكر مالا ينبغی الا لذالك الجناب   آپ ہی کے لئے مناسب ہے

یہ عہد آپ کے لئے تھا۔ اور آپ ﷺ اس میں شامل نہیں تھے۔ اسکی ایک دلیل یہ بھی ہے۔ اگر آپ شامل ہوتے تو کلام یوں ہوتا۔ آپ سے اور تمام نبیوں سے عہد لیا۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا۔

وَاِذۡ اَخَذۡنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيۡثَاقَهُمۡ وَمِنۡكَ وَمِنۡ نُّوۡحٍ

اور اسلئے بھی کہ یہ عہد مقدم سے مؤخر کیلئے تھا۔ اللہ کے علم میں آپ کا آنا سب نبیوں کے بعد

طے تھا۔ اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ لہذا یہ مان لیا جائے کہ ہر پہلے پیغمبر سے پچھلے کیلئے میثاق لیا گیا۔ تب بھی آپ اس میں شامل نہیں۔ اور یہ تو معلوم ہی ہے جس کیلئے عہد لیا جاتا ہے وہ اس عہد میں شامل نہیں ہوتا۔ یہ عہد آپ کے لئے ہے۔ اور اس میں آپکی شان کا اظہار ہے۔ آپ مقدم اور صاحب فضیلت ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سب نبیوں کے بعد آنا آپ کے لئے طے ہو چکا ہے۔ کوئی امکان نہیں کہ آپ کسی دوسرے نبی کے زمانے میں تشریف لائیں۔ پھر اس عہد میں آپکی شان، تقدیم اور فضیلت کیا ہوئی۔ اور فرض کر لیا جائے آپ ﷺ ان انبیاء سے پہلے یا درمیان میں تشریف لاتے۔ تو کیا آخری نبی ہوتے؟ جیسا کہ مفسر علامہ اسماعیل حقی نے

ای جاء فی زمانک — تمھارے زمانے میں آیا۔

کے الفاظ سے اشارہ کیا ہے۔

حضرت نانوتوی کی تحقیق

ایسے سوالات کے جوابات میں مولانا قاسم نانوتویؒ نے ایک عجیب، دقیق، نادر اور نفیس بحث فرمائی ہے۔ اس سے آپ ﷺ کی تقدیم و فضیلت کھل کر سامنے آتی ہے۔ اسکا مفہوم کچھ وضاحت کے ساتھ ہدیہ قارئین ہے۔ فرماتے ہیں۔

آپ ﷺ کا آخری نبی ہونا تین طرح سے ہے۔ ان میں سے ایک خاتمیت ذاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے آپکو براہ راست نبوت عطا ہوئی۔ دیگر انبیاء کو آپکی معرفت اس منصب سے سرفراز کیا گیا۔ جیسے ایک چراغ جلا کر اس سے کئی چراغ روشن کیے جائیں۔ انبیاء کی نبوت آپ ﷺ کا فیض ہے۔ آپ کی نبوت کسی نبی کا فیض نہیں کیونکہ

(۱) اتنی تاکید کے ساتھ عہد لینا آپ ﷺ کی تقدیم اور فضیلت ظاہر کرتا ہے۔ یہ فضیلت اسی وقت ہوگی جب آپ میں وہ صفت ہو جو دوسروں میں نہ ہو۔ ورنہ آپ بھی نبی ہیں اور وہ بھی نبی ہیں۔ وہ کمال یہی ہو سکتا ہے کہ نبوت کی صفت میں آپ دوسرے نبیوں سے بڑھے ہوئے ہوں۔ یہ اضافہ اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ آپکو براہ راست اور باقیوں کو آپ کی وساطت سے نبوت عطا کی جائے۔

(۲) آپ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد پوری تاکید کے ساتھ لیا گیا نبیوں نے بھی پورے زور

وشور سے اقرار کیا۔ گویا کہ ایمان لے آئے اور نامہ اعمال میں ثواب شروع ہو گیا۔ آپ ﷺ نبی الانبیاء ہوئے اور تمام نبی آپ ﷺ کے امتی بنے۔ نبی امتی سے افضل ہوتا ہے۔ جب نبوت میں بھی شریک ہیں تو آپکی فضیلت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپکی نبوت ذاتی ہو۔ اور دوسروں کی نبوت آپ کا فیض ہو۔

نبی اور امتی کا فرق

نبی اور امتی میں افاضہ کا ربط ہوتا ہے۔ انبیاء پر افاضہ نبوت کی صورت میں ہوا۔ انہیں صفت نبوت آپ کے واسطے سے عطا ہوئی۔ دوسرے امتیوں کو علم نبوت ملا۔ نبوت نہیں۔ نبی کا ایمان، تصدیق اور علم امتی کے ایمان، تصدیق اور علم سے جدا ہوتا ہے۔ نبی کا ایمان حصولی، حضوری، شہودی اور عینی ہوتا ہے۔ امتی نبی کی خبر پر ایمان لاتا ہے۔ نبی کی تصدیق شہودی اور عینی ہوتی ہے۔ امتی نظری اور استدلالی تصدیق رکھتا ہے۔

نبی سے امتی کی طرف ایمان کے بہاؤ کی مثال اس ٹرانسفارمر سے دی جا سکتی ہے۔ جو 220 وولٹ کرنٹ لے کر 110 وولٹ آگے منتقل کرتا ہے۔ اے۔ سی۔ کرنٹ کو ڈی۔ سی کرنٹ میں تبدیل کر دیتا ہے۔ نبی جس کو ایمان اور علم کا افاضہ کرے اس کے بارے میں دو ہی باتیں ممکن ہیں یا تو وہ قبول کرے گا یا نہیں اگر قبول کر لیا تو پھر بھی دو باتیں ہی ہو سکتی ہیں قبول کرنے والا نبی ہوگا یا غیر نبی۔ اگر قبول کر لیا اور یہ نبی بھی نہیں تو معلوم ہوا یہ بعینہ وہ علم یعنی صفت نبوت نہیں جو نبی کو ملی ورنہ امتی میں برداشت کی طاقت ہی نہ ہوتی جیسے وحی نازل ہونے پر حضرت زید بن ثابت کا قصہ آتا ہے۔

(۳) مصدق

اس آیت میں آپکی صفت مصدق ذکر کی گئی ہے۔ یہ دو باتوں کی دلیل ہے۔ ایک اس بات کی کہ یہ عہد آپ کے لئے لیا گیا۔ کیونکہ آپ پر ہی یہ صفت صحیح صادق آتی ہے۔ آدم سے لے کر عیسیٰ تک تمام انبیاء کرام علیھم السلام کی تصدیق آپ ﷺ ہی نے کی۔ جیسے کہ اللہ نے فرمایا

وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ اور سچا بتلاتا ہے رسولوں کو (الصافات۔ ۳۷)

قرآن مجید کی شان بھی یہی ہے۔ جو سلسلہ کلام جاری ہے مصدق ہونا اس کی دلیل بھی ہے۔ یہ مدح اور فضلیت کا مقام ہے۔ مصدق (تصدیق کرنے والا) کہہ کر آپ کی شان بتائی گئی ہے۔ اس وصف میں تمام انبیاء آپ کے شریک ہیں۔ سارے انبیاء ایک دوسرے کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ آپکی یہ فضلیت تبھی بن سکتی ہے۔ جب یہ آپکی ذاتی صفت ہو اور دوسرے انبیاء کی بالعرض ۔ آپکو یہ رتبہ براہ راست دیا گیا ہو اور دیگر انبیا کو آپکی معرفت اور واسطے سے یہ دولت ملی ہو۔

علامہ آلوسی کا ارشاد

تفسیر روح المعانی میں ہے۔

ومن هناذهب العارفون الى انه صلى الله عليه وسلم هو النبى المطلق والرسول الحقيقى والمشرع الاستقلالى وان من سواه من الانبياء عليهم الصلاة والسلام فى حكم التبعة له صلى الله عليه وسلم	اور عارفین اس مقام پر فرماتے ہیں۔ یقیناً آپ صلی اللہ علیہ وسلم مطلق نبی اور حقیقی رسول ہیں۔ آپکو مستقل شریعت دی گئی۔ دوسرے تمام انبیاء آپکے تابع ہونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ (آل عمران ۸۱)

دلیل ختم نبوت

یہ آیت واضح کرتی ہے کہ حضور ﷺ خاتم النبین ہیں۔ آپ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ جب مراتب میں آپ آخر اور خاتم ہیں تو لازم ہے کہ آمد میں بھی آخر ہوں

(۴) حدیث رسول :

صحابہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا آپکو نبوت کب ملی تو آپ ﷺ نے فرمایا اس وقت۔

وادم بين الروح والجسد ۔ جبکہ آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے (ترجمان السنہ)

آپ ﷺ نے اس بات کو اپنی فضلیت کے طور پر بیان کیا۔ اس کا یہ مطلب لینا مناسب نہیں کہ آپ ﷺ اس وقت اللہ کے علم میں نبی تھے۔ کیونکہ آپکی طرح دوسرے انبیاء کی نبوتیں بھی اللہ کے علم تھیں۔ اور یہ کہنا بھی مناسب نہیں کہ اللہ کے علم میں آپکو اس شرف سے پہلے موصوف

کیا گیا۔ کیونکہ اللہ کا علم بسیط ہے۔ اور وہاں ایسی تقدیم و تاخیر نہیں کہ فلاں چیز اللہ کے علم میں پہلے آئی اور فلاں بعد میں۔ پھر تقدیم اور تاخیر میں کوئی ذاتی فضلیت بھی نہیں۔ مقدم یا موخر کرنے کا کوئی اور خارجی سبب ہوتا ہے۔

لھذا اس کا مطلب یہی ہوگا کہ آپکو یہ وصف براہ راست دیا گیا اور باقی انبیا کو آپکی معرفت سے عطا کیا گیا۔ مثلاً سورج کے سامنے ایک آئینہ رکھا جائے اور اس آئینے کے محاذات میں چند اور آئینے رکھے جائیں تو ہر آئینے میں سورج کا عکس ہوگا۔ پہلے میں براہ راست اور دوسرے آئینوں میں اس عکس کا عکس نظر آئے گا۔ یا جیسے ایک دیا جلا کر باقی دیے اسی سے روشن کیے جائیں۔ اسکا نام خاتمیت ذاتی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت اتنی جامع اور ہمہ گیر ہے کہ اس نے تمام انبیاء کو بھی اپنے احاطے میں لے لیا ہے۔ آپ ﷺ نبیوں کے نبی ہیں۔ مرسلین کے امام ہیں۔ رسولوں کے مقتدا ہیں اور اللہ کے فرستادے ان مقدس ترین انسانوں کے پیشوا ہیں۔

اولی با لمومنین

اللہ نے آپکو یہ شان بھی عطا فرمائی کہ آپ کو اولی بالمومنین قرار دیا یعنی مومنوں کے ساتھ آپ اوّلیت کا تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی اولیت جو ایمان والوں کی جانوں سے بڑھ کر ہے۔ اہل ایمان پر آپ کا حق انکی جانوں سے زیادہ ہے۔ فرمایا

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ

نبی مومنین کے ساتھ ان کے نفس سے بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں۔ (بیان القرآن ، الاحزاب۔ ۶)

اولی کے معانی

مفسرین نے اولی کے درج ذیل معنی بیان کئے ہیں۔

(۱) ارحم ۔ زیادہ رحم کرنے والا

یقال معناہ النبی ارحم بالمومنین من انفسہم — کہا گیا نبی مومنین پر ان کی جانوں سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں (السمرقندی)

(۲) اراف ۔ زیادہ شفقت کرنے والا

(۳) اعطف ۔ زیادہ مہربانی کرنے والا ای اراف بہم واعطف علیہم

یعنی آپ مومنین پر ان کی جانوں سے زیادہ مہربان اور شفیق ہیں۔ کیونکہ

اذھو یدعوھم الی النجاۃ و انفسہم تدعوھم الی الھلاک — آپ انہیں کامیابی کی طرف بلاتے ہیں اور ان کے نفس انہیں ہلاکت کی دعوت دیتے ہیں۔ (البحر المحیط)

(۴) احق ۔ زیادہ حق رکھنے والا

النبی محمد اولی بالمومنین یقول احق بالمومنین بہ من انفسہم — نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کے لئے اولی ہیں اللہ فرماتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم مومنین کی جانوں سے زیادہ حقدار ہیں۔ (الطبری)

(۵) اقرب ۔ زیادہ قرب رکھنے والا ۔ روح المعانی میں ہے

ای احق واقرب الیہم — یعنی آپ زیادہ حقدار اور ان کے زیادہ قریب ہیں۔

ابن عاشور کہتے ہیں

فاولی اسم تفضیل من الولی وھو القرب ای اشد قربا — پس اولی ولی سے اسم تفضیل کا صیغہ ہے اور وہ قرب ہے یعنی بہت نزدیک

آپ مومنین کے لئے اولی ہیں۔ اہل ایمان کے مولی ہیں۔ اس کی حد بیان کرتے ہوئے قرآن نے من انفسہم کے الفاظ زیادہ کئے۔ آپکی اولیت مومنوں کی جان سے زیادہ ہے۔ انفس، نفس کی جمع ہے۔ نفس وہ لطیفہ انسانی ہے۔ جسے اردو میں جان کہا جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار آپ کے حضور عرض کی۔

لانت احب الی من کل شیء الا من نفسی التی بین جنبی فقال لہ النبی صلی علیہ وسلم لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ — میں اپنی جان کے علاوہ ہر چیز سے بڑھ کر آپ سے محبت رکھتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کوئی ایمان والا تب تک کامل الایمان نہیں ہو سکتا جب تک اپنی جان سے زیادہ مجھ سے محبت نہ کرے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا۔

والذی انزل علیک الکتاب لانت احب الی من نفسی — جس نے آپ پر کتاب اتاری اسکی قسم آپ مجھے میری جان سے زیادہ عزیز ہیں

حضور ﷺ نے حضرت عمر کے جواب میں جو بات ارشاد فرمائی اس نے متعین کر دیا نفس سے مراد تمام ایمان والوں کا مجموعی نفس نہیں بلکہ ہر مومن کا نفس ہے۔ اس لیے ابن عاشور نے فرمایا

قربا لکل مومن من قرب نفسہ الیہ — آپ کو ہر مومن کی جان سے زیادہ قرب حاصل ہے

اولی کی مراد

اولی کے بیان کیئے گئے معنی سامنے رکھتے ہوئے آپ کی اَوّلیت کا مطلب ہوا۔ ہر مومن اپنے نفس پر مہربان ہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے زیادہ اس کی جان پر مہربان ہیں۔ اپنی جان پر ہر مومن شفقت کرتا ہے۔ آپکی شفقت اس سے بڑھ کر ہے۔ ہر مومن پر اسکا نفس مہربان اور شفیق ہوتا ہے آپ کی مہربانی اور شفقت ان کے نفسوں سے زیادہ ہے۔ نفس بھی حق رکھتا ہے اور جان بھی قریب ہوتی ہے پر آپ ﷺ نفس سے زیادہ حقدار اور جان سے زیادہ قریب ہیں۔
غور کیا جائے تو ہر معنی قُرب کی طرف لوٹتا ہے۔ شفقت، مہربانی اور حق اسی وقت زیادہ ہوتا ہے جب قرب میں اضافہ ہو۔ معلوم ہوا کہ آپ ﷺ ہر مومن کے قریب ہیں۔ جان ہی بندے کی حقیقت اور ذات ہوتی ہے۔ آپکا قرب ہر مومن کی جان اور حقیقت سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ اَوّلیت اور قُرب آپ کو کیسے حاصل ہے؟

حضرت نانوتوی کی تحقیق

مولانا قاسم نانوتوی ؒ نے اس کی نفیس اور پیاری تحقیق فرمائی جو تسہیل، خلاصے اور وضاحت کے ساتھ پیش خدمت ہے۔

اولی کا معنی اقرب ہوتا ہے۔ جو چیز زیادہ قریب ہو اسے اقرب کہتے ہیں۔ قُرب کی بنیادی طور پر دو قسمیں ہیں۔ حسی قرب اور عقلی یا معنوی قُرب۔ جس قرب کو حواس خمسہ سے دیکھا جائے وہ حسی قرب ہے اور جس قرب کو عقل سے محسوس کیا جائے۔ وہ عقلی یا معنوی قرب ہے۔ اسکی ایک قسم فکری قرب اور ایک قسم ذاتی قرب ہے۔

جب ایک چیز کسی کی ذات اور حقیقت میں داخل ہو جائے۔ ذات کا وجود اس پر موقوف ہو۔ اسے سمجھنے سے پہلے اس چیز کا تصور ضروری ہو جائے۔ تو اسے ذاتی قرب کہتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ایک طرف سے فیض لیا جائے اور دوسری طرف سے دیا جائے اسکو افاضہ (بہاؤ) کہتے ہیں۔ یہی ذاتی قرب ہے۔ جو ترقی کر کے چیز کی حقیقت اور ذات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اس کی ایک اضافی شرط ہے۔ فیض دینے والے کا فیض ذاتی اور اپنا ہو دوسرے سے اخذ نہ

کیا جائے۔ اب یہ دو شرطیں ہو گئیں ایک افاضہ کی شرط اور دوسری فیض ذاتی ہونے کی شرط۔
اس آیت میں قابل غور بات یہ ہے۔ آپ کی وہ صفت ذکر کی جسے تسلیم کرنے پر ایمان موقوف ہے۔ نبی کی طرف سے ایمان کا فیض آتا ہے۔ دوسری طرف مومنین کا ذکر کیا۔ جنہوں نے اس فیض کو قبول کیا۔ مومن ایمانی وجود ہے۔ جو نبی کے مرہون منت ہے۔ یہ ایمانی وجود نبی پر موقوف ہے۔ نبی کا فیض قبول کرے گا تو ایمان والا بنے گا۔ یہ تو ہو گیا افاضہ۔ اب نبی کا ایمان ذاتی ہے اور امتی کا ایمان نبی کا فیض ہے۔ مومنانہ وجود کو سمجھنے سے پہلے نبی کا تصور ضروری ہے۔ اس لئے کہا جائے گا نبی کو مومن کی ذات سے زیادہ اس کے ساتھ قرب حاصل ہے۔ مزید وضاحت کے لئے دو مثالیں پیش خدمت ہیں۔

(۱) آگ لوہے کو جلا کر سرخ کر دیتی ہے۔ اس کی طرف سے حرارت لوہے میں منتقل ہوتی ہے۔ یہ حرارت آگ کی ذاتی صفت ہے۔ کسی دوسری چیز سے اخذ نہیں کی گئی۔ لوہا آگ سے حرارت لیتا ہے۔ جس سے لوہے کو ایک نیا آتشی وجود ملتا ہے جو آگ کے مرہون منت ہے۔ آگ کی حرارت نے لوہے کی ذات میں داخل ہو کر اسے متغیر کر دیا یہاں یاد رہے آگ اپنی جگہ موجود ہے وہ لوہے میں داخل نہیں ہوئی۔ ہاں آگ کا اثر یعنی حرارت لوہے میں سرایت کر گئی۔ لوہے کے آتشی وجود میں آگ پہلے اور آتشی وجود بعد میں ہے۔ قُرب کا تقاضا ہے کہ ایک چیز دوسری سے پہلے ہو۔ آگ اس آتشی وجود کی حقیقت میں داخل اور پہلے ہے۔ اس لئے آگ کا قُرب لوہے کے ساتھ اس کی حقیقت سے بڑھ کر ہے۔

(۲) اللہ نے انسان میں حصول علم کی استعداد رکھی ہے۔ یہ استعداد ایک معنوی نور ہے۔ جو انسان کی ذات سے سورج کے ساتھ روشنی کی طرح لپٹا ہوا ہے۔ اس کے ذریعے انسان معلومات بھی لے سکتا ہے اور ان کی دلالت سے نا معلوم کو معلوم کر سکتا ہے۔ جو چیز ہمارے حواس خمسہ میں آتی ہے اس کی ایک تصویر دماغ میں محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ معلوم کا ذہنی وجود ہے۔ یہی ذاتی علم اور انسان کی صفت ہے۔

العلم ہو حصول صورۃ الشئی فی العقل ذہن میں کسی چیز کا نقش حاصل ہونا ہی علم ہے

اس سے اگلا مرحلہ شناخت کا ہوتا ہے۔ علم کو معلوم پر اور ذہنی وجود کو خارجی وجود پر منطبق کرنا شناخت کہلاتا ہے۔ جیسے سبزیوں میں سے سبزی کو، پھلوں میں سے پھل کو اور لوگوں کی بھیڑ میں سے احباب واقارب کو شناخت کر لیا جاتا ہے۔ یہ شناخت اور تمیز جن صفات کے ذریعے ہوتی ہے انہیں تشخصات اور تعینات کہتے ہیں۔ مثلاً قد، بت، رنگ روپ، شکل صورت، آواز، نام، ذائقہ، بو وغیرہ۔

ان خصوصیات کے بغیر حاصل ہونے والا نقش ہی علم اور ذاتی صفت ہے۔ اور اس نقش یا تصویر کی یہ خاص صفات معلوم ہیں۔ کیونکہ تمیز اور ادراک انہی سے حاصل ہوتا ہے۔ یہ خصوصیات اسی نقش کے ساتھ اسی کے ذریعے حاصل ہوتی ہیں۔ شناخت کے عملی مرحلے میں مجرد نقش و تصویر یا ذہنی وجود دماغ کے پردے پر ابھرتا ہے۔ جو ذاتی علم ہے۔ پھر اس کے ساتھ تشخصات و تعینات لگتے ہیں۔ جو معلوم کی حقیقت ہیں۔ گویا عالم کی طرف سے معلوم پر ذہنی وجود کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس فکری قرب میں ذہنی وجود اور مجرد نقش پہلے آتا ہے۔ تشخصات بعد میں آتے ہیں۔ تو لازم آیا ذاتی علم اس معلوم کی حقیقت سے زیادہ اس کے قریب ہے۔

اولی کے لفظ کی حکمت

اقرب سمیت قرب کے کئی مشتقات قرآن میں استعمال ہوئے۔ اولی کی مراد اگر قرب ہی تھی تو یہ صریح لفظ چھوڑ کر اولی کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟ اس بات کو سمجھنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اولی کا مفہوم ایک دو لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک شان کی شانوں کو مستلزم ہے۔ اقرب اولی کا مجازی معنی ہے۔ اولی کو

یستعار ذالک للقرب (مفردات) قرب کے لئے مستعار لیا گیا ہے۔

اس کے استعمالات سے قُرب کا مفہوم ماخوذ ہوتا ہے۔ مادے کے لحاظ سے اولی اصل میں دو چیزوں کے درمیان ایسے اتصال کے لئے آتا ہے جس سے اجنبیت ختم ہو جائے۔ یعنی دونوں کے درمیان ایک تعلق پیدا ہو جائے۔ اولی اور اقرب میں درج ذیل فرق ہیں۔

(۱) اولی صرف معنوی اور عقلی چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اقرب حسی اور معنوی دونوں

چیزوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جیسے دو اجنبی قریب بیٹھے ہوں۔ ان میں قُرب تو ہے لیکن ولیت اور اولیت نہیں۔ سورہ آل عمران فرمایا

إِنَّ أَوْلَى النَّاسِ بِإِبْرَاهِيمَ لَلَّذِينَ — لوگوں میں ابراہیم کے قریب ان کے

اتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا — پیروکار، یہ نبی اور اہل ایمان ہیں

حالانکہ نزول آیت کے وقت ابراہیم علیہ السلام کو اس دنیا سے رخصت ہوئے کئی قرن گزر چکے تھے۔ حسی قُرب کا وہاں تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ اولیت اور معنوی قُرب ہے۔

(۲) اولی میں دو چیزوں کے درمیان تعلق اور معنوی اتصال ضروری ہے۔ جیسے نبی اور مومنین کے درمیان ایمان کا تعلق ہے۔ قُرب میں اتصال اور تعلق ضروری نہیں۔

(۳) اولی میں تعلق اتصال مسلسل رہتا ہے۔ تسلسل نہ ہو تو اولیت نہیں ہو سکتی۔ قُرب میں یہ ضروری نہیں۔

اب نبی اور مومنین کے درمیان تعلق پر غور کیا جائے۔ یہاں دونوں کے درمیان ایمان کی وجہ سے ایک تعلق اور اتصال ہے۔ اقرب کے لفظ سے اسکی وضاحت نہ ہوتی۔ یہ اتصال مسلسل ہے۔ اقرب کے استعمال سے تاثر ملتا شاید لمحاتی اور وقتی قرب ہے۔ اس لئے کہ تسلسل تو معنوی قُرب میں پایا جاتا ہے۔ پھر یہ اتصال اور تسلسل عقلی اور معنوی ہے۔ اقرب کا لفظ لانے سے حسی قرب کا شبہ پیدا ہوتا۔ اور زیادہ امکان تھا۔ اسکا حسی معنی لے کر یہ سمجھا جاتا نبی ہر وقت ہر مومن کے پاس بنفس نفیس موجود ہیں۔ اور یوں آپ کو اللہ کی صفت میں شریک کر لیا جاتا۔ جہاں اس بات کا اندیشہ نہیں تھا وہاں سورہ ق میں اقرب کا لفظ استعمال فرمایا۔ علامہ آلوسی یہاں اس مقام پر روح المعانی میں فرماتے ہیں

ولا مجال لحمله على القرب المكاني — اس آیت کو قرب مکانی پر حمل کرنے کی کوئی گنجائش نہیں

لتنزهه سبحانه عن ذالك (ق۔۱۶) — کیوں کہ اللہ سبحانہ وتعالی کی ذات اس سے پاک ہے۔

پھر یہ بات بھی قابل غور ہے یہاں اولی اور وہاں اقرب کا لفظ ارشاد فرمانے کے علاوہ اولیت کو مومنین کے ساتھ خاص کیا اور اقرب کو تمام انسانوں کے لئے عام رکھا۔ بہر حال اولی

کے استعمال نے ان مفاسد دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات متعین ہوگئی ہے کہ آپ کو مومنین کے ساتھ ایک خاص طرح کا قُرب حاصل ہے۔ جو متصل، مسلسل اور معنوی ہے۔ جو آپ کی حیات میں حاضر مجلس تھے انہیں بھی حاصل تھا۔ جو دور تھے انہیں بھی اور جو قیامت تک آئیں گے انہیں بھی حاصل ہوگا۔ جیسے لوہے اور آگ کی مثال سے یہ بات واضح ہے۔ لوہا کہیں بھی لے جاؤ آگ اپنی جگہ رہے گی۔ ہاں آگ نے جو تاثیر منتقل کی ہے وہ ساتھ رہے گی۔ اس لئے مفسرین نے اسکی تفسیر معنوی قُرب سے کی ہے۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

وھو قُرب معنوی یراد به اثار القُرب من محبة ونصرة	اور یہ معنوی قُرب ہے۔ اس کے ساتھ قُرب کے آثار مثلاً محبت اور مدد وغیرہ ظاہر ہوتے ہیں۔

اولی کے دیگر مفاہیم

اولی کے مصادر اور ان کے استعمالات و مشتقات سے مندرجہ ذیل مفاہیم بھی سامنے آتے ہیں۔

مثلاً محب، ساتھی، مددگار، اختیار، اقتدار، سردار، مالک وغیرہ۔

حضور ﷺ سے زیادہ اہل ایمان کا دوست اور کوئی نہیں۔ آپ ﷺ ان کی جانوں سے زیادہ ان سے محبت فرماتے ہیں۔ ان کے مددگار ہیں۔ جیسے امت کے لئے اللہ سے احکام میں آسانی مانگی۔ اعمال میں کمی کروائی مثلاً سفر معراج میں بار بار نماز کی تعداد کم کروانے کے لئے اللہ کے حضور تشریف لے جاتے رہے۔ ان کے گناہوں کی اللہ سے مغفرت مانگی۔ ان کے لئے اللہ سے اجر میں زیادتی طلب کی۔ کل قیامت کے دن بذریعہ شفاعت تمام انسانوں کی عموماً اور مومنین کی خصوصاً مدد فرمائیں گے۔ آپ مومنین پر پورا اختیار رکھتے ہیں آپ کا ہر حکم ان کے لئے واجب العمل ہے۔ یہاں تک کہ دوران نماز بھی کسی ایمان والے کو بلائیں تو نماز توڑ کر آپ کی پکار پر لبیک کہنا اس کا فرض ہے۔ مومنین کے آقا اور ان کے سید و سردار ہیں۔ اس جملے میں آپ کے روحانی باپ ہونے کی طرف بھی اشارہ ہے۔ بیٹے کا وجود باپ کے مرہون منت ہوتا ہے۔ بیٹے کو اپنی حقیقت سے پہلے باپ کا وجود ماننا پڑے گا۔ باپ اصل ہے۔ بیٹا اس کی نسل ہے۔ آپ کا مومنین کے ساتھ یہی اصل اور نسل کا تعلق ہے۔ آپ کا ایمان اصل اور ذاتی ہے۔ اہل

ایمان کا ایمان آپ کے ایمان کی نسل اور شاخ ہے۔ اس لئے آپ ﷺ امت کے روحانی باپ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی قرأت اسکی دلیل ہے۔ نیز اس جملے کے فوراً بعد فرمایا

وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ ۔ اور آپکی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔

گویا کلام یوں ہو گیا آپ ﷺ مومنین کے باپ اور آپ کی بیویاں مومنین کی مائیں ہیں۔ والد کا صریح لفظ اس لئے استعمال نہیں کیا گیا کہ اس صورت میں آپ کی حرمت حقیقی باپ کی مانند ہو جاتی۔ جیسے آپ کی ازواج سے امتی کا نکاح جائز نہیں ویسے ہی امت کی بیٹیوں کا نکاح آپ ﷺ سے جائز نہ ہوتا۔

امام المفسرین حضرت مجاہد فرماتے ہیں۔

کل نبی ابو امته۔ ہر نبی اپنی امت کا باپ ہوتا ہے۔

مفسر اسماعیل حقی اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

قال بعضهم لم یسمه لنا ابا لانه لو سماه ابا لکان یحرم نکاح اولا ده کما حرمت علی الامة نساوه لکونهن امها تهم اولانه سماه ابا لکان یحرم علیه ان یتزوج امته کما یحرم علی الاب ان یتزوج ابا بنته و تزوج بنات امته لیس بحرام (حقی، الاحزاب ۴۰)	بعض علماء نے فرمایا آپکو ہمارے لئے والد کا نام نہیں دیا گر والد کا نام دیا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کا نکاح کرنا حرام ہوتا جیسے امت پر آپ کی بیویوں سے نکاح حرام ہے کیونکہ وہ امت کی مائیں بنائی گئیں یا اس لئے کہ اس صورت میں آپ پر امت کی عورتوں سے نکاح کرنا اسی طرح حرام ہوتا جیسے باپ پر اپنی بیٹی سے نکاح حرام ہے جبکہ امت کی بیٹوں سے نکاح کرنا آپ پر حرام نہیں۔

حضور ﷺ کو کس بات میں قرب حاصل ہے

آپ ﷺ کو ایمان والوں کی جان سے زیادہ قُرب حاصل ہے اور انکی جانوں سے بڑھ کر ان پر حق رکھتے ہیں۔ یہ اتنا زیادہ قرب کس بات میں ہے۔ کس معاملے میں آپکو ہر مومن کی جان سے زیادہ اس پر حق حاصل ہے۔ قرآن اس کی وضاحت نہیں کرتا۔

مفسرین نے تین باتیں ذکر کی ہیں۔

(۱) آپ اطاعت میں مومنین کی جانوں سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

اذا دعاهم النبي صلى الله عليه	آپ صلی اللہ علیہ وسلم کسی چیز کی طرف دعوت
وسلم الى شئ ودعتهم انفسهم	دیں اور نفس کسی دوسری بات کی طرف بلائے
الى شئ كانت طاعة النبي صلى	تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اطاعت کے زیادہ
الله عليه وسلم اولى بهم	حقدار ہیں

(۲) آپ ﷺ مال اور جان کے تصرف میں ان کی جانوں سے زیادہ حقدار اور مقدم ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی ارشاد فرماتے ہیں۔

اپنی جان کو آگ میں ڈالنا جائز نہیں۔ نبی اگر حکم دے فرض ہو جائے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا۔

ما من مومن الا انا اولى به فى	میں دنیا اور آخرت میں ہر مومن پر زیادہ حق رکھتا
الدنيا والاخرة اقرء وا ان شئتم	ہوں اگر چاہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھ لو۔ نبی
النبي اولى بالمؤمنين من	مومنوں کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتا ہے۔
انفسهم فايما مومن مات وترك	پس جو مومن مال چھوڑ کر مر گیا تو وہ اس کے وارثوں
مالا فليرثه عصبته ومن ترك دينا	کا ہے اور جو قرض اور عیال چھوڑ کر گیا وہ میرے
او ضياعا فليأتني فانا مولاه	پاس آئے پس میں اس کا سرپرست ہوں۔ (بغوی)

(۳) آپ ہر بات میں ایمان والوں کی جانوں سے مقدم، زیادہ قریب اور حقدار ہیں۔ قرآن نے اسے مطلق رکھا اور کوئی پابندی نہیں لگائی فى كل شئ ولم يقيد۔ (البحر المحیط)

اولی کا تقاضا

آپ ﷺ ہر بات میں مومنوں کی جانوں سے بڑھ کر ہیں۔ جب یہ بات معلوم ہو گئی کہ مومن کا وجود آپ کے رہین منت ہے۔ آپ کے بغیر کسی مومن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ آپکا حق ان کی

جان سے بڑھ کر ہے۔ آپ کی شفقت ان پر انکے نفس سے زیادہ ہے۔ آپ انکی حقیقت سے زیادہ ان کے قریب ہیں۔ ان کی ذات ان پر اتنی مہربان نہیں جتنا آپ ﷺ ان پر رحم و کرم کرنے والے ہیں۔ تو اب اس کا تقاضا ہے کہ مومنین اپنی جانوں پر آپ کو ترجیح دیں۔ اپنی جان سے بڑھ کر آپ سے محبت کریں۔ جیسا کہ لازمی معنی لیکر شاہ عبدالقادر محدث دہلوی نے اس کا ترجمہ کیا

نبی کے ساتھ لگاؤ مومنین کو اپنی جان سے زیادہ ہے۔

تفسیر الثعالبی میں فرمایا

فجميع هذا ان المومن يلزم ان يحب	اس آیت نے لازم کر دیا مومن اپنی جان سے
النبي صلى الله عليه وسلم اكثر من	زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے...
نفسه ..... ويلزم ان يمتثل اوامره	نفس پسند کرے یا نہیں بہرحال آپ کے
احبت نفسه ذالك او كرهت	حکموں کی تعمیل کرے۔ (الثعالبی)

اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں

واذا كان صلى الله عليه وسلم بهذه	اور جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم مومنوں کے حق
المثابة فى حق المومنين يجب عليهم	میں یہ جائے پناہ ہیں تو ان پر لازم ہے کہ اپنی
ان يكون احب اليهم من انفسهم و	جان سے زیادہ آپ سے محبت کریں اور حضور
حكمه عليه الصلاة والسلام عليهم	کا حکم نفس حکم سے زیادہ نافذ سمجھیں اور آپ
انفذ من حكمها وحقه اثر لديهم من	کے حق کو اس کے حقوق پر ترجیح دیں اور آپ
حقوقها وشفقتهم عليه قدم من شفقتهم	پر ان کی شفقت نفس پر شفقت سے مقدم ہو

حضرت تھانوی فرماتے ہیں

کیونکہ نفس اگر برا ہے تب تو ظاہر ہی ہے کہ وہ بدخواہ ہے اور حضور ﷺ خیر خواہ ہیں اور اگر نفس اچھا ہے تب بھی بعض مصالح و منافع اس سے مخفی رہتے ہیں ان مصالح کا مشورہ وہ نفس نہیں دے سکتا اور حضور ﷺ کو اللہ نے جمیع مصالح ضروریہ کا علم عطا فرمایا ہے۔ اور آپ نے ان کی تعلیم فرمائی ہے۔ بہرحال آپ سے نفع ہی نفع ہے اور پھر ہر نوع کا نفع پہنچتا ہے۔ اس لئے آپ کا اپنی جان سے بھی زیادہ حق ہے اور آپ

کی اطاعت مطلقہ اور تعظیم بدرجہ کمال واجب ہے۔ (بیان القرآن۔ الاحزاب)

وہ تمام کام جو بندہ مومن اپنی جان کے لئے کرتا ہے مثلاً محبت، شفقت، راحت رسانی وغیرہ اس سے بڑھ کر آپ کے لئے کرے۔ نفس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے فائدے کی کوشش کرتا ہے۔ نقصان سے بچاتا ہے۔ اس سے محبت کرتا ہے۔ آرام پہنچاتا ہے۔ بلکہ انسان اپنی اولاد پر شفقت اور والدین سے محبت بھی ذاتی غرض کے لئے کرتا ہے۔ وہ غرض یہ ہے کہ انہیں تکلیف پہنچے یا راحت نہ ملے تو خود اس کو تنگی اور پریشانی ہوتی ہے۔ جب آپ ﷺ نفس سے پہلے ہیں تو چاہیے کہ بلاغرض یہ تمام کام آپ کے لئے بجالائے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں

اي هو احق بهم في كل امور الدين والدنيا واولى بهم من انفسهم فضلا عن ان يكون اولى بهم من غيرهم فيجب عليهم ان يؤثروه بما اراده من اموالهم وان كانوا محتاجين اليها ويجب عليهم ان يحبوه زيادة على حبهم انفسهم و يجب ان يقدموا حكمه عليهم على حكمهم لانفسهم وبالجملة فاذا دعاهم النبي صلى الله عليه وسلم لشيء ودعتهم انفسهم الى غيره وجب عليهم ان يقدموا ما دعاهم اليه ويؤخروا ما دعتهم انفسهم اليه ويجب عليهم ان يطيعوه فوق طاعتهم لانفسهم ويقدموا طاعته على ما تميل اليه انفسهم وتطلبه خواطرهم

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دینی و دنیاوی امور میں مومنین پر زیادہ حق رکھتے ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ مومنین کے لئے ان کے غیر سے اولیٰ ہوں اس لئے ان پر ضروری ہے کہ ضرورت مند ہونے کے باوجود اپنے مالوں پر ان کو ترجیح دیں اپنی جانوں سے زیادہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کریں اپنے نفس کے لئے اپنی سوچ پر آپ کے حکم کو مقدم رکھیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کسی چیز کی دعوت دیں اور نفس کسی دوسری طرف بلائے تو ان پر لازم ہے آپ کے بلاوے کو سامنے رکھیں اور نفس کے بلاوے کو پیچھے کر دیں اور ان پر یہ بھی لازم ہے کہ اپنے نفس کی اطاعت پر آپ کو فوقیت دیں۔ اور آپ کی فرماں برداری کو اپنے میلان نفس سے مقدم سمجھیں اور دلوں کی چاہت پر ترجیح دیں۔ (فتح القدیر۔ الاحزاب)

عموم رسالت

آدم علیہ السلام سے انسانیت کی ابتداء ہوئی۔ آپ پہلے انسان تھے اور پہلے ہی نبی بھی۔ آپ علیہ السلام سے سلسلہ نبوت شروع ہوا۔ اور محمد مصطفیٰ ﷺ پر ختم ہوا۔ درمیان میں انسان پھیلتے گئے۔ زمانہ بڑھتا گیا۔ پیغمبر آتے رہے اور اپنی اپنی نبوت کی جھب دکھا کر جاتے رہے۔ انسانیت گہوارے سے نکلی۔ بچپن کی حدود میں داخل ہوئی۔ بچپن پر لڑکپن کے سائے پڑے۔ لڑکپن پر شباب اترا۔ شباب ڈھلکا۔ کاروانِ انسانیت کہولت کی منزل میں داخل ہوا۔ جذبات و خواہشات پر عقل غالب ہوئی اور وقت آگیا کہ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی، حلقہ انبیاء کے صدر نشین اور خزانہ قدرت کے دُرِ یکتا محمد مصطفیٰ، احمد مجتبیٰ ﷺ مہر تاباں طلوع ہوا۔

اس دُلارے نبی کو اللہ نے کمالات باکمال عطا فرمائے۔ لاتعداد خوبیوں کے موتی نچھاور کیے۔ بے حساب گن دان کیے۔ بے شمار اعزازات بخشے۔ سینکڑوں خصائص سے نوازا۔ معرفت کے دروازے کھولے۔ بے کیف قرب خاص نصیب کیا۔ کونین کا مقصود بنایا۔ آپ کے مقدس وجود سے تصویر کائنات میں رنگ بھرے۔ اپنی یکتائی پر آپ کو گواہ بنایا۔ عموم رسالت بھی انہی خصوصیات میں سے ایک ہے۔

رسول الثقلین

پچھلا ہر نبی قوم کا نبی تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اقوام کے نبی ہیں۔ وہ کسی خاص امت کے نبی تھے۔ حضور علیہ السلام تمام امتوں کے نبی ہیں۔ وہ نبی الانس تھے۔ محمد ﷺ نبی الانس والجن اور رسول الثقلین ہیں۔ ان کی رسالتیں خاص تھیں۔ آپ کی رسالت عام ہے۔ ان کا دور مخصوص تھا۔ آپ کا دائرہ نبوت تمام زمانوں پر محیط ہے۔ وہ آسمان رشد و ہدایت کے چاند تارے تھے۔ آپ ﷺ فلک نبوت کے خورشید منور ہیں۔ آپ کی نبوت عام اور رسالت سب کے لئے ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں۔ آپ کونین کی ہر چیز کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے۔ بجی پر آپ کی رحمتوں کے سائے پڑے۔ شجر و حجر نے آپ کی رسالت کے گیت گائے۔ بحر و بر نے آپ کے لئے دیدہ و دل فرش راہ کئے۔ ارض و سما نے آپ کا استقبال کیا۔ شمس و قمر نے آپ کو سلامی دی۔ ملائکہ نے آپ کی تعظیم کی۔ جنات نے آپ کی تکریم کی۔ حیوانات آپ کے قدم بوس ہوئے۔ پہاڑ آپ کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوئے۔ پرندے آپ کے زمزمہ خواں ہوئے۔ پھولوں نے مسکرا کر آپ کو خوش آمدید کہا۔

کیوں نہ ہو جس کا وصف ذاتی ہو اسی کی خوبی عام اور تام ہوتی ہے۔ جیسے سورج کا نور چاند اور زمین کے لئے کافی ہے کیونکہ اس کی روشنی ذاتی ہے اور چاند کی روشنی اس سے مستعار۔ اسی طرح نبوت آپ کا ذاتی وصف ہے۔ ذاتی ان معنوں میں کہ اللہ نے آپ کو بلا واسطہ براہ راست نبوت عطا فرمائی اور باقی انبیاء کے لئے آپ کو واسطہ بنایا۔ عموم رسالت کا اعلان کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے رسول بنا کر بھیجا (سبا۔ ۲۸)

امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں

وما ارسلنك يا محمد الى هؤلاء	اے محمد ہم نے آپکو اس مشرک قوم
المشركين بالله خاصة ولكنا	کی طرف ہی نہیں بھیجا بلکہ تمام لوگوں
ارسلنك كافة للناس اجمعين	کی طرف مبعوث کیا ہے ان میں
العرب منهم والعجم والاحمر	عرب و عجم اور سرخ و سیاہ بھی شامل
والاسود	ہیں۔ (تفسیر طبری)

اور امام ابن کثیر نے فرمایا

الى جميع الخلق من المكلفين۔ آپکو ہر مکلف مخلوق کی طرف بھیجا گیا۔

انسان اور جن یہی دو مکلف گروہ ہیں۔ اس لئے آپ کو نبی الثقلین کہا جاتا ہے۔ آپ ﷺ سے پہلے جنات کی طرف کوئی نبی نہیں بھیجا گیا۔ سلیمان علیہ السلام شاہ جنات تھے۔ لیکن یہ داعی اور مدعو

کا نہیں بادشاہ اور رعایا کا تعلق تھا۔

آیت میں كَآفَّةً کا لفظ استعمال ہوا۔ مفسرین میں اس بات کا اختلاف ہے کہ کلام میں اس لفظ کی حیثیت کیا ہے۔ البتہ اس پر متفق ہیں کہ اس سے عموم اور احاطہ مراد ہے۔ آپکی رسالت بلا استثناء سب کے لئے ہے۔ ہر مکلف کو محیط ہے۔ خواہ منع کے معنی میں ہو خواہ جمع کے معنی میں۔

عمومی بعثت

کچھ مفسرین نے کلام کے انداز پر غور کیا۔ دوسری آیات کو سامنے رکھا اور لِلنَّاسِ سے انسان اور جن دو گروہ مراد لئے۔ جبکہ بعض مفسرین نے فرشتوں کو بھی شامل کیا۔ علامہ آلوسی سورۂ فرقان میں فرماتے ہیں جن و انس کی طرف آپ کا مبعوث ہونا ضروریات دین میں سے ہے۔ جس کا منکر مسلمان نہیں۔

وكذا الملائكة عليهم السلام كما رجحه	اور اسی طرح فرشتوں کی طرف بھی جیسا کہ محققین کی
جمع محققون كالسبكي ومن تبعه	جماعت مثلا سبکی اور ان کے متبعین نے اسے ترجیح
ورد على من خالف ذلك (فرقان۔ ۱)	دی اور جو اس کے مخالف ہیں ان کی تردید کی

ایک دوسری جگہ فرشتوں کی طرف عموم بعثت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وانت تعلم ان الاصح عموم البعثة	اور تم جانتے ہو گے یہی ہے کہ آپ کی بعثت
(روح المعانی۔ الذاریت۔ ۵۶)	سب کیلئے ہے۔

اور بعض مفسرین نے کلمہ الناس کے مادے پر غور کر کے فرمایا۔

فخصصك انت بالارسال الى كل	ہر قابل حرکت چیز کی طرف آپکو بھیجا آپ کی
من يمكن نوسه فالحصا سبحت	فضلیت ہے۔ پس کنکریوں نے آپ کے ہاتھ
في كفك والجبال امرت بالسير	پر تسبیح پڑھی۔ پہاڑوں کو آپ کے ساتھ سونا چاندی
معك ذهبا و فضة والحمرة شكت	بن کر چلنے کا حکم دیا گیا چڑیا نے اپنے بچے یا انڈے
اليك اخذ فراخها او بيضها والضب	لینے کی آپ سے شکایت کی۔ گوہ نے آپ کی
شهد لك والجمل شكا اليك و	شہادت دی۔ اونٹ نے آپ کو شکایت لگائی

سجد لك والاشجار اطاعتك و	اور سجدہ کیا، درختوں نے آپکی اطاعت کی اور
الاحجار سلمت عليك واثمرت	پتھروں نے آپ کو سلام کیا اور اس کے علاوہ ہر
بامرك الى غير ذالك من كل من	اس چیز نے آپکی فرماں برداری کی جو بالفعل
يوس بالفعل او القابلية	متحرک ہے یا اس کی قابلیت رکھتی ہے

(البقائی، سبل ۴۹)

دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا

قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ	تو کہہ اے لوگو میں تم سب کی طرف رسول ہوں
إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ	اللہ کا، آسمانوں اور زمین میں جس کی حکومت
السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ لَا إِلٰهَ إِلَّا	ہے اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں وہی جلاتا ہے
هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ فَآمِنُوا بِاللَّهِ	اور مارتا ہے سو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے بھیجے
وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي	ہوئے نبی پر جو کہ یقین رکھتا ہے اللہ پر اور اس
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ	کے سب کلاموں پر اور اسکی پیروی کرو تا کہ تم
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ	راہ پاؤ (الاعراف ـ ۱۵۸)

اس اعلان میں آپ ﷺ نے دو دعوے فرمائے۔

(۱) میں اللہ کا رسول ہوں (۲) میری رسالت سب کے لئے ہے۔

پھر دلائل کے ساتھ انہیں ثابت فرمایا۔ پہلے رسالت کی ضرورت اور اہمیت پر دلائل پر دیے۔ پھر فرمایا کہ میں اس اللہ کا رسول ہوں جس کے ہاتھ میں ارض و سما کی بادشاہت ہے۔ اس کے ضمن میں یہ بتا دیا ان کا وجود کسی صانع کے بغیر نہیں۔ یہ اس کے وجود و صفات کے گواہ ہیں۔ وہ صاحب حکمت ہے۔ اس نے یہ کارخانہ قدرت عبث نہیں بنایا۔ بندوں کو عقل دے کر فضول پیدا نہیں کیا۔ پورا انتظام اس کی دسترس میں ہے۔ اس خالق، مالک اور محسن کی اطاعت و بندگی بندوں پر واجب ہے۔ اختیارات و صفات چونکہ کسی پر تقسیم نہیں کیں لہذا وہ اکیلا ہی مستحق عبادت ہے۔ بعثت رسول کے سوا اس کی اطاعت و عبادت تک پہنچنا عقل کے لئے ممکن نہیں۔ طاعت و عصیان پر جزا سزا نہ ہو تو

رسول کا بھیجنا عبث ہے عقل اس کا تقاضا کرتی ہے اور اللہ اس پر قدرت رکھتا ہے۔ اس لئے فَآمِنُوا بِاللَّهِ پس تم اللہ پر ایمان لاؤ

مقصد تو تھا رسول پر ایمان کی دعوت دینا جس کے لئے کلام چلایا گیا لیکن اللہ پر ایمان چونکہ اصل ہے لہذا پہلے اس کا ذکر کیا۔

ان الایمان بالرسول انما هو	رسول کو ماننا اللہ پر ایمان لانے
لاجل الایمان بالله	کی وجہ سے ہی ہے۔ (ابن عاشور)

پھر فرمایا وَرَسُولِهِ۔ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ یہ بلاغت کا کمال ہے۔ کہنا یہ چاہیے تھا کہ

فامنوا بالله وبی۔	اللہ پر اور مجھ پر ایمان لاؤ۔

لیکن اس طرز پر کئی سوال اٹھ کھڑے ہوتے۔ یہاں صنعت التفات برت کر تکلم سے غیبت کی طرف رجوع کیا اور کلام خود ہی جواب بن گیا۔ اللہ پر ایمان کے ذکر میں اس کا ذاتی نام لیا کیونکہ

الایمان بالله الایمان باعظم	اللہ پر ایمان اس کی سب سے بڑی صفت
صفاته وهی الالهية	الوہیت پر ایمان لانا ہے۔ (ابن عاشور)

اللہ کا لفظ اس صفت پر دلالت کرتا ہے۔ جبکہ آپ کا ذاتی نام لینے کی بجائے صفات ذکر کیں کیونکہ

الایمان بالرسول الایمان باخص	رسول پر ایمان کا مطلب آپکی خاص صفت
صفاته وهو الرسالة	رسالت پر ایمان لانا ہے۔ (ابن عاشور)

جس رسول پر ایمان لانے کا ذکر ہے۔ اس کی صفات بیان کر کے مشخص کر دیا پہلی صفت النبی بیان کی وہ رسول انسان ہے۔ کیونکہ نبوت انسانوں کے ساتھ خاص ہے۔ دوسری صفت امی بیان کی۔ اس صفت نے آپ کے دونوں دعوے ثابت فرما دیے۔ روئے زمین پر امی نبی کا مصداق محمد کے سوا کوئی نہیں ہے نہ تھا نہ ہوگا ﷺ۔ سابقہ کتابوں میں جس عظیم الشان نبی پر ایمان لانے کی دعوت تمام پیغمبروں نے اپنی امتوں کو دی اس کی ایک صفت امی ہونا بیان کی گئی۔ امی نبی آپ ہی ہیں۔ یہی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ سب کی طرف اللہ کے رسول ہیں۔ امی ہونا آپ کا معجزہ ہے۔ کسی سے لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا لیکن عمر کا ایک حصہ گزارنے کے بعد ایسا کلام پیش کیا جس

نے اپنی مثل لانے سے سب کو عاجز کر دیا۔ یہ کلام اپنی سچائی آپکی سچائی اور آپ کے ہر دعوے کا گواہ اور دلیل ہے۔ پھر آپ کی شان بیان فرمائی۔

الَّذِیْ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَکَلِمٰتِہٖ

جس رسول پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ وہ خود سب سے پہلے اللہ پر اور اسکی باتوں پر ایمان رکھتا ہے۔ جس میں خود اس کی رسالت بھی شامل ہے۔ اس میں اشارہ فرمایا کہ وہ امی نبی زمانہ حال کا نبی ہے۔ ایک اور آیت میں ارشاد فرمایا۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا

بڑی برکت ہے اس کی جس نے اتاری فیصلہ کی کتاب اپنے بندے پر تا کہ رہے وہ جہان والوں کے لئے ڈرانے والا۔ (الفرقان۔۱)

تمام مفسرین کے نزدیک فرقان سے مراد قرآن مجید اور بندے سے مراد محمد مصطفیٰ ﷺ ہیں۔ العلمین عالم کی جمع ہے۔

عالمین کی مراد

ان العالم کل ما سوی اللہ تعالیٰ ویتناول جمیع المکلفین من الجن والانس والملائکۃ	بے شک اللہ کے سوا ہر چیز عالم ہے۔ جن وانس اور ملائکہ بھی اس میں داخل ہیں۔ (رازی)

البتہ امام رازی کے نزدیک مراد صرف جن اور انسان ہی ہیں۔ اور آپ کی رسالت انسانوں اور جنات کے لئے ہے۔ یہی رائے کئی مفسرین کی ہے۔ لیکن کئی مفسرین مثلاً علامہ آلوسی، بقاعی، ابن عجیبہ وغیرہ فرماتے ہیں آپ کی رسالت ہر چیز کے لئے عام ہے۔ یہاں تک کے آپ ﷺ حیوانات اور جمادات کے نبی اور ان سب کے لئے بھی رسول ہیں۔

جن وانس چونکہ احکام کے مکلف ہیں۔ اس لئے ان کے ساتھ آپ کا تعلق داعی اور مدعو کا ہے۔ باقی مخلوق آپ کی رسالت کا اقرار کرے تو یہ آپ کا شرف ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

وفائدۃ الارسال للمعصوم وغیر المکلف طلب اذعانھما لشرفہ علیہ الصلاۃ والسلام ودخولھما تحت دعوتہ واتباعہ تشریفا علی سائر المرسلین علیھم السلام	معصوم اور غیر مکلف کی طرف بھیجنے کا فائدہ یہ ہے کہ یہ آپ کی بزرگی کو تسلیم کریں۔ ان کا آپ کی دعوت کے تحت ہونا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی فرماں برداری پر مامور ہونا تمام رسولوں پر آپ کی بزرگی اور فضیلت ہے۔ (الفرقان۔۱)

ابن عجیبہ اس کی مراد واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

امرت بطاعتہ فیما یامرھا بہ و بتعظیمہ علیہ الصلاۃ والسلام وھذا کلہ داخل فی العلمین	انہیں حکم دیا گیا آپ کے حکم مانیں اور آپ علیہ الصلاۃ والسلام کی تعظیم کریں۔ یہ سب عالمین میں داخل ہیں۔

ختم نبوت کی دلیل

اس سے معلوم ہوا۔ آپ کی نبوت و رسالت عالمگیر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم منتہائے کمال رسالت ہیں۔ نبوت کے تمام مرتبے آپ پر ختم ہو گئے۔ عموم رسالت اس خاتمیت مرتبی کی کھلی دلیل ہے۔

ان لفظ العلمین یتناول جمیع المخلوقات فدلت الآیۃ علی انہ رسول للخلق الی یوم القیامۃ فوجب ان یکون خاتم الانبیاء والرسل (الفرقان۔۱)	عالمین کا لفظ تمام مخلوقات کو شامل ہے اور یہ آیت دلیل ہے کہ آپ ﷺ قیامت تک تمام مخلوق کے لئے رسول ہیں پس ضروری ہے آپ ﷺ ہی خاتم النبیین ہوں۔

دنیا میں بھی آپ کی قیادت و سیادت سب کے لئے ہے۔ روز قیامت بھی آپ ﷺ ہی سب کے قائد، امام اور سردار ہوں گے۔

آپ نے ارشاد فرمایا

انا اول الناس خروجا اذا بعثوا	لوگوں میں سب سے پہلے مجھے اٹھایا جائے گا۔

وانا قائدھم اذا وفدوا۔	محشر میں پیشی کے وقت میں ہی ان کا قائد ہوں گا۔
وانا خطیبھم اذا انصتوا۔	وہ خاموش ہوں گے اور میں ہی ان کا خطیب ہوں گا۔
وانا مستشفعھم اذا حبسوا۔	وہ پھنسیں گے اور میں ان کی سفارش کروں گا۔
وانا مبشر ھم اذا یئسوا۔	وہ مایوس ہوں گے اور میں انہیں خوشخبری دوں گا۔
لواء الحمد یومئذ بیدی۔	حمد کا جھنڈا اس روز میرے ہاتھ میں ہوگا۔
وانا اکرم ولد ادم علی ربی	اپنے رب کے ہاں اولادِ آدم میں سب سے مکرم ہوں۔
ولا فخر۔	اور اس پر فخر نہیں کرتا (ترمذی فی فضل النبی ﷺ)

خاتم النبین

حضور ﷺ آخری نبی ہیں۔ یہ آپ ﷺ کا وہ اعزاز ہے جس میں آپ علیہ الصلاۃ والسلام لاشریک ہیں۔ آپ کی فضلیت کے لئے یہی کافی ہے لیکن کمال بر کمال یہاں تو خوبیوں کا وہ سلسلہ ہے جس کی انتہا تک پہنچنا کسی بشر کی طاقت نہیں۔ جنت کی مٹی سے آپ کا خمیر گوندھا گیا۔ اس مبارک وجود میں کمالات پھول میں خوشبو کی مانند بسائے گئے۔ آپ کے کمالات بہار کے بادل ہیں۔ جن سے خوبیوں کے موتی جھڑتے ہیں۔ ٹھاٹیں ٹھاٹیں مارتا سمندر ہیں۔ اوصاف اس محل کی طرح ہیں جس کا ہر حصہ دوسرے سے اعلیٰ ہو۔ اخلاق اس کتاب جیسے ہیں جسکا ہر مضمون دوسرے سے بہتر ہو۔ فضائل کی مثال اس باغ جیسی ہے جس کا ہر پھول دوسرے سے بڑھ کر خوشبودار ہو۔ عادات اس حسین وادی کی مثل ہیں جسکا ہر منظر دوسرے سے سہانا ہو۔

ارشاد فرمایا

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ	محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ
وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ	نہیں اور لیکن اللہ کے رسول اور نبیوں کی مہر ہیں۔
وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا۔	اور اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ (الاحزاب ۴۰)

اس آیت میں آپ کے کئی فضائل بیان کئے گئے۔

(۱) سچا کلام

جو کلام آپ صلی اللہ علیہ وسلم پیش فرما رہے ہیں وہ سچا ہے۔ واقع کے عین مطابق ہے۔ ارشاد فرمایا۔ محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ آپ کے لے پالک بیٹے حضرت زید بن حارثہ تھے۔ اس سورت کے شروع میں ان کے بیٹے ہونے کی نفی کی اور فرمایا۔

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ	اور تمہارے لے پالکوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا۔

ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ   یہ تمہاری بنائی ہوئی بات ہے۔

اور اسکے بعد ہے

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ   انہیں ان کے اصل باپوں کے ناموں سے پکارو۔

نزول آیت کے وقت آپ کی بیٹی حضرت فاطمہ موجود تھیں۔ قرآن یوں کہتا ابا احدمنکم تم میں سے کسی کے باپ نہیں تو کلام واقع کے مطابق نہ ہوتا کیوں کہ بیٹی موجود تھیں۔ رجالکم کہہ کر بتادیا مردوں کی نفی ہے عورتوں کی نہیں۔ اور اس وقت آپ کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی۔

یہ آیت ۵ ہجری میں نازل ہوئی۔ اس سے پہلے آپ کے تین بیٹے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اگرچہ ان کا انتقال ہو چکا تھا لیکن وہ آپ کی اولاد تو تھے اور اللہ جانتا تھا اس آیت کے بعد بھی آپ کا ایک بیٹا پیدا ہوگا۔ اس لئے اَبَا اَحَدٍ مِّنْكُمْ (تم میں سے کسی کے باپ نہیں) کہنے کی بجائے رجال کا لفظ اضافہ کیا اور فرمایا

اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ   مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔

یعنی نرینہ اولاد تو ہوئی لیکن مردوں کی حد تک کوئی نہ پہنچا۔ حضرت ابراہیم کی ولادت پیش نظر ہو تو یہ اس بات کی پیشین گوئی بھی ہے کہ حضرت ابراہیم بچپن ہی میں دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ ذوالحجہ ۸ ہجری میں پیدا ہوئے۔ رجل یعنی مرد کی حد تک پہنچنے سے پہلے ہی آپ کا انتقال ہو گیا۔ لان الرجل الذکر البالغ کیوں کہ رجل بالغ مرد کو کہتے ہیں۔

(۲) روحانی والد

آیت میں اشارہ ہے۔ آپ ﷺ امت کے روحانی باپ ہیں۔ اس کی تفصیل یہ ہے پہلے فرمایا محمد ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ پھر فرمایا۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ   لیکن اللہ کے رسول ہیں۔

لکن (لیکن) استدراک کا کلمہ ہے۔ پچھلے کلام میں ہونے والا شبہ دور کرتا ہے۔ نسل مردوں سے چلتی ہے۔ آپ کے بیٹوں کی نفی کی تو شبہ ہوا کہیں آپ ﷺ مقطوع النسل نہ ہوں۔ یہ شبہ دور کرنے کے لئے رسول اللہ کا لفظ زیادہ استعمال کیا۔ یعنی آپ ﷺ مردوں میں سے کسی کے باپ

نہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں۔ ہر نبی امت کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ آپ کی حقیقی نرینہ اولاد نہیں تو کیا ہوا پوری امت آپ کی روحانی اولاد ہے۔ پھر آپ صرف رسول ہی نہیں خاتم النبیین بھی ہیں۔ پہلے زمانے میں جب دوسرا نبی آجاتا تو پہلے نبی کی امت ختم ہو جاتی اور دوسرے نبی کی امت شروع ہو جاتی۔ جب آپ کے بعد کسی بھی نبی کا آنا ممکنات میں سے ہے تو قیامت تک آپکی امت ہی ہوگی۔ آپ کی یہ روحانی اولاد اتنی ہے جس کا شمار ممکن نہیں۔ اولاد سے جو چیز مقصود ہوتی ہے وہ امت کے ذریعے کئی درجے زیادہ آپ کو حاصل ہے۔ مفسر البقاعی اسی کے ضمن میں فرماتے ہیں

فبینکم وبین رسوله من جهة   پس تمہارے اور رسول کے درمیان مطلق رسالت
مطلق الرسالة ابوة وبنوة مجازية   کے رخ سے باپ بیٹے کی مجازی نسبت ہے۔

نرینہ اولاد باقی نہ رکھنے کی حکمت

ایک سوال پھر بھی رہتا ہے۔ نرینہ اولاد حد بلوغ تک پہنچنے سے پہلے اٹھا لینے میں کیا حکمت ہے۔ اس کیلئے لفظ خاتم النبیین کا اضافہ کیا۔ محمد مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ تفسیر البقاعی میں ہے۔

ولو قضی ان یکون بعده نبی لما	اگر آپ کے بعد نبوت جاری رکھنے کا فیصلہ ہوتا تو
کان الا من نسله اکراما له لانه	آپ کے اکرام میں وہ نبی آپ کی نسل میں سے ہوتا
اعلی النبیین رتبة واعظم شرفا	کیونکہ رتبہ میں تمام نبیوں سے اعلی اور شرف میں سب
ولیس لاحد من الانبیاء کرامة الا	سے بڑھ کر ہیں۔ کسی نبی کو جو بزرگی ملی آپ کو وہ یا اس
وله مثلها او اعظم منها ولو صار	سے بڑھ کر بزرگی ملی۔ اگر آپ کا کوئی بیٹا ہوتا تو آپ کی
احد من ولده رجلا لکان نبیا	نبوت کے بعد وہ بھی نبی ہوتا۔ اور اللہ نے آپ کی
بعد ظهور نبوته وقد قضی الله	خاطر یہ فیصلہ کر دیا کہ آپ کے بعد کوئی نبی نہ
الا یکون بعده نبی اکراما له	ہو۔ (الاحزاب۔۴۰)

چنانچہ حضرت ابراہیم کے بارے میں آپ ﷺ نے خود فرمایا

لو عاش لكان صديقا نبيا۔ اگر زندہ رہتا تو سچا نبی ہوتا

مفسر حقی فرماتے ہیں

كل رسول الله ابو امته لكن	ہر رسول امت کا باپ ہوتا ہے۔ حقیقی نہیں
لا حقيقة بل بمعنى انه شفيق	بلکہ اس معنی میں کہ امت کے لئے شفیق،
ناصح لهم وسبب لحياتهم	نصیحت کرنے والا اور ان کی ابدی حیات کا
الابدية واجب التوقير و	سبب ہوتا ہے اس کی توقیر اور اطاعت
الطاعة له	واجب ہوتی ہے۔ (الاحزاب۔ ۴۰)

(۳) خاتم کا لفظ کیوں استعمال کیا

آپ کے مقدس سر پر نبوت کا تاج رکھا۔ یہ شان آپ کے تمام کمالات کو محیط ہوگئی۔ خاتم کی دو قرائتیں ہیں

(ا) خاتم وهو الة الختم بمعنى ما يختم به خاتم مہر لگانے کے اوزار یعنی مہر کو کہتے ہیں۔

(ب) خاتم اى كان خاتمهم اى فاعل الختم مہر لگانے والے کو کہتے ہیں۔

یعنی حضور ﷺ مہر کرنے والے ہیں۔ دونوں کا نتیجہ ایک ہی ہے۔ مہر چونکہ آخر میں لگائی جاتی ہے۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں۔ آخری نبی ہونے کا ظاہری مطلب یہی ہے کہ آپ ﷺ تمام نبیوں کے بعد تشریف لائے۔ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ یہ خاتمیت زمانی ہے۔ آپ ﷺ زمانہ کے لحاظ سے آخری نبی ہیں۔ یہ امت کا متوارث اور اجماعی عقیدہ ہے۔

لیکن ایک بات قابل غور ہے۔ آخری نبی ہونے کا یہی مطلب ہوتا تو اس کیلئے آخر کا لفظ زیادہ مناسب تھا۔ جو قرآن میں استعمال بھی ہوا اور اپنے مدلول میں صریح بھی ہے۔ یہ واضح لفظ چھوڑ کر خاتم کا لفظ کیوں استعمال کیا گیا؟

وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید آپ کی شان کے لئے چنیدہ الفاظ استعمال کرتا ہے۔ ہر لفظ کی کہاں قسمت کہ آپ کی شان میں استعمال ہو جائے۔ یہ لفظ لفظوں میں انتخاب ہوتے ہیں۔ ان میں معانی کے سمندر موجزن ہوتے ہیں۔ یہ رعایا میں بادشاہ اور تاج میں موتی کی حیثیت رکھتے

ہیں۔ سلیقے سے انہیں سے برتا جاتا ہے۔ مروارید کی طرح جملوں کی سلک میں پرو دیا جاتا ہے۔ خاتم انہی مختار الفاظ میں سے ایک ہے۔ اس سے آپ کی کئی شانیں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ بنیاد معلوم ہوتی ہے جو آپ کے آخر میں ظہور کا سبب بنی۔ ورنہ خارجی سبب کے بغیر تقدیم و تاخیر اور اول آخر میں کوئی ذاتی فضیلت نہیں۔

(۱) فاتح النبوت

خاتم کا لفظ استعمال کرنے سے معلوم ہوتا ہے محمد مصطفیٰ ﷺ فاتح النبوت ہیں۔ نبوت کی ابتدا حضور ﷺ سے ہوئی اور آپ ﷺ ہی کو سب سے پہلے شرف نبوت سے نوازا گیا۔ وجہ یہ کہ حضور ﷺ خاتم ہیں۔ مہر تصدیق کے لئے ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ہی کی تصدیق سے انبیاء کو نبوت ملی۔ اس معنی میں حضور ﷺ تمام انبیاء کے مصدق ہیں۔ آپکا مصدق کوئی نہیں۔ اور معلوم ہے کہ اس مصدق کے لئے مصدق سے افضل ہونا ضروری ہے۔ وہ فضیلت یہی ہے کہ آپ کو سب سے پہلے بلا واسطہ شرف نبوت عطا ہوا۔ یہ خاتمیت ذاتی ہے۔ تفسیر کاندھلوی میں ہے۔

عارف رومی مثنوی میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ جس طرح آپ کمالات نبوت کے خاتم ہیں اسی طرح آپ کمالات نبوت کے فاتح اور مبداء بھی ہیں۔

قفلہائے ناکشادہ ماندہ بود　　از کف انا فتحنا بر کشود

یعنی انبیاء سابقین جو علوم اور معارف کے قفل بے کھلے چھوڑ گئے تھے وہ صاحب انا فتحنا کے مبارک ہاتھوں سے کھل گئے ۔۔۔۔۔۔ غرض یہ کہ عارف رومی کے نزدیک حضور پر نور فاتح النبیین بھی ہیں اور خاتم النبیین بھی ہیں۔ (معارف القرآن۔ الاحزاب۔ ۳۶)

(۲) منتہائے کمال نبوت

آپ ﷺ منتہائے کمال نبوت ہیں۔ نبوت کے جس ممکن کمال کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ وہ آپ کو حاصل ہے۔ کیونکہ مہر مضمون کے پورا ہونے پر لگائی جاتی ہے۔ امام راغب مفردات میں فرماتے ہیں۔

تممها بمجيئه اپنی تشریف آوری سے آپ ﷺ نے اس کی تکمیل فرما دی۔

تفسیر البقاعی میں ختم نبوت کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

وذالک لان فائدۃ اتیان النبی تتمیم شئی لم یات بہ من قبلہ وقد حصل بہ صلی اللہ علیہ وسلم التمام فلم یبق بعد ذالک مرام بعث لاتمم مکارم الاخلاق	اور اتمام نبوت اس لئے کہ نبی بھیجنے کا مقصد پہلے کمال کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سب کمال پورے ہو گئے۔ اس کے بعد نبی بھیجنے کا کوئی مقصد نہ رہا۔ فرمایا میں عمدہ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ (الاحزاب۔۴۰)

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے محل کی مثال دے کر بات سمجھائی۔ اس میں ایک اینٹ کی جگہ خالی تھی آپکی تشریف آوری سے وہ جگہ پر ہو گئی۔ اور محل میں وہ کمی پوری ہو گئی۔

مولانا ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں

آپ نبوت و رسالت میں سب سے افضل و اکمل ہیں یعنی کمالات نبوت کے خاتم ہیں آپ پر نبوت کے تمام کمالات ختم ہو گئے۔ (معارف۔ کاندھلوی۔)

خاتمیت مرتبی

مولانا قاسم نانوتوی کی اصطلاح میں اس کا مقام کا نام خاتمیت مرتبی ہے۔ نبوت کے تمام مرتبے آپ پر ختم ہو گئے۔ خاتمیت ذاتی کے لئے خاتمیت مرتبی لازمی ہے۔ کیونکہ جو وصف کسی کا ذاتی ہو اس کا کمال اس پر ختم ہو جاتا ہے۔ جیسے روشنیوں کا سلسلہ سورج پر ختم ہو جاتا ہے۔

خاتمیت ذاتی کا مطلب ہوا آپ کو بلاواسطہ نبوت ملی۔ خاتمیت مرتبی کا مطلب ہے نبوت کے تمام درجات آپ نے حاصل کر لیے۔ خاتمیت زمانی کی مراد ہے آپ ﷺ تمام نبیوں کے بعد تشریف لائے۔ آیت میں خاتمیت مرتبی اور زمانی دونوں ہی مراد ہیں۔ اگر عموم مشترک مانع ہو اور ایک ہی خاتمیت مراد ہو تو وہ خاتمیت مرتبی ہو گی۔ کیونکہ یہی آپ کی شان کے زیادہ مناسب ہے۔ اس صورت میں خاتمیت زمانی اس کا تقاضا ہو گی۔

معلوم ہوا خاتمیت مرتبی وہ حقیقی بنیاد ہے جس کی وجہ سے آپ کو سب کے آخر میں بھیجا گیا۔

حضور ﷺ مرتبہ نبوت کی انتہا تک پہنچے اور تمام درجات کو آپ نے حاصل کر لیا۔ آپ کی نبوت ہر لحاظ سے اکمل اور اتم ہے۔ اگر آپ نبیوں سے پہلے یا درمیان میں تشریف لاتے تو کسی نبی کی

نبوت چلتی نہ کوئی نبی بھیجا جاتا۔ وجہ البقاعی کے حوالے سے گزر چکی ہے۔ اس صورت میں آپ کے کمالات مخفی رہ جاتے۔ ہر چیز میں تدریجی ارتقاء کی حکمت پوری نہ ہوتی۔ اصول ہے کہ بعد کا دین پہلے دین سے زیادہ کامل ہوتا ہے۔ کئی نئی باتیں شامل ہوتی ہیں۔ بہت سے گزشتہ احکام منسوخ ہو جاتے ہیں۔ بعد کا دین آپ کے دین سے زیادہ کامل ہوتا تو وہ ناسخ ہوتا اور لازم آتا کہ آپ کا دین اس کے مقابلے میں ناقص ہے۔ قرآن کا دعوی

تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ۔ اس میں ہر چیز کا بیان ہے

غلط ہوتا۔ اگر آپ کا دین اکمل ہوتا تو ادنی دین سے اعلی دین منسوخ کرنا لازم آتا حالانکہ اللہ نے (البقرہ ۱۰۶ میں) فرمایا۔

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا	جو آیت ہم منسوخ کرتے یا بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر (کا حکم) بھیج دیتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ نے واضح فرما دیا ناسخ درجے میں منسوخ سے ادنی نہیں ہو سکتا۔ اس سے اعلی یا کم از کم اس کے برابر کا ہو گا۔ اگر نسخ نہ ہوتا یا دونوں ایک جیسے ہوتے تو نئے دین یا نبی کی ضرورت ہی کیا تھی؟ خاتمیت مرتبی کی وجہ سے ہی آپ کا زمانہ تمام نبیوں کے بعد رکھا گیا۔

(۳) اخر النبیین

حضور ﷺ ہی باب نبوت بند کرنے والے ہیں۔ آپ کے بعد کسی نبی کا آنا محال ہے۔ کیونکہ مہر آخر میں لگائی جاتی ہے۔ ابن عجیبہ فرماتے ہیں

کما یختم علی الکتاب لئلا یلحقہ شئی فلا نبی بعدہ	جیسے خط پر مہر کی جاتی ہے۔ تاکہ کوئی چیز اس سے ملحق نہ ہو سکے۔ پس آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ (الاحزاب۔۴۰)

مہر کے بعد ہر مضمون غیر مصدق اور الحاق ہوتا ہے۔ آپکے بعد ہر ایک کا دعوائے نبوت باطل ہے۔ غیر مصدق اور الحاق ہے۔ اس کا دعوے دار پرلے درجے کا جھوٹا، دجال اور واجب القتل ہے۔

خدا کی شان اور اللہ کا امر۔ باب نبوت حضور ﷺ سے وا ہوا۔ اس کی بندش بھی آپ ﷺ ہی سے

عمل میں آئی۔ نبوت کے اس دروازے کا تالا بھی محمد اور چابی بھی محمد۔ قفل بھی آپ اور کلید بھی آپ ہی ہیں۔ عالم امر میں اجرائے نبوت بھی آپ کے دست مبارک سے ہوا اور عالم شہادت میں اسے بند کرنے کو بھی آپ ہی تشریف لائے ﷺ۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے رسول اور نبی بھیجنے سے اللہ کا جو مقصد تھا وہ آپ کے ذریعے بتمام وکمال پورا ہو گیا۔ آپ کا وہ سورج چمکا اور وہ چراغ جلا جس کے بعد کسی سورج کی ضرورت رہی نہ کسی چراغ کی حاجت۔

مفسر ابن عاشور (الاحزاب۔۴۵ میں) فرماتے ہیں۔

وبوصف كونه خاتم الشرائع ومتمم المراد الله من بعثة الرسل	اس وصف (شہادت) کے ساتھ آپ شریعتوں کے خاتم اور رسولوں کی بعثت سے اللہ کی مراد پوری کرنے والے ہیں۔

(٤) اشفق على الامة۔

آپ کی رحمت شفقتوں سے لبریز ہے۔ یوں تو ہر نبی اپنی امت پر مہربان اور شفیق ہوتا ہے لیکن آپ کی شان کیا کہیے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام تمام انبیاء سے زیادہ اپنی امت پر مہربان اور شفیق ہیں۔ یہ بے پناہ شفقت ختم نبوت کا تقاضا ہے۔ پہلی امتوں میں انبیاء کی آمد مسلسل تھی۔ ایک کے بعد دوسرا نبی آتا اور امت میں پیدا شدہ بگاڑ کی اصلاح کر دیتا۔ آپ کے بعد یہ دروازہ تا ابد بند ہو چکا ہے۔ لہذا منطقی بات ہے آپ کو امت کے حالات کی دوسرے انبیاء سے زیادہ فکر ہو گی۔

مفتی شفیع صاحب فرماتے ہیں

صفت خاتم النبیین نے یہ بھی بتا دیا کہ آپ کی شفقت اپنی اولاد روحانی یعنی پوری امت پر دوسرے انبیاء سے زائد ہو گی۔ کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی اور کوئی وحی دنیا میں آنے والی نہیں۔ (معارف القرآن۔ الاحزاب۔۴۰)

تفسیر حقی میں ہے۔

وخاتم النبين يفيد زيادة الشفقة من جانبه والتعظيم من جهتهم لان النبى الذى بعده نبى يجوز ان	اور خاتم النبیین آپکی جانب سے شفقت میں زیادتی اور امت کی جانب سے تعظیم کا فائدہ دیتا ہے جس نبی کے بعد کوئی نبی ہو اس کے لئے نصیحت

يترك شيئا من النصيحة والبيان لانها مستدركة من بعده واما من لا نبى بعده يكون اشفق على امته واهدى بهم من كل الوجوه	وبیان میں کچھ چھوڑنا جائز ہے۔ کیونکہ اس کے بعد اسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ اور جس کے بعد کوئی نبی نہ ہو۔ وہ اپنی امت پر زیادہ شفیق ہو گا اور ہر لحاظ سے ان کی راہنمائی کرے گا۔ (الاحزاب۔۴۰)

شفقت کا مطلب

شفقت نام ہے۔

حرص الناصح على صلاح المنصوح

جسے نصیحت کی جا رہی ہے اس کی بہتری پر ناصح کی حرص کا۔ (القاموس الجدید)

شفقت میں حرص کے ساتھ خوف اور ڈر بھی ہوتا ہے۔ ڈر اپنی ذات کیلئے نہیں منصوح کیلئے ہوتا ہے۔ الشفقة الخيفة شفقت خوف ہی ہے۔ اشفق عليه حذر ان يناله مكروه کسی پر شفیق ہونے کا معنی ہے اسے ناگوار بات پہنچنے کا ڈر رکھنا۔ منصوح کا غم کھانا اسے نقصان سے بچانا رحمت کی شدت اور شفقت ہے۔ گویا آپ کی مومنوں پر رافت وشفقت ختم نبوت کی وجہ سے ہے۔ آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ اسی لئے رؤف اور رحیم ہیں۔ بر بنائے شفقت آپ لوگوں کے عدم ایمان پر کڑھتے، بے چین اور بے قرار ہو جاتے۔ قرآن کہتا ہے

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ

شاید تو گھونٹ ڈالے اپنی جان اس بات پر کہ وہ یقین نہیں کرتے۔ (عثمانی)

فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ

سو تیری جان نہ جاتی رہے ان پر پچھتا پچھتا کر (عثمانی)

جو ایمان نہ لائے وہ گویا غیر ہیں۔ ان پر اتنی شفقت ہے تو اپنوں پر کتنی زیادہ ہو گی؟! انتہائی شفقت کی وجہ سے آپ نے امت کا بگاڑ بیان کیا۔ اسباب بتائے، سد باب کی ہدایات دیں۔ فتنوں کی نشاندہی کی۔ نمٹنے کے طریقے ارشاد فرمائے اور راہ حق آفتاب نیم روز سے زیادہ روشن کر دیا۔ اسی وجہ سے سوالات کی ممانعت ہوئی۔ فرمایا

لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَاءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ

مت پوچھو ایسی باتیں کہ اگر تم پر کھولی جائیں تو تم کو بری لگیں۔ (الانعام)

اسی وجہ سے آسان دین ملا۔ ہر بات میں امت کی سہولت اور آسانی سامنے رکھی۔ فرمایا بشارات سناؤ متنفر نہ کرو۔ آسانی کرو تنگی نہ کرو۔ حج کی بابت ایک صحابی نے سوال کیا آپ نے فوری جواب نہ دیا۔ کہیں ہر سال حج فرض نہ ہو جائے۔ تراویح تین دن سے زیادہ نہ پڑھیں کہیں فرض نہ ہو جائیں۔ امت پر دشواری کے خیال سے ہر نماز کے لئے مسواک فرض نہ کی۔ اسی وجہ سے راتوں کو امت کے لئے گڑگڑاتے۔ ابن کثیر میں بروایت حضرت ابوذر نقل ہے آپ نے فرمایا

ما بقی شئی یقرب من الجنة ویباعد من النار الا وقد بین لکم

جنت کے قریب اور دوزخ سے دور کرنے والی ایسی کوئی چیز نہیں جسے تمھارے لئے بیان نہ کیا ہو (توبہ۔۱۲۸)

(۵) دین کامل :

خاتمیت مرتبی کمال دین کی دلیل بھی ہے۔ خاتمیت مرتبی کا تقاضا ہے کہ دین ہر لحاظ سے کامل اور مکمل ہو۔ خاتمیت مرتبی اتمام نبوت اور منتہائے علم کا نام ہے۔ یہ علم نبوت ہی دین ہے۔ لہذا آپ کا دین ہر لحاظ سے کامل ہے۔ مکلف کے تمام احوال کو جامع ہے۔ ہر زمانے میں انسانی معاشروں کی تمام ضروریات کے لئے کافی ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں

انبیائے سابقین کے دین بھی اپنے اپنے وقت کے لحاظ سے مکمل تھے۔ کوئی ناقص نہ تھا لیکن کمال مطلق اسی دین مصطفوی کو حاصل ہوا۔ جو اولین اور آخرین کے لئے حجت اور قیامت تک چلنے والا دین ہے۔ (معارف القرآن۔ الاحزاب۔۴۰)

(۶) قران کی انفرادیت :

مطالب ادا کرنے کے لئے قرآن منفرد الفاظ لاتا ہے اور نادر اسلوب اختیار کرتا ہے۔ الفاظ کی صناعت اور اسلوب کی بداعت قرآن کا معجزہ ہے۔ ابتدا کلام میں حقیقی باپ ہونے کی نفی کی۔ روحانی ابوت ثابت کرنے کے لئے رسول اللہ کا لفظ استعمال کیا۔ اس لفظ میں حضور ﷺ کی تین

شانیں بیان ہوگئیں۔

رسالت :۔ آپ اللہ کے رسول ہیں ﷺ۔

نبوت :۔ اللہ کے نبی ہیں کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے۔

ابوت :۔ امت کے باپ ہیں۔ کیونکہ ہر نبی امت کے ساتھ یہ تعلق رکھتا ہے۔

رسول اللہ کہنے کی بجائے نبی اللہ کہا جاتا تو رسالت رہ جاتی کیونکہ ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔ اگلے مرکب میں خاتم النبین کہا۔ خاتم المرسلین یا خاتم الرسل نہیں فرمایا وجہ یہی ہے کہ ہر رسول نبی ہوتا ہے۔ نبیوں کے خاتم ہونے سے رسالت خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ خاتم النبین کہنے سے نبوت اور رسالت دونوں کی خاتمیت بیان ہوگئی۔ خاتم الرسل کہنے سے شبہ ہوتا رسالت ختم ہوئی نبوت باقی ہے۔ کیونکہ ہر نبی رسول نہیں ہوتا۔

العبد المطلق

ہر چیز اپنے جاے میں حسین لگتی ہے۔ بندے کو بندہ ہی رہنا چاہیے۔ خدا کو بندوں کی سطح پر اتارنا حماقت اور بندے کا خدا بننا اپنی ذات پر ظلم ہے۔ بندگی اور خدائی کی حدود ہیں جن کا پاس رکھنا ضروری ہے۔ بندگی کرنے والے کو عربی میں عبد کہتے ہیں۔

والعبد اسم لمملوك من جنس العقلاء۔

جن وانس اور ملائکہ میں جو مملوک ہوں ان کا نام عبد ہے۔ (المنجد۔ البقرہ۔۲۳)

جو دوسرے کی ملکیت میں ہو وہ مملوک ہے۔ کوئی چیز جس کی اپنی نہ ہو۔ ہر مخلوق کا یہی حال ہے۔ لیکن عبد کی نسبت انہی تینوں کی طرف ہوتی ہے۔ ارشاد باری ہے۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	آسمان اور زمین میں کوئی ایسا نہیں جو
اِلَّا اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا	رحمٰن کا بندہ بن کر نہ آئے۔ (مریم۔۹۳)

اس کی تفسیر میں علامہ الوسی فرماتے ہیں

ای ما منهم احد من الملائکة والثقلین

یعنی فرشتوں، انسانوں اور جنات میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں (الوسی)

انسان کی اعلیٰ خوبی

انسان کا اللہ سے عبد اور معبود، بندے اور خدا کا رشتہ ہے۔ اللہ کا بندہ بن کر رہنا کمال انسانیت ہے۔ اس کی بندگی کرنا عقل اور شریعت کی رو سے لازم ہے۔ علامہ الوسی فرماتے ہیں

والعبودية على ما نص عليه العار	عارفین نے قطعیت سے کہا ہے۔ بندگی انسان
فون اشرف الاوصاف واعلى	کی خوبیوں میں اشرف اور مرتبوں میں اعلیٰ مرتبہ
المراتب وبها يفتخر المحبون	ہے۔ محبت کرنے والے اس پر فخر کرتے ہیں۔

دل ونظر کو اللہ کے حضور جھکانا ہی انسانیت کی معراج ہے۔ یہی مقصد وجود اور حاصل زندگی ہے۔ انسان کا اس سے بڑا شرف اور کوئی نہیں۔ اللہ کے سامنے پستی ہی اسے بلندی سے ہمکنار کرتی ہے۔ اس کی بندگی سے منہ پھیرنا احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے۔ انسانیت کا ننگ اور بخت کی تیرگی ہے۔ بندگی رسول کے لئے اس کی رسالت سے بھی افضل اور اونچا مقام ہے۔

واقعہ معراج میں عبد کا لفظ لایا گیا۔ تفسیر حقی میں ہے

وفيه اشارة الى شرف المقام العبودية	اس میں بندگی کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے یہاں
حتى قال الامام فى تفسيره ان	تک کہ امام نے اپنی تفسیر میں فرمایا بندگی رسالت
العبودية افضل من الرسالة لان	سے افضل ہے۔ کیونکہ بندگی کا مطلب ہے مخلوق
بالعبودية ينصرف من الخلق الى	سے اللہ کی طرف پھرنا یہ جمع کا مقام ہے اور رسالت
الحق فهى مقام الجمع وبالرسالة	میں رسول اللہ سے مخلوق کی طرف لوٹتا ہے۔ یہ جدائی کا
ينصرف من الحق الى الخلق فهى	مقام ہے۔ بندگی یہ ہے کہ اپنی باگ آقا کے ہاتھ
مقام الفرق والعبودية ان يكل اموره	میں دیدے۔ پس وہ اس کے کاموں کی درستگی میں
الى سيده فيكون هو المتكفل	اس کی کفالت کرتا ہے۔ اور رسالت امور امت کی
باصلاح مهامه والرسالة التكفل	کفالت کرتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان بڑا فرق
بمهام الامة وشتان ما بينهما	ہے (بنی اسرائیل۔۱)

مراتب عبدیت

غلام جی جان سے مالک کی خدمت کرے۔ یہ اس کا فرض ہے۔ اس کو بڑا سمجھنا بندگی کا کھوٹ ہے۔ اس پر صلے کی تمنا رکھنا بندگی کا ادنیٰ درجہ ہے۔ ستائش کی پرواہ کے بغیر جان تک ہار دینا کمال بندگی ہے۔ لیکن اس کے اور بھی مراتب ہیں۔ تحدیث نعمت کے طور پر خدمت وبندگی کا اظہار کرنا۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۔ بے شک میں اللہ کا بندہ ہوں۔

ایک یہ کہ خدا خود بندگی کی شہادت دے لیکن وہ گواہی مشروط ہو فرمایا

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ ۔ اور رحمٰن کے بندے۔ اسکے بعد ان کی صفات بیان کیں۔ جو یہ شرطیں پوری

کرے گا۔ وہ رحمٰن کا بندہ ہوگا۔ اس میں پورے ایک گروہ کا ذکر ہے۔ کسی ایک کے لئے مخصوص نہیں۔ ایک مرتبہ یہ کہ بلا قید و شرط بندگی کی گواہی دے جائے لیکن صراحت یا اشارے سے نام بھی لیا جائے۔

جیسا کہ فرمایا

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ ۔ اور ہمارے بندے ایوب کا ذکر کریں۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُدَ اور ہمارے بندے داؤد کا ذکر کریں عَبْدَهُ زَكَرِيَّا۔ اس کا بندہ زکریا۔ نِعْمَ الْعَبْدُ۔ بہت اچھا بندہ تھا سلیمٰن اس سے پہلے کئی آیتوں میں سلیمان علیہ السلام کا ذکر چل رہا ہے۔ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا۔ انہوں نے ہمارے بندے نوح کی تکذیب کی۔ پہلے سے نوح علیہ السلام کا ذکر شروع ہے۔ اور ان کا نام لیا جا چکا ہے۔

عبدیت کا یہ وہ درجہ ہے جو سب نبیوں کو حاصل ہے۔ لہٰذا شناخت کے لئے نام لینے کی ضرورت پڑتی ہے۔

مقام مصطفیٰ

کامل ترین درجہ بندگی کا وہ مقام ہے جہاں نام لینے کی ضرورت نہ پڑے یہ صفت اور خوبی ہی شناخت بن جائے۔ یہ مصطفیٰ کا مقام ہے۔ آپ علیہ الصلاۃ والسلام بندگی کے اس مقام پر کھڑے ہیں جہاں کوئی آپ کا ثانی اور ہم پلہ نہیں۔ آپ کا نام لیا جاتا ہے اور نہ کوئی دوسری صفت ہی بیان کی جاتی ہے۔ صرف بندہ کہہ کر بتایا جاتا ہے یہ ہے **میرا محمد میرا بندہ** ۔ جو بندگی میں اتنا کامل ہے کہ عبد کا لقب اس کے سوا کسی اور پر جچتا ہی نہیں۔ یہ کتنا بڑا اعزاز اور فضیلت ہے۔ کمال بندگی کی اس گواہی میں کتنا پیار اور کتنی محبت ہے اپنے محبوب کیلئے۔ فرمایا

وَأَنَّهُ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللَّهِ يَدْعُوهُ كَادُوا يَكُونُونَ عَلَيْهِ لِبَدًا

اور یہ کہ جب کھڑا ہوا اللہ کا بندہ کہ اس کو پکارے تو لوگوں کا بندھنے لگتا ہے اس پر ٹھٹھ۔ (الجن)

یعنی بھیڑ کر کے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ آپ کو عبداللہ کہا اور آپ کی عبدیت کو اپنی ذات کی طرف مضاف کیا۔ کسی صفت کی طرف نسبت نہیں کی۔ جیسے بادشاہ کسی کے بارے میں کہے یہ حکومت کا

نوکر ہے۔ اور کسی کے بارے میں کہے یہ میرا نوکر ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے وہ اہل فہم پر روشن ہے۔ ایک اور جگہ فرمایا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا

اور اگر تمہیں اس کلام میں شک ہو جو ہم نے اتارا ہے اپنے بندے پر (البقرۃ)

عَبْدِنَا سے مراد حضور ﷺ ہیں۔ اس میں حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی جو شان بیان فرمائی گئی ہے اس بارے میں علامہ الوسی فرماتے ہیں

وفی ذکرہ صلی اللہ علیہ وسلم بعنوان العبودیة مع الاضافة الی ضمیر الجلالة تنبیہ علی عظم قدرہ واختصاصه به و انقیاد لاوامرہ وفی ذالك غایة التشریف والتنویہ بقدرہ صلی اللہ علیہ وسلم	اور ضمیر جلالت کی طرف مضاف کرتے ہوئے بندہ ہونے کے عنوان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں تنبیہ ہے کہ آپ کا مرتبہ عظیم ہے اور آپ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حکموں کے مطیع ہیں اور اس میں آپ کی انتہائی بزرگی اور بلند مرتبے کے ساتھ آپ کی شہرت ہے

معراج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَىٰ بِعَبْدِهِ لَيْلًا (بنی اسرائیل۔۱)

پاک ہے وہ ذات جو لے گیا رات کے کچھ حصے میں اپنے بندے کو۔

معراج آپ کی بلندیوں کا سفر ہے۔ یہ بشریت کا فخر ہے۔ آپ کے رتبے کی بلندی اور عظمت کی علامت ہے۔ اس موقع پر رسول یا نبی کہنے کی بجائے آپ کو بندہ کہا گیا کیونکہ بندہ کہنا انتہائی قرب کی دلیل ہے۔

ایک مفسر نے فرمایا

ولو کان اسم اشرف من لفظ العبد لسماہ به فی تلك الحال (همیان الزاد)

اگر عبد کے لفظ سے بہتر اور کوئی نام ہوتا تو اس بہترین حالت میں آپ کو وہ نام دیا جاتا۔

سورۃ فرقان میں فرمایا

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ — بابرکت ہے وہ جس نے قرآن اتارا اپنے بندے پر

علامہ طنطاوی جوہری فرماتے ہیں۔

ووصف الله تعالى رسوله صلى الله عليه وسلم بالعبودية واضافها لذاته للتشريف والتكريم والتعظيم وان هذه العبودية لله تعالى — اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عبودیت سے موصوف کیا۔ اور اس بندگی کی نسبت اپنی ذات کی طرف کی۔ اس میں آپ کی تشریف، تکریم اور تعظیم ہے۔ اور یہ بھی کہ یقیناً یہ بندگی اللہ ہی کے لئے ہے

تفسیر السعدی میں اس مقام پر فرمایا۔

محمد صلى الله عليه وسلم الذى كمل مراتب العبودية وفاق جميع المرسلين — (عبدہ سے مراد) محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جنہوں نے عبودیت کے تمام مراتب کی تکمیل کر لی اور تمام نبیوں اور رسولوں پر فوقیت لے گئے۔

عبادت اور عبودیت کا فرق

بندگی کرنے کے معنوں میں عربی الفاظ عبادۃ اور عبودیت ہیں۔ تاج العروس میں ہے۔

واما عبدالله فمصدره عبادة وعبودة وعبودية اى الطاعه — اور رہا عبداللہ تو اسکا مصدر عبادۃ، عبودۃ اور عبودیت ہے یعنی اس نے اللہ کی اطاعت کی

عبادت اور عبودیت کے درمیان امام راغب نے مفردات میں یوں فرق کیا

العبودية اظهار التذلل والعبادة ابلغ منها لانها غاية التذلل — عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرنا عبودیت ہے۔ عبادت اس سے زیادہ بلیغ ہے۔ کیونکہ انتہائی ذلت کو عبادت کہتے ہیں

انتہائی ذلت کا مطلب ہے اللہ کے حضور عاجزی کی آخری حد تک اتر جانا۔ خود کو اللہ کے سامنے اتنا گرا دینا کہ اس کے بعد پستی کی کوئی حد نہ رہے۔ لسان العرب میں ہے۔

ومعنى العبادة فى اللغة الطاعة مع الخضوع ومنه طريق معبد — اور عبادت کا لغوی معنی ہے۔ عاجزی کے ساتھ اطاعت کرنا اور اسی سے ہے۔ طریق معبد یعنی

لذا كان مذللا بكثرة الوطء — ایسا راستہ جو مسلسل چلنے کی وجہ سے ہموار ہو گیا ہو۔

عابد اور عبد میں فرق

اس سے عابد کا لفظ مشتق ہے۔ عابد وہ ہے جو انتہائی عاجزی کے ساتھ اطاعت یعنی بندگی کرے۔

والعبد ماخوذ من التعبد — عبد کا لفظ تعبد سے لیا گیا۔

تعبد کا معنی بندگی اور عبادت گزاری ہے۔

وسمى العبد عبدا لذلته وانقياده (بغوی۔ البقرۃ۔) — اور عبد کو عبد اسلئے کہتے ہیں کہ وہ حقیر اور حکم ماننے والا ہوتا ہے

اب تجھے عبادت عبودیت سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور عبد کے لفظ میں عابد سے زیادہ بلاغت ہے۔ امام راغب ہی فرماتے ہیں

العبد ابلغ من العابد — عبد میں عابد سے زیادہ عاجزی اور ذلت ہے۔

لہٰذا عبد کا مفہوم ہوا سراپا بندگی۔ جو ظاہر باطن میں اتنا مطیع ہو کہ خود کو لاشے کر دے۔ جو اللہ کے سامنے دل کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنی پستی و ذلت کا اقرار کرے۔

تقاضائے عبدیت

اس کے لئے معرفت رب اور معرفت نفس دو باتیں لازم ہیں۔ جیسے فرمایا

من عرف نفسه فقد عرف ربه — جس نے اپنے نفس کو پہچان لیا اس نے اپنے رب کو پہچان لیا

معرفت ذات کیا ہے؟ عجز، کمزوری، ناتوانی اور ناطاقتی میرا اثاثہ ہے۔ بے اختیاری اور احتیاج میرا سرمایہ ہے۔ نقص و زوال میری متاع ہے۔ میں بذات خود کسی چیز کا مالک نہیں۔ میری تو ذات بھی اس کی نگاہ کرم کا صدقہ ہے۔ میرا ہر کمال اس کی عطا ہے۔ میری ہر خوبی اس کا انعام ہے۔ اپنی ذات کا ادراک کرنا اپنے نفس کو پہچاننا معرفت رب کا دروازہ ہے۔ اللہ کی ذات اور صفات کو جاننا، اس کی لازوال طاقت اور با کمال قدرت کا احساس کرنا۔ اس کے ہمہ گیر اختیار کا یقین کرنا۔ اس کی عظمت و جبروت کا ادراک کرنا۔ اس کے قہر اور مہر کا خیال کرنا۔ اپنی حقارت اس کی جلالت، اپنے ضعف اس کی قوت، اپنے عجز اس کی قدرت، اپنی احتیاج اس کی غنا پر یقین رکھنا۔ خود کو سراپا

عیب و نقص جان کر اس کے کمال و نوال پر نظر کرنا۔ کائنات کے ہر ذرے پر اس کی سلطنت و حکومت کا اعتقاد کرنا اللہ کی معرفت ہے۔ یقین و اعتقاد کا یہ نقش اتنا گہرا ہو جائے کہ دل کے تخت پر اللہ کے سوا کوئی حکمران نہ ہو۔ حریم قلب میں اللہ کے غیر کا گزر تک نہ ہو۔ یہی بندگی کا کمال ہے

اخلاص اور اطاعت کی گواہی

معرفت رب کا یہ بیکراں سمندر اخلاص اور اطاعت کے پانی سے لبریز ہے۔ کمال بندگی کی گواہی در اصل معرفت اخلاص اور اطاعت میں کمال کی گواہی ہے۔ آپ کو علی الاطلاق اپنا بندہ کہنا اس بات کی شہادت ہے کہ آپ سے زیادہ مخلص، آپ سے بڑا عارف اور آپ سے بڑھ کر مطیع کوئی نہیں۔

کمال شکر کی شہادت

بندگی کا یہ کمال اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ادائیگی شکر میں بھی کامل ہیں۔ بندہ ہو اور شکر گزار نہ ہو کیسے ہو سکتا ہے؟ معرفت اور شکر تو لازم ملزوم ہیں۔ اللہ ہی محسن ہے۔ منعم ہے۔ معطی ہے۔ جواد رزاق اور داتا ہے۔ اس کی نعمتیں بے بہا ہیں۔ موسلا دھار بارش کی طرح مسلسل برس رہی ہیں۔ ان کا انقطاع تو میری موت ہے۔ نہیں بلکہ موت بھی تو اس کا انعام اور احسان ہے۔ میرا کچھ بھی اپنا نہیں۔ یہ سب معرفت کا حصہ ہے۔ ہر لحہ ہر آن جو اس احساس میں جی رہا ہو اس کی زبان سے بے ساختہ شکر نکلے گا۔ اس کا تو ڑواں ڑواں شکر گزار ہوگا۔ جو اس معرفت میں کمال کی حد بھی عبور کر چکا ہو۔ جو ہر لمحہ اس کی حمد و ثنا کے ترانے گا کر بھی یوں عاجزی کا اظہار فرمائے

لا احصی ثناء علیک انت — اے اللہ میں تیری تعریف کرنے سے عاجز ہوں۔ تو ویسا ہی ہے جیسے تو
کما اثنیت علی نفسک — نے خود اپنی تعریف کی ہے (مسلم۔ باب ما یقال فی الرکوع والسجود)

اس سے زیادہ شکر گزار کون ہو سکتا ہے؟ اسی لیے تو آپ نے حضرت عائشہ کو جواب میں فرمایا تھا

افلا اکون عبدا شکورا — کیا میں اس کا شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ (مشکوٰۃ شریف)

اللہ کی نعمتوں کا اتنا عظیم احساس تھا کہ آپ نے کبھی کسی کھانے کی برائی نہیں کی۔ عبدیت آپ کی ہر ادا سے چھلک چھلک پڑتی۔ فرماتے ہیں

اٰکل کما یاکل العبد اجلس کما یجلس العبد

میں بندوں کی طرح کھاتا اور بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں (البغاعی۔ الفرقان۔ ۱۰)

کمال ذکر اور کمال یقین کی گواہی

کمال بندگی کی شہادت میں آپ کے کمال ذکر اور یقین کامل کا اشارہ بھی ہے۔ معرفت اور غفلت اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ جس ذات پر غفلت کی پرچھائیں بھی نہ پڑیں۔ جو نیند میں بھی غافل نہ ہو۔ کامل ترین معرفت کی وجہ سے جسکی آنکھیں سوتی اور دل جاگتا ہو جیسے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا

تنام عینای ولا ینام قلبی — میری آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتا (سنن ابوداود۔ فی الوضوء من النوم)

اس ارشاد کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب ہے آپ اللہ کی معرفت میں اس کمال درجے پر ہیں جہاں چوبیس گھنٹوں میں غفلت کا ایک لمحہ بھی نہیں۔ آپ ہر وقت مشاہدہ یار میں مستغرق رہتے ہیں۔ ایسی ہستی کا کوئی وقت ذکر سے خالی نہ ہوگا۔ اور جس کا دل اللہ کی عظمت سے لبریز ہو اسکی قوت یقین بیان کرنے سے یہ عاجز عاجز ہے۔

سورۂ فرقان میں عبدہ کی تفسیر کرتے ہوئے مفسر حقی فرماتے ہیں۔

عبدہ الاخلص ونبیہ الاخص و	محمد ﷺ اس کے زیادہ اخلاص والے
حبیبہ الاعلی وصفیہ الاولی محمد	بندے، زیادہ خاص نبی، اس کے بلند رتبہ حبیب
ن المصطفی صلی اللہ علیہ وسلم	اور اس کا اولین انتخاب ہیں۔ اس میں کمال بندگی
وفیہ تشریف لہ بالعبدیۃ المطلقۃ و	کے ساتھ آپکا شرف ہے۔ تمام نبیوں پر آپ کی
تفضیل بھا علی جمیع الانبیاء فانہ	فضلیت ہے۔ بس بے شک ان میں سے کسی ایک
تعالی لم یسم احد منھم بالعبد	کو بھی اللہ نے علی الاطلاق اپنا بندہ نہیں کہا
مطلقا کقولہ تعالی عبدہ زکریا	جیسا کہ اس کا فرمان ہے اس کا بندہ زکریا۔ (۱)

فنائے نفس کی گواہی

انتہائی بندگی اور کمال درجے کی معرفت کا تقاضا فنائے نفس ہے۔ اپنی ذات مٹا کر اللہ کی ذات میں فنا ہو جانا۔ عبد مطلق کہنا آپ کے فنائے نفس کی شہادت بھی ہے۔ اس وجہ سے روز قیامت انبیاء نفسی نفسی

پکاریں گے اور آپ کی مبارک زبان پر امتی امتی کے الفاظ ہوں گے۔
عبدہ کی تفسیر میں ابن عجیبہ فرماتے ہیں۔

كان فانيا عن حظوظه، فالما بحقوقه، خالصا في عبوديته	اپنی خوشی کو ذات حق میں فنا کر دیا۔ اس کے حقوق کے لئے کھڑے ہیں، اپنے رب کی بندگی میں خالص ہیں۔ (الکہف۔۱)

کمال بندگی کی وجہ سے آپ ﷺ نے اللہ کو خلیل بنایا۔ اور فرمایا اللہ کے سوا کسی کو خلیل بناتا تو وہ ابوبکر ہوتے۔ آپ کو اس کا صلہ کیا ملا؟ قیامت تک رسالت کے ساتھ آپ کی بندگی کی شہادت لازمی قرار دیدی گئی۔

کمال محبت کی علامت

معرفت جتنی زیادہ ہو قربت اور محبت میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔ آپ کو بندہ کہنا اس بات کی گواہی بھی ہے کہ اللہ آپ کا محبوب ہے اور آپ اللہ کے محبوب ہیں۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن   دل بدست دگرے دادن وحیراں بودن

اس بات کی علامت بھی ہے کہ آپ کا کمال بندگی ہے۔ خبردار کہیں آپ کو حد سے بڑھا کر الوہیت کے مقام پر نہ بٹھا دینا۔ خبردار آپ کے عمدہ اور اعلیٰ ترین اوصاف دیکھ کر ہرگز یہ خیال نہ کرنا کہ آپ خدائی اختیارات کے حامل ہیں۔
مفسر جوہری طنطاوی فرماتے ہیں

وفيه اشارة ايضا الى تقرير هذا العبودية لله تعالى وتاكيدها حتى لا يلتبس مقام العبودية بمقام الالوهية	اس میں یہ بندگی اللہ کے لئے مقرر کرنے کا اشارہ بھی ہے اور اس بات کی تاکید بھی کہ بندگی کا مقام خدائی مقام سے مخلوط نہ کیا جائے۔

اور اس کے بعد فرماتے ہیں۔

اكمل الخلق اكملهم عبودية لله تعالى ولهذا كان النبي صلى الله عليه وسلم اقرب الخلق الى الله تعالى	جو خلق میں زیادہ کمال والا ہے۔ وہی اللہ کی بندگی میں زیادہ کمال والا ہے۔ اسی لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق میں اللہ کے زیادہ قریب ہیں اور اسی

واعظمهم عنده جاها وارفعهم عنده منزلة لكماله في مقام العبودية (بنی اسرائیل پ۱)	لئے اللہ کے نزدیک آپ کی جاہ و منزلت مخلوق سے زیادہ بلند اور بڑی ہے کہ مقام عبدیت میں آپ کو کمال حاصل ہے

تفسیر قشیری سورہ کہف میں ہے۔

وان سماه عليه السلام عبدفهو من جلائل نعمه عليه لان من سماه عبده جعله من جملة خواصه	اگر آپ کو اپنے بندہ کہا تو یہ آپ پر اس کی بڑی نعمتوں میں سے ہے۔ اس لئے کہ عبدہ کہہ کر اسے آپ کا خاصہ بنا دیا۔

دلیل ختم نبوت

معلوم ہوا آپ کا مقام عبدیت مطلقہ کا مقام ہے۔ آپ ہر لحاظ سے عبد کامل ہیں۔ کائنات میں عبد اللہ کا حقیقی مصداق آپ کے سوا کوئی نہیں۔ معرفت علم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ یہ کمال معرفت کمال علم بھی ہے۔ اللہ کی معرفت میں کوئی آپ کا ثانی نہیں تو علم میں بھی کوئی آپ جیسا نہیں۔ بندگی، معرفت، اخلاص، اختصاص اور قرب کے مرتبے آپ پر ختم ہو گئے۔ اس لئے ختم نبوت کا تاج بھی آپ پر ہی سجتا ہے۔
تفسیر السعدی میں ہے۔

وفي وصف الرسول بالعبودية في هذا المقام العظيم دليل على ان اعظم اوصافه صلى الله عليه وسلم قيامه بالعبودية التي لا يلحقه فيها احد من الاولين والاخرين	اس عظیم مقام میں بندگی کے ساتھ رسول کا وصف بیان کرنا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ حق بندگی ادا کرنا آپ کا وہ عظیم وصف ہے۔ جس میں اولین اور آخرین سے کوئی آپ کا ثانی نہیں۔ (البقرہ۔۲۳)

کامل العلم

محمد ﷺ بے پناہ ہیں۔ آپ کا علم بے بہا ہے۔ اسے تعریف کی حد میں روکا نہیں جا سکتا۔ مقدار کی رسی میں باندھا نہیں جا سکتا۔ کیف کے تخیل کا پابند نہیں کیا جا سکتا۔ آپ علم کا بحر مواج اور معرفت کا بحر ذخار ہیں۔ لفظوں میں اس کی گہرائی سمو نہیں سکتے۔ سوچ کے پیمانے سے اس کی اونچائی ماپ نہیں سکتے۔ یہ سمندر بے کنار ہے۔ آسمان علم کا یہ ستارہ بیکراں ہے۔ آپ ملک اور ملکوت کا، مکان اور لامکاں کا علم رکھتے ہیں۔ اگلوں اور پچھلوں کا علم آپ میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ان کے علمی مراتب آپ پر منتہی ہو گئے۔ آپ ﷺ شہود کے عالم ہیں اور غیب کی خبر رکھتے ہیں۔ آسمان و زمین کی بادشاہت آپ نے دیکھی۔ عالم امر اور ملاء اعلیٰ کا آپ نے مشاہدہ کیا۔ جنت و جہنم، ثواب و عذاب کے مناظر آپ نے ملاحظہ کیے۔ آپ کا علم حقائق کا علم ہے۔ آپ حقیقت الحقائق کو جانتے ہیں۔ اللہ کی معرفت اور اس کی پسند و ناپسند کا بھرپور علم رکھتے ہیں۔ یہی وہ علم ہے جس پر حقیقی فلاح کا مدار ہے۔

یہ حقیقی باخبری اور اصل جان کاری ہے۔ آپ ﷺ باخبر ہیں۔ اور باخبر ہیں کہ آپ باخبر ہیں۔ پھر اس باخبری پر آپ کو فخر بھی نہیں۔ ہاں تحدیث بالنعمۃ کے طور پر فرماتے ہیں۔

انا اعلمکم باللہ و اعرفکم باللہ　میں تم سب سے زیادہ اللہ کا علم یا معرفت رکھتا ہوں۔

(فضل الباری۔ ۳۶۷)

یہی علم آپ کے منصب کا تقاضا اور یہی آپ کی شان کے لائق ہے۔ اس علم میں آپ کا دائرۂ معلومات تمام انبیاء و رسل سے وسیع ہے۔ یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ آپ کے علم سے مخلوق کو وہی نسبت ہے جو نوکِ خار پہ لرزتے قطرۂ آب کو سمندر سے ہے۔ بقول حضرت نانوتوی علم ممکن للبشر آپ پر منتہی ہو گیا۔

علم کیا ہے؟

معلومات کو مجازاً علم کہتے ہیں۔ اصل میں یہ ایک استعداد اور ملکہ ہے۔ جس کا تعلق عقل سے ہے۔ اس کی مدد سے جانکاری ملتی ہے اور حقیقت کو جانا جا سکتا ہے۔ علم کثرت معلومات کا نام نہیں۔ معلومات تو وہ چیزیں ہیں جن پر فاعل کا فعل واقع ہوا۔ یہ تو کمیت میں اضافہ کرتی ہیں۔ یادداشت جتنی تیز ہوگی معلومات اتنی زیادہ ہوں گی۔ ہاں معلومات کی کمی بیشی سے اس صلاحیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ کیفیت میں ہو یا کمیت میں۔ علوم یا تو نظری ہوتے ہیں یا عملی۔ نظری علوم کے بارے میں امام رازی فرماتے ہیں۔

فاشرفها واکملها معرفة ذات الله　پس ان میں اشرف و اکمل علم اللہ کی ذات، صفات وصفاته وافعاله واحکامه واسمائه　افعال احکام اور اسماء ہے۔ (الانعام۔ ۹۲)

حقیقی علم

ایک علم وہ ہے جو عقل کے واسطے سے ملتا ہے۔ دوسرا وہ ہے جس تک پہنچنے کا عقل کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ یہ وحی کا علم ہے۔ اسے نبوت بھی کہتے ہیں۔ اس کے لئے عقل لازم ہے۔ اس میں مبداء اور معاد کا بیان ہوتا ہے۔ مقصود وجود کا ذکر ہوتا ہے۔ یہ اللہ کی معرفت اور اس پر دلالت کرنے والے اعمال پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں اللہ کی پسند و ناپسند، جائز و ناجائز، صحیح و غلط اور حلال و حرام کی بحث ہوتی ہے۔ اسی سے کیوں کا سراغ ملتا ہے۔ خود فریبی کے بجائے خود شناسی کا سبق حاصل ہوتا ہے۔ منتخب بندوں پر اللہ اس کا فیضان فرماتا ہے۔ یہی علم علی وجہ الکمال اللہ نے محمد ﷺ کو عطا فرمایا۔ یہی اعلیٰ علم ہے۔ نبوت اسی علم کا اعلیٰ ترین مرتبہ ہے۔

کمال عقل کمال یقین

علم جاننے کا نام ہے۔ اور جانکاری حقیقت ہی کی ہوتی ہے۔ اسی سے جازم اعتقاد اور راسخ یقین پیدا ہوتا ہے۔ نبی حقیقت الحقائق سے وہ علم لیتا ہے۔ جس میں شک کا شائبہ اور وہم بھی نہیں۔ جیسے کہ پہلے بتایا ہے علم ایک استعداد ہے۔ اس کا تعلق وحی سے ہو تو اس کے لئے عقل لازم ہے وحی سے نہ ہو تو واسطہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ علم کا کمال عقل کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ آپ کا وافر اور

کامل علم بتاتا ہے آپ ﷺ کمال عقل رکھتے ہیں۔ نبی جیسے عقل میں کامل ہوتا ہے ویسے ہی یقین میں بھی کامل ہوتا ہے۔ آپ ﷺ عقل میں اکمل اور یقین میں اتم ہیں کیونکہ آپ علم میں سب سے فائق ہیں۔ یقین سے سکون پیدا ہوتا ہے اور اضطراب ختم ہوتا ہے۔ حواس باختگی یقین کی کمزوری ہے۔ یہی وجہ ہے سخت سے سخت لمحات میں آپ مضطرب نہ ہوئے۔ حواس باختگی، تردد اور تذبذب کا اظہار نہ کیا۔ پہاڑ کی طرح ڈٹ گئے۔ اور آپ کے پائے استقلال میں لغزش تک نہ آئی۔ ضبط نفس اور شجاعت اسی کے آثار ہیں۔

ابتدائے علم:

ایک وقت تھا جب آپ ہدایت پر تھے لیکن اس کی جزئیات سے لاعلم تھے۔ مومن تھے لیکن ایمان کی تفصیلات سے آگاہ نہیں تھے۔ شرک سے نفور اور گناہوں سے بیزار تھے لیکن توحید کی توضیح، اللہ کی مرضی اور اس کے احکام سے ناواقف تھے۔ قرآن کہتا ہے۔

مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ   تو نہ جانتا تھا کہ کیا ہے کتاب اور نہ ایمان۔

مزید ارشاد فرمایا۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ۔

اور تو پڑھتا نہ تھا اس سے پہلے کوئی کتاب اور نہ لکھتا تھا اپنے داہنے ہاتھ سے۔

پھر حصول علم کے لئے آپ نے کسی درس گاہ میں داخلہ لیا نہ کسی استاد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اصحاب علم کی صحبتوں میں بیٹھے نہ اہل کتاب کی مجلسوں سے استفادہ کیا۔ امیّین میں پیدا ہوئے اور امی ہی رہے۔ امی ہونا ہی دلیل نبوت اور آپ کے لئے مایہ فخر بن گیا۔ چالیس سال اسی عالم میں گذرے۔ چالیس کے بعد اچانک آپ کی زبان مبارک سے اس علم کا اظہار شروع ہوا جس کی نظیر مشرق اور مغرب سے ممکن نہیں۔ جس کے سامنے فلسفیوں اور دانش وروں کی گردنیں جھک گئیں۔ قانون دانوں اور سیاست دانوں کے چراغ بجھ گئے۔ ادیبوں اور قلم کاروں کا سورج گہنا گیا۔ مصلحوں اور مجددوں کے نقش ناتمام ثابت ہوئے۔ جہاں گیروں اور کج کلاہوں کی جلالت خاک ہوگئی۔ عقلاء اور فصحاء اس کا دم بھرنے لگے۔ یہ اتنی عظمت اور شان والا

علم آپ کو کہاں سے ملا؟ قرآن ہی اسکا جواب دیتا ہے

اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا   بھیجا ہم نے تیری طرف قرآن اپنے علم سے (الشوریٰ)

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ   اور تجھ کو سکھائیں وہ باتیں جو تو نہیں جانتا تھا (النساء)

اللہ نے خود آپ کو علم سکھایا اور اتنا کہ اس میں آپ سب سے بڑھ گئے۔

علم میں برتر

(۱) نبیوں سے میثاق لینے کے موقع پر ارشاد فرمایا۔

لَمَا اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ   جو کتاب اور حکمت میں نے تمہیں عطا کی

کتاب و حکمت دونوں علم ہیں۔ یہ عطا کرنے کا مطلب نبوت عطا کرنا ہے۔ اسی مقام پر آپ کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا۔

ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ   پھر آئے تمہارے پاس کوئی رسول۔

رسالت امر اور نہی کا نام ہے۔ اور یہ بھی علم ہے۔ جب معلوم ہوا نبوت علم کا اعلیٰ درجہ ہے۔ تو جس پر اس کے تمام مراتب مکمل ہوئے اس کے علم کا کیا ٹھکانہ ہوگا۔ اسی مقام پر مزید فرمایا۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ   سچا بتادے تمہارے پاس والی کتاب کو

ایک بات قابل غور ہے۔ جب میں نے تمہیں بھیجا پھر رسول نے آکر تمہاری تصدیق کی۔ یہ نہیں فرمایا بلکہ یوں کہا۔ جب میں نے تمہیں کتاب و حکمت عطا کی پھر رسول نے آکر اس کتاب و حکمت کی تصدیق کی جو تمہارے پاس ہے۔ اس میں آپ کے کامل علم کا اظہار ہے۔ یہ ظاہر ہے۔ اور نبوت کی تصدیق کو متضمن ہے جو اصل ہے۔ اگر پہلا عنوان اختیار کیا جاتا تو نبوت کی تصدیق ہی ظاہر اور اصل بن جاتی۔ اس صورت میں بحیثیت مصدق آپ کا افضل ہونا لازم نہ ہوتا۔ یہ ایسی ہی تصدیق ہوتی جیسے امتی نبی کی تصدیق کرتا ہے۔ جب آپ ﷺ تمام انبیاء کی کتابوں کے مصدق ہے تو لازم آیا آپ کا علم تمام انبیاء کے علم کو محیط ہو۔

(۲) آپ ﷺ عبد مطلق اور داعی الی اللہ ہیں۔ دونوں میں انتہا درجے کی معرفت پائی جاتی ہے۔ ایسی معرفت جو کسی اور کو حاصل نہیں اور یہ بجائے خود علم ہے۔ لہٰذا آپ علم میں سب سے برتر ہیں۔

(۳) حضور ﷺ خاتم النبیین ہیں۔ نبوت حقیقی علم کا اعلیٰ مرتبہ ہے۔ اس اعلیٰ ترین علم کے تمام مراتب آپ نے طے کر لیے اور اس بلند علمی مقام تک پہنچے جہاں تک کسی کی رسائی نہیں۔ یہ بھی علم میں آپ کے کمال کی دلیل ہے۔

(٤) آپ ﷺ پر کتاب اتاری۔ اس شان والی کتاب نے ہر بات کا احاطہ کر لیا ہے۔ انسانی فلاح اور کامیابی کا ہر پہلو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ انسانی نجات کا کوئی گر ایسا نہیں جو اس کتاب میں نہ ہو۔ اور یہ کہنا بالکل بجا ہے۔ جو بات یا طریقہ اس میں نہیں اس کا نجات کے ساتھ کوئی تعلق بھی نہیں۔ سورہ نحل (۸۹) میں فرمایا

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ اور ہم نے آپ پر کتاب اتاری جو ہر چیز کا کھلا بیان ہے۔

حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں

قد بين لنا في هذا القرآن كل علم و كل شئ	ہمارے لئے اس قرآن میں ہر علم اور ہر چیز بیان کی گئی۔ (ابن کثیر)

آپ کے علم کی عظمت

آپ کو اس روشن، ناطق، حق اور مفصل کتاب کا معلم بنایا۔ اس تبیان کا بیان آپ کے ذمے ہے۔ آپ کتاب وحکمت کے معلم ہیں۔ یہ علم اتنا پر عظمت ہے کہ پہاڑ تک اس کا تحمل نہ کر سکیں۔ اتنا وسیع ہے کہ قیامت کے بعد تک کا زمانہ اس میں سمو دیا گیا۔ اتنا عمیق اور گہرا کہ آج تک کوئی اس کی تہہ نہ پا سکا۔ اصول اتنے اٹل اور بنیادیں ایسی مضبوط کہ مرور زمانہ سے کہنہ اور شکستہ نہیں ہوئیں۔ قوانین اور قواعد اتنے لچک دار کہ ہر دور کا ساتھ نبھا سکیں۔ مٹھاس اور شیرینی اتنی کہ زبان سیر نہیں ہوتی۔ ہلکا اور خفیف اتنا کہ دماغ نہیں تھکتا۔ پر اثر اتنا کہ دل ہوا وس میں اڑنے لگتے ہیں معلم کا کتاب کے ساتھ جو تعلق ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ کتاب کا یہ عالم ہے تو جس پر اس کا نزول ہوا اور جس نے اس کی مراد بیان کی اس کے علم کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ یہی نہیں کہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام پر کتاب وحکمت کا نزول ہوا بلکہ مزید فرمایا۔

(٥) وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ	آپ کو وہ کچھ سکھایا جو آپ نہیں جانتے تھے۔ (النساء ۱۱۳)

تفسیر مدارک میں ہے۔

من امور الدين والشرائع او من خفيات الامور وضمائر القلوب	دین اور شریعت کی باتیں جو آپ نہیں جانتے تھے وہ یا پوشیدہ باتوں اور دلوں کے بھید میں سے کچھ باتیں آپ کو سکھائیں

زاد المسیر میں تین قول نقل کیے۔

الشرع۔ شریعت سکھائی۔ یہ حضرت ابن عباسؓ اور امام مقاتل کا فرمان ہے۔

اخبار الاولین والآخرین۔ اگلوں پچھلوں کی خبریں سکھائیں۔ یہ ابو سلمان کا قول ہے۔

الکتاب والحکمۃ۔ کتاب وحکمت کی تعلیم دی۔ یہ امام ماوردی کا قول ہے۔

کتاب وحکمت کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے دوبارہ انہی کی تعلیم کا مطلب امام رازی کے الفاظ میں یہ ہے۔

انزل الله عليك الكتاب والحكمة	اللہ نے آپ پر کتاب وحکمت کا نزول فرمایا۔
واطلعك على اسرارهما واوقفك	دونوں کے اسرار پر آپ کو مطلع کیا۔ اور ان کے
على حقائقهما مع انك ما كنت	حقائق سے آپ کو واقفیت بخشی حالانکہ پہلے آپ
قبل ذالك عالما بشئ منهما	ہر دو میں سے کسی کو جانتے تک نہ تھے۔

کل، اور، ما، کی مراد

اوپر کی دونوں آیتوں میں کُلّ اور مَا دو کلمے استعمال ہوئے۔ کُل کا معنی ہے ہر ایک، سب۔ اور مَا کا معنی ہے وہ سب کچھ جو۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے ان دونوں کلموں سے عموم مراد ہے۔ یعنی کوئی ایسی چیز نہیں جس کا قرآن میں بیان نہ ہو۔ اور کوئی ایسی بات نہیں جو آپ کو سکھائی نہ گئی ہو۔ لیکن حقیقت ایسی نہیں۔ دونوں کلموں سے خاص باتیں اور خاص چیزیں مراد ہیں۔ پہلی آیت (النحل۔ ۸۹) کی تفسیر میں تمام ہی مفسرین یہ لکھتے ہیں کہ ہر چیز سے مراد دین کی ہر چیز ہے۔

مثلاً تفسیر بغوی میں ہے۔

يحتاج اليه من الامر والنهي والحلال والحرام والحدود والاحكام	حکم دینے، روکنے، حلال، حرام اور حدود واحکام میں سے وہ باتیں جن کی مکلف کو ضرورت ہے۔

اور امام رازی تو فرماتے ہیں۔

واما العلوم التی لیست دینیۃ فلا	جو علوم دینی نہیں آیت کا ان علوم سے
تعلق لہا بہذہ الایۃ	کوئی تعلق نہیں۔

عموم کی نفی قرآن کی کئی آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً سورہ یس میں فرمایا۔

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ	اور ہم نے نہیں سکھایا اس کو شعر کہنا۔ اور یہ اس کے لائق نہیں

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر بات کا علم آپ کو نہیں دیا گیا۔ دوسری یہ کہ کچھ باتیں ایسی ہیں جو آپ کے لئے نامناسب ہیں۔ اور کچھ ایسی جو آپ کی شان کے لائق ہیں آپ کو وہی علم مرحمت ہوا جو آپ کی شان کے لائق اور آپ کے منصب کا تقاضا ہے۔ اور وہ احکام کا علم ہے آفاق کا نہیں۔ تشریع کا علم ہے تکوین کا نہیں۔ کیونکہ نبی کا منصب ہی تبلیغ احکام ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھیے

گورنر کا مقصد زیر انتظام علاقے پر ملکی آئین کے مطابق نظم و نسق بحال رکھنا اور عوامی بہبود کے کام انجام دینا ہے۔ آئین کی رو سے کون سا کام صحیح ہے اور کون سا غلط۔ کہاں آئین کو پامال کیا جا رہا ہے۔ عوام کو کس چیز کی ضرورت ہے اور کس کی نہیں۔ فلاح کے لئے کون سے اقدامات کئے جانے چاہئیں وغیرہ۔ گورنر کے لئے یہ جاننا ضروری ہے۔ لیکن گورنر کی حیثیت سے اسے یہ معلوم ہونا ضروری نہیں کہ مکان کیسے بنتا ہے۔ اینٹیں کیسے بنتی ہیں۔ سیمنٹ کیسے بنتا ہے۔ اس کے لئے کون سی مشینیں درکار ہیں۔ ان کے اجزاء (Parts) کیا ہوتے ہیں۔ ہر پرزہ کیسے کام کرتا ہے۔ کپڑا کیسے بنا جاتا ہے۔ کیسے سیا جاتا ہے۔ گندم کی بوائی کیسے ہوتی ہے۔ بیورج کیسے بچھائی جاتی ہے۔ کیسے صاف کی جاتی ہے۔ بیماریاں اور ان کی علامات کیا ہوتی ہیں۔ ادویات اور ان کا طریقہ کار کیا ہوتا ہے۔ کل درخت کتنے ہیں۔ ان پر پتوں کی تعداد کتنی ہے۔ اس کے علاقے میں ریت کے ذرے کتنے ہیں۔۔ چوری کرنے، ڈاکا ڈالنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس طرح کی باتیں جاننا اس کے لئے ضروری نہیں۔ اسے ان باتوں کا علم نہ ہو تو اس پر کوئی الزام بھی نہیں بلکہ کچھ باتیں اس کے منصب سے کوئی جوڑ ہی نہیں رکھتیں بالکل نامناسب ہیں۔ ہاں آئین، قانون

اور دستور کا علم نہ ہو تو یقیناً نقص اور کمی ہے۔

اسی طرح نبی کا مقصد لوگوں کو اللہ کی معرفت اور پہچان کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اللہ کے احکام کی تبلیغ اور وضاحت نبی کا منصب ہے۔ اللہ کے قانون کی رو سے کون سی چیز جائز ہے کون سی ناجائز۔ کیا حلال ہے کیا حرام۔ کیا صحیح ہے کیا غلط۔ کون سے اعمال معرفت میں رکاوٹ ہیں۔ کون سے ممد و معاون ہیں۔ اللہ کا علم اس کی قدرت اور سلطنت کیسی ہے۔ اس کی جزئیات بیان کرنا تاکہ معرفت میں اضافہ ہو۔ یہ بتلانا نبی کا منصب ہے۔

علامہ الوسی فرماتے ہیں

وان بعثۃ الانبیاء علیہم الصلاۃ	اور یقیناً انبیاء کی بعثت صرف دین بیان
والسلام انما ھی لبیان الدین	کرنے کیلئے ہی ہوتی ہے۔ (النحل۔۸۹)

اس کے برعکس یہ جاننا کہ مخلوق کا کل شمار کیا ہے۔ آسمان میں ستاروں اور زمین میں ذروں کی تعداد کیا ہے۔ درخت اور ان کے پتے، پانی کی مقدار اور اس کے قطرے کتنے ہیں۔ ازل سے تا حال ہر مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ کیا ہوا۔ اور تا ابد کیا ہوگا۔ کون کون پیدا ہوگا۔ کہاں اور کیسے زندگی گزارے گا۔ کیا سوچے گا۔ سمندر میں مچھلیوں، غاروں میں درندوں، گھونسلوں میں پرندوں اور بلوں میں حشرات کی تعداد کیا تھی کیا ہے اور کیا رہے گی۔ زمین کا جغرافیہ کیا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیاں کہاں کہاں کتنی اور کیسی ہیں۔ اور اس طرح کی دیگر باتوں کا جاننا علم نبوت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ یہ معلومات نبی کو حاصل نہ ہوں تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ دامن شرف داغدار ہوتا ہے نہ ردائے علم پر کوئی دھبہ لگتا ہے۔ گویا کچھ باتیں ایسی ہیں جو آپ کے لئے نامناسب ہیں۔ مثلاً شعر گوئی، کہانت، علم نجوم جادو کے طریقے وغیرہ۔ کچھ ایسی ہیں جو نامناسب نہیں لیکن نبوت کے لئے ضروری بھی نہیں۔ ہاں ان میں سے کوئی ایک یا تمام معلوم ہو جائیں تو خوبی ضرور ہے۔ چنانچہ ایسی باتوں کے متعلق آپ سے دونوں طرح کے رویے ثابت ہیں۔ کبھی کبھار آپ ﷺ نے ایسی باتوں کی خبر دی جب بارگاہ واحدیت سے آپ کو آگاہی بخشی گئی۔ اور بنیادی طور پر ان باتوں کا چونکہ آپ کے منصب سے کوئی تعلق نہ تھا اس لئے ایسی ہر بات کا علم بھی

آپ کو حاصل نہ تھا۔ لہذا کبھی ایسی باتوں پر لاعلمی کا اظہار بھی فرمایا۔ بلکہ قرآن نے اس کا اظہار کیا تاکہ منصب نبوت کی حقیقت ملتبس نہ ہو۔ اور سوئے فہم سے کوئی یہ گمان نہ کرے کہ یہ معلومات نبوت کا حصہ اور نبی کا لازمہ ہیں۔ مثلاً غزوہ تبوک سے پامراد واپسی کے بعد کئی منافقین معذرت کے لئے حاضر ہوئے۔ ان کے عذر بدتر از گناہ کی اللہ نے آپ کو خبر دیدی اور فرمایا

لا تعتذروا لن نؤمن لکم قد — بہانے مت بناؤ ہم ہرگز نہ مانیں گے تمہاری بات

نبانا اللہ من اخبارکم — ہم کو بتا چکا ہے اللہ تمہارے احوال۔ (التوبہ۔ ۹۴)

اسی سورہ کی اگلی آیت میں فرمایا۔ مدینہ اور اس کے نواح میں ان کے علاوہ اس مرض کے خوگر اور بھی منافق ہیں۔

لا تعلمھم نحن نعلمھم — آپ انہیں نہیں جانتے ہم جانتے ہیں۔

اور جن کے بارے میں آگاہ فرمایا۔ وہ آگہی بھی کچھ خبروں تک محدود تھی۔

تفسیر ابن عجیبہ اور تفسیر حقی میں ہے

اعلمنا الوحی علی لسان نبیہ صلی — اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر وحی سے

اللہ علیہ وسلم ببعض اخبارکم — اس نے ہمیں تمہاری کچھ باتیں بتادی ہیں

لہذا آپ کے علمی کمال کو بیان کرتے ہوئے وہ بات کہنا جو آپ کے شایان شان نہیں حماقت کے سوا کچھ نہیں۔ مفسر ابن عاشور تعلیم کتاب وحکمت کی مراد بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

وتعلیمہ مالم یکن یعلم ھو مازاد — اور جو آپ نہیں جانتے آپ کو وہ سکھا علم

علی مافی الکتاب من العلم — کتاب پر اضافہ ہے۔ جیسے وہ علم جو سنت

فوارد فی السنۃ الاحاد یا المعجزات — کی شکل میں آیا اور مخفی خبریں دینا (النساء۔ ۱۱۳)

غیب کا علم اور اس کے اصول

آپ کو اللہ نے جو علم عطا فرمایا وہ سارا ہی غیب پر مشتمل ہے۔ مثلاً اللہ کی ذات اور صفات کا علم، آسمانوں کی خبریں۔ فرشتوں کے حالات۔ برزخ کے واقعات۔ حشر کے حادثات۔ جنت کے تذکار۔ جہنم کے مناظر۔ قیامت کی علامات۔ اقوام ماضی کے قصے اور ان کے عبرت انگیز انجام

وغیرہ۔ یہ سب غیب ہی ہے۔ کیونکہ

والغیب ما غاب عن الناس — جو کچھ لوگوں سے پوشیدہ ہے وہ غیب ہے۔

(ابن عاشور۔ توبہ۔ ۹۴)

اور آپ کو اس میں سے اتنا وافر حصہ دیا گیا۔ جس کی گنتی اور شمار ممکن نہیں۔ قرآن کی نظر میں یہ غیب تو ہے لیکن غیب کا علم نہیں۔ اور آپ ﷺ عالم الغیب نہیں۔ غیب اور علم غیب میں فرق ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو جو علم دیا گیا قرآن اس علم کو انباء الغیب (غیب کی خبریں) کہتا ہے۔ علم الغیب (غیب کا علم) نہیں کہتا۔ غیب کی خبر دینا نبوت کے مفہوم میں داخل ہے۔

والنبوۃ ما یشرفہ اللہ تعالی بہ عبدہ — اور نبوت وہ ہے جس کے ساتھ اللہ غیب کی خبریں دیکر

من انبائہ بالغیب وتکلیمہ بالوحی — اور بذریعہ وحی کلام کرکے اپنے بندے کو فضیلت دیتا ہے۔

(البحر المدید۔ آل عمران۔ ۷۹)

اس سے واضح ہو گیا کہ نبی کو غیب کی خبریں تو دی جاتی ہیں غیب کا علم نہیں دیا جاتا۔ نبی کے علم کے حوالے سے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو دو باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔

(۱) پہلی بات یہ معلوم ہوتی ہے۔ غیب کا علم اللہ کے لئے مخصوص ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی غیب کا عالم نہیں۔ سورۂ ہود میں ارشاد فرمایا۔

وللہ غیب السموت والارض — اور اللہ کے پاس ہے چھپی بات آسمانوں اور زمین کی (۱۲۳)

اس کا بامحاورہ ترجمہ ہے۔ آسمانوں اور زمین کی تمام پوشیدہ باتیں صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

روح المعانی میں ہے

ای انہ سبحانہ یعلم کل ما غاب فی — آسمانوں اور زمین کا ہر مخفی بھید اللہ ہی جانتا ہے۔

السموات والارض ولا یعلم ذلک — اور اس کے سوا کوئی بھی اس کا علم نہیں رکھتا۔

سواہ جل وعلا (الوسی۔ ہود۔ ۱۲۳)

اور ارشاد ہوا۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو — غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا انہیں کوئی نہیں جانتا

صاحب روح المعانی فرماتے ہیں

وتقديم الخبر لافادة الحصر
والمراد بالغيب المغيبات على
سبيل الاستغراق۔ (الوسی)

اور خبر کی تقدیم سے حصر کا فائدہ ہوا۔ یعنی اسکے سوا
کسی کو علم نہیں وہی ان کی خبر رکھتا ہے۔ اور غیب سے
وہ تمام چیزیں مراد ہیں جنھیں پوشیدہ کیا گیا۔

مفاتح کے مفسرین نے دو معنی کیے۔ کنجیاں اور خزانے۔ پہلا معنی مراد ہو تو مطلب ہو گا غیب کا علم اسی کے پاس ہے۔ دوسرا معنی ہو تو مطلب ہو گا غیب کے خزانوں کا وہی مالک ہے۔ مثلاً رزق اور بارش کے خزانے۔ حضرت عبداللہ بن عمر ﷺ کی ایک روایت کے مدنظر مفسرین فرماتے ہیں۔ غیب کی کنجیوں سے مراد وہ پانچ باتیں ہیں جن کا ذکر سورہ لقمن کے اخیر میں ہوا۔

إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ
الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا
تَدْرِي نَفْسٌ مَّاذَا تَكْسِبُ غَدًا
وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ
تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ

بے شک اللہ کے پاس ہے قیامت کی خبر۔ اور
اتارتا ہے مینہ۔ اور جانتا ہے جو کچھ ہے ماں
کے پیٹ میں۔ اور کسی جی کو معلوم نہیں کہ کل کو
کیا کرے گا۔ اور کسی جی کو خبر نہیں کہ کس
زمین پر مرے گا۔ (لقمن)

یہ غیب کے اصول ہیں۔ علامہ الوسی فرماتے ہیں مغیبات پانچ کے علاوہ بھی ہیں اور انہیں بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تفسیر ابن عاشور میں ہے۔

ومعنى لا يعلمها الا هو علما مستقلا
به فاما اطلع عليه بعض اصفيائه كما
قال تعالى عالم الغيب فلا يظهر غيبه
احدا الا من ارتضى من رسول فذالك
علم يحصل لمن اطلعه با خبار منه
فكان راجعا الى علمه هو۔

اور لا یعلمہا الا ہو کا معنی ہے ان کا مستقل علم اسی کو ہے رہا یہ کہ
اپنے منتخب بندوں میں سے کچھ بندوں کو اسنے اطلاع دی جیسا
کہ اللہ نے فرمایا وہ عالم الغیب ہے اپنے رسول میں سے جسے
پسند کرے اس کے سوا کسی پر غیب کا اظہار نہیں کرتا۔ تو یہ
وہ علم ہے جو اس رسول کو اللہ کی طرف سے خبر دینے پر حاصل ہوا
ہے۔ لہذا وہ بھی اسی کے علم کی طرف لوٹتا ہے۔ (الانعام ۵۹)

مفاتح سے اگر خزانے یعنی اصول مراد ہوں تو انہیں اللہ کے سوا کوئی بھی نہیں جانتا۔ اگر اس سے

کنجیاں یعنی پوشیدہ چیزوں کا علم مراد ہو تو اپنے رسول میں سے جسے جتنا چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے۔

اى علم المغيبات لا يعلمها غيره
الامن ارتضى من خلقه او عنده
خزائن علم الغيوب لا يعلمها غيره
(ابن عجيبه)

یعنی غائب شدہ چیزوں کا علم اس کے سوا کسی کو نہیں ہاں
اپنی مخلوق میں سے جسے عطا کر دے یا مراد ہے علم غیب
کے خزانے اس کے پاس ہیں۔ جو اس کے علاوہ کسی
کے علم میں نہیں۔

حضرت ابن مسعود ﷺ فرماتے ہیں

اوتى نبيكم علم كل شئى الا مفاتيح الغيب

تمھارے نبی کو ہر چیز کا علم دیا گیا۔ مگر غیب کے اصول نہیں بتائے گئے۔ (زاد المسیر۔ الانعام ۵۹)

اور بھی کئی آیتیں ہیں جو یہ واضح کرتی ہیں کہ علم غیب کلی تفصیلی محیط مستقل صرف اللہ کا ہے۔ وہی عالم الغیب ہے۔ پوشیدہ باتوں کے تمام اصول و فروع اور کلیات و جزئیات اسی کے علم میں ہیں۔

(۲) دوسری بات یہ معلوم ہوتی ہے اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم غیب کی نفی کی۔ اور آپ کیلئے جو علم ثابت کیا۔ اسے انباء غیب (غیب کی خبریں) اطلاع علی الغیب (غیب پر اطلاع) اظہار علی الغیب (غیب کو ظاہر کرنے) کا نام دیا۔ فرمایا

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ
اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ
لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا
يُوحَىٰ إِلَيَّ

تو کہہ میں تم سے نہیں کہتا میرے پاس اللہ کے خزانے
ہیں اور میں غیب کی بات نہیں جانتا اور میں تم سے نہیں
کہتا کہ میں فرشتہ ہوں۔ میں تو اسی پر چلتا ہوں جو میرے
پاس اللہ کا حکم آتا ہے (الانعام)

تفسیر بیضاوی میں ہے۔

مالم يوح الى ولم ينصب عليه دليل

جو میری طرف وحی کیا گیا اور نہ اس پر کوئی دلیل قائم کی گئی وہ میں نہیں جانتا۔

تفسیر النیسابوری میں ہے۔

اى لا اقول لكم مع هذا بخبرهم — میں نہیں کہتا کہ میں عالم الغیب ہوں۔ اس کے باوجود

بما مضى وعما سيكون باعلام / آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے گزشتہ اور آئندہ کی باتوں کی
الحق وقد قال صلى الله عليه وسلم / خبر دی۔ آپ کو اللہ نے یہ بتایا۔ اور حضور صلی اللہ
فی قصة ليلة المعراج نظرت خلفى / علیہ وسلم نے لیلۃ المعراج کے قصے میں فرمایا۔ میں نے
نظرة علمت ما كان وما سيكون / اپنے پیچھے دیکھا جو ہوا اور جو عنقریب ہوگا وہ جان لیا۔

جو ہوا جو ہوگا اسے جان لینے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر بات جان لی ورنہ علم غیب کی نفی کرنا درست نہیں رہتا۔ نیز اسی سفر میں بیسیوں باتیں ہیں جن کا آپ نے جبرائیل علیہ السلام سے سوال کیا۔ اور واپسی کے بعد تا حین حیات کئی ایسے مواقع آئے جہاں اللہ نے آگاہ کیا تب آپ کو صحیح صورت حال کا علم ہوا۔ لہٰذا اس کا مطلب ہوگا اجمالی طور پر بعض باتیں معلوم ہو گئیں۔ آپ پر حضرت مریم کا قصہ کیا۔ حضرت نوح کے حالات بتائے۔ حضرت یوسف کی کہانی سنائی۔ پھر فرمایا

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك / یہ باتیں (نوح کا قصہ) منجملہ غیب کی خبروں کے
ما كنت تعلمها انت ولا قومك / ہیں کہ ہم تیری طرف بھیجتے ہیں۔ اس سے پہلے
من قبل هذا / نہ تجھ کو ان کی خبر تھی نہ تیری قوم کو۔ (ہود۔۴۹)

یہاں ہر اس شخص کو غور کرنا چاہئے عقل و خرد جس کی رفیق ہیں۔ یوں نہیں فرمایا یہ غیب کا علم ہے جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں بلکہ غیب کی خبر کہا۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۷۹) میں فرمایا۔

ما كان الله ليطلعكم على الغيب / اور اللہ نہیں ہے کہ تمہیں غیب کی خبر دے لیکن اللہ
ولكن الله يجتبى من رسله من يشاء / اپنے رسولوں میں جس کو چاہے چھانٹ لیتا ہے۔

یعنی اپنے رسولوں کو غیب کی اطلاع دیتا ہے نہ کہ علم الغیب دیتا ہے۔ تمام مفسرین اس بات پر متفق ہیں۔ اللہ رسولوں کو سارے غیب کی اطلاع نہیں کرتا۔ بلکہ غیب کی کچھ باتیں بتاتا ہے۔ ہاں کسی کو کم کسی کو زیادہ۔ تفسیر نیشاپوری میں ہے۔

وبناء الكلام على ثلاث مراتب الاولى / اور کلام کی بنیاد تین مرتبوں پر ہے۔ پہلا یہ کہ یہ منصب
ان هذا المنصب الذى استأثر الله تعالى / جو اللہ نے اپنے علم کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ تم میں سے
بعلمه لا يليق بكل منكم والنما هو / ہر ایک کے لائق نہیں بلکہ اس کے منتخب بندوں کے ساتھ

مخصوص بالمصطفين من عبيده الثانية / مخصوص ہے۔ دوسرا یہ کہ بے شک رسول بھی غائب شدہ
ان الرسول ايضا لا يعلم المغيبات بان / باتیں اس طرح نہیں جانتا کہ اپنی طرف سے ان پر
يطلع عليها من تلقاء نفسه و بخاصية / مطلع ہو جائے اور اس میں خصوصیت رکھتا ہو بلکہ اسے یہ
فيه ولكنه انما يعلم ذالك من طريق / باتیں اللہ کی طرف سے اطلاع دینے اور وحی آنے
الوحى واطلاع الله تعالى اياه عليه ان / سے معلوم ہوتی ہیں کہ یہ مومن اور وہ منافق ہے۔
هذا مؤمن وذالك منافق الثالثة ان هذا / تیسرا مرتبہ یہ کہ کچھ رسولوں کو کسی کسی وقت ان
ايضا مختص ببعض الرسل وفى بعض / باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ جب بتانا اللہ کی مشیت
الاوقات حسب مشيه وارادته / اور ارادہ ہو۔ (آل عمران۔۱۷۹)

اس تفسیر نے واضح کر دیا رسول اس علم میں مستقل نہیں ہوتا جب چاہے غیب کی باتیں معلوم کر لے اللہ رسولوں کو غیب کی کچھ ہی باتوں سے مطلع کرتا ہے۔ اور جن کو اطلاع ہوتی ہے یہ ان کی دائمی مستقل صفت نہیں بنتی۔ انہیں بھی حسب مشیت کبھی پتہ چلتا ہے کبھی نہیں۔

سورہ الجن میں ارشاد فرمایا۔

عالم الغيب فلا يظهر على غيبه / جاننے والا ہے بھید کا سو نہیں خبر دیتا اپنے بھید
احدا الا من ارتضى من رسول / کی کسی کو مگر جو پسند کر لیا کسی رسول کو

اس آیت کی تفسیر میں تقریباً ہر مفسر نے کچھ غیب ملنے کا ذکر کیا ہے۔ علامہ معین فرماتے ہیں۔

وفيه ان الانسان المرتضى / اور اس میں ہے بیشک جس انسان کو اللہ
للنبوة قد يطلعه الله تعالى / نبوت کے لئے چن لیتا ہے اسے غیب میں
على بعض غيوبه / سے کچھ باتوں کی اطلاع کر دیتا ہے۔

یہاں چند باتیں اور بھی قابل توجہ ہیں۔ خود کو عالم الغیب کہا اور نبی کے لئے غیب ثابت کرنے کے مرحلے میں عالم کا لفظ ہٹا دیا۔ کلام یوں بھی ہو سکتا تھا۔

فلا يظهر على علم غيبه احدا۔ پس اپنے علم غیب کا کسی پر اظہار نہیں کرتا۔

اور یوں بھی فرمایا جا سکتا تھا

فلا یظھرہ علی احد۔ پس اسے کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔اس کے بجائے دوبارہ غیب کا لفظ اضافہ کیا۔
علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

واعتناد بشان الاختصاص جی، بالمظھر موضع المضمر

شان اختصاص کی اہمیت واضح کرنے کے لئے ضمیر کی بجائے ظاہری اسم (غیب) لایا گیا۔
غیبہ (اپنا غیب) کہہ کر اس بات کو ظاہر کیا کہ یہ میرا غیب ہے۔اور میرا علم اس کے لئے مختص ہے۔علم غیبہ کہنے سے اختصاص تو ظاہر ہو جاتا لیکن مراد یہ ہو جاتی رسول کو جو کچھ دیا وہ بھی علم غیب ہے۔اور یظھرہ کہنے سے اختصاص بھی نہ رہتا۔
غیبہ کہہ کر تین باتیں واضح فرمائیں۔
(۱)علم غیب اللہ کے لئے مخصوص ہے۔اور وہ اس میں متفرد ہے۔
(۲)رسول کو جو کچھ دیا گیا وہ علم غیب نہیں ہے۔
(۳)غیب میں سے جو کچھ رسول کے لئے ظاہر کیا گیا۔وہ غیب کی کچھ باتیں ہیں۔

علم غیب اور انباء غیب میں فرق

یہاں یہ سوال ضرور پیدا ہوگا۔علم غیب اور انباء غیب وغیرہ میں فرق کیا ہے۔اللہ عالم الغیب ہے۔ اور رسول کو اسی میں سے علم عطا ہو رہا ہے تو وہ عالم الغیب کیوں نہیں؟ آیئے اس سوال کا جواب تلاش کرتے ہیں۔قرآن آپ سے علم غیب کی نفی کرتا ہے۔اور اخبار غیب آپ کیلئے ثابت کرتا ہے۔
اسی کا نام اطلاع علی الغیب اور اظہار علی الغیب رکھا ہے۔آپ کا علم غیب کی خبر،غیب کی اطلاع اور غیب کا اظہار ہے۔قرآن کی آیات اور ان کی تفاسیر کی روشنی میں پتہ چلتا ہے۔ایسا علم جو ذاتی، یقینی،محیط اور مستقل ہو علم غیب ہے۔یہ بشری طاقت سے خارج ہے۔عالم الغیب صرف وہی ہے جس میں اس کی حقیقت پائی جائے۔وہ صرف اللہ ہے۔
اس کی حقیقت چار باتیں ہیں (۱) ذاتی ہو کسی کی عطا نہ ہو۔(۲) یقینی ہو ظن وگمان کا اس میں دخل نہ ہو (۳) محیط ہو ایک ذرہ بھی اس کے علم سے باہر نہ ہو۔اصول وفروع کو جامع ہو (۴) مستقل ہو۔غیب کی ہر بات ہر وقت معلوم ہو۔

ان میں سے کوئی ایک شرط بھی نہ ہو تو وہ ہستی عالم الغیب نہیں ہو سکتی۔جیسے ارب روپے میں سے ایک روپیہ بھی کم ہو تو وہ 99 کروڑ 99 لاکھ 99 ہزار 9 سو 99 روپے تو ہو سکتے ہیں ارب نہیں۔ اگرچہ عرف میں اسے ارب سمجھا جائے۔حقیقت میں نہیں ہے۔اور نام تو حقیقت کے پیش نظر ہی ملتا ہے۔

حضور ﷺ کا علم ذاتی نہیں عطائی ہے۔محیط اور تفصیلی نہیں غیب کا کچھ حصہ ہے۔اصول آپ کو بتائے نہیں گئے۔اور جو دیا گیا وہ جزئیات ہیں۔مخلوق کی نسبت سے دیکھا جائے تو آپ کا علم حد شمار سے باہر ہے۔لیکن اس علم کے مقابلے میں کچھ نہیں جو اللہ کا خاصہ ہے۔یہ اللہ کی صفت ہے جس کی کوئی حد نہیں۔جب علم محیط تفصیلی آپ کو حاصل نہیں تو آپ اس میں مستقل بھی نہیں۔ یہ آپ کی دائمی صفت نہیں جو آپ ہر وقت غیب سے باخبر رہیں۔حسب مشیت جب جو آپ کو بتایا گیا۔وہ آپ نے جان لیا اور جو نہ بتایا گیا وہ معلوم نہ ہو سکا۔اسی وجہ سے مفسرین آپ کے مبارک علم کو علم المغیبات (غائب شدہ باتوں کا یا کچھ جزئیات علم) کہتے ہیں۔علم الغیب (اصول وفروع کا علم) نہیں کہتے اور جزئیات کا علم ہی قرآن کی اصطلاح میں غیب کی خبر یا اطلاع یا اظہار ہے۔

علم غیب کی اقسام

علم الغیب دو طرح کا ہے۔
ایک وہ جس پر دلیل قائم ہو۔وحی کے ذریعے اسکا اظہار کر دیا گیا ہو یا مشاہدہ وتفکر سے دل میں حاصل کیا جا سکتا ہو۔مثلاً اللہ کا وجود جو اگرچہ غیب ہے۔لیکن کائنات اس پر دلیل ہے۔یا قیامت کا آنا جس پر کائنات اور وحی دونوں دلیل ہیں۔دوسرے لفظوں میں علم معرفت وشریعت جو آپ کو بتمام وکمال حاصل ہے۔

دوسرا وہ جس پر دلیل نہ ہو۔جیسے قیامت کب آئے گی یا دیگر وہ اصول جو پہلے بتائے جا چکے ہیں۔ان کی کچھ جزئیات ہی آپ کو بتائی گئیں۔چونکہ آپ میں اس نام کی حقیقت نہیں پائی جاتی ،لہٰذا آپ کو عالم الغیب کہنے میں ذہرا گناہ ہے۔اس لفظ کا آپ کے لئے استعمال جو اللہ

کے لئے مخصوص ہے اور آپ پر جھوٹا بہتان کہ آپ عالم الغیب ہیں یعنی اصول و فروع کو جانتے ہیں۔ کاش

کہنے والا اپنی اصطلاح مقرر کر کے کتنی ہی محبت اور اخلاص سے آپ کو یہ نام دے بہر حال یہ آپ کی عبدیت پر بہتان اور موہم شرک ہے۔ اسی لئے چودہ صدیوں میں اہلسنت والجماعت کا ایک فرد بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس نے آپ کو عالم الغیب کہا ہو۔ بالفرض یوں کہا جائے آپ ماکان وما یکون کا علم رکھتے ہیں۔ اور یہ علم الٰہی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ اتنے علم پر بھی کوئی دلیل نہیں۔ تب بھی آپ پر اس نام کا اطلاق درست نہیں کیونکہ پھر بھی آپ کا علم اللہ کے غیب کا کچھ ہی حصہ عطائی اور غیر مستقل ہے۔ اور یہ نام اس کے لئے مخصوص ہے جس میں اس کی حقیقت موجود ہو اور وہ صرف اللہ ہے۔ اس باب میں تفاصیل تو بہت ہیں لیکن صاحب فہم و شعور کے لئے یہ بھی کافی ہیں۔

مفسر ابن عاشور فرماتے ہیں۔

والمعنی لا اقول لکم اعلم الغیب ای علما مستمرا ملازما لصفة الرسالة فاما اخباره عن بعض المغیبات فذالك عند ارادة الله اطلاعه علیه بوحی خاص کما قال تعالی عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه احدا الا من ارتضی من رسول وهو داخل تحت قوله ان اتبع الا مایوحی الی (الانعام)

میں نہیں کہتا کہ میں عالم الغیب ہوں۔ اس کا معنی ہے ایسا علم جو دائمی اور صفت رسالت کے لئے لازم ہو وہ میں نہیں جانتا۔ رہا غیب کی کچھ باتیں بتانا تو یہ اللہ کے ارادے سے ہے۔ وحی کے ذریعے اللہ اس کی اطلاع کرتا ہے۔ جیسا کہ اللہ نے فرمایا۔ وہ عالم الغیب ہے بس پسندیدہ رسول کے سوا اپنے غیب پر کسی کو اطلاع نہیں دیتا۔ اور وہ علم بھی اس قول میں داخل ہے۔ میں تو صرف اس کی پیروی کرتا ہوں۔ جو مجھ پر وحی کیا جاتا ہے۔

سید الکتب

سید الرسل محمد ﷺ کو اللہ نے قرآن مجید عطا فرمایا۔ قرآن سید الکتب اور تمام کتابوں کا سردار ہے۔ آپ ﷺ عبد مطلق ہیں۔ قرآن کتاب مطلق ہے۔ آپ کی رسالت کافۃ للناس ہے۔ قرآن ھدی للناس ہے۔ اسے لیلۃ القدر میں اتارا۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ۔ ہم نے اس کو اتارا شب قدر میں

جبرائیل لے کے آئے۔

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِیْمٍ۔ مقرر یہ کہا ہے ایک بھیجے ہوئے عزت والے کا۔

انہوں نے اسے آپ کے دل پر وحی کیا۔

نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ سو اس نے تو اتارا ہے یہ کلام تیرے دل پر اللہ کے حکم سے۔

اس کی زبان فصیح عربی ہے۔

قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ۔ قرآن ہے عربی زبان کا جس میں کجی نہیں۔

اس میں فلاح کے متعلق ہر چیز کی تفصیل ہدایت کی راہ نمائی رحمت اور نصیحت ہے۔

وَتَفْصِیْلَ كُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًی وَّرَحْمَةً وَّذِكْرٰی لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ۔

اور بیان ہر چیز کا اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں۔

اسے نازل کرنے کا مقصد کیا ہے؟

لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِهٖ وَلِیَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔

تا کہ دھیان کریں لوگ اس کی باتیں اور تا سمجھیں عقل والے

حقیقی کتاب:

اس لاریب کتاب کے بارے میں فرمایا

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ۔ اتاری تجھ پر کتاب سچی (ال عمران۔۳)

مفسر حقی فرماتے ہیں۔

ای القران عبر عنه باسم الجنس ایذانا بکمال تفوقه علی بقیة الافراد فی حیازة کمالات الجنس کانه هو الحقیق بان یطلق علیه اسم الکتاب (ال عمران)	الکتاب سے مراد قرآن ہے۔اسم جنس سے اسکو تعبیر کرنا اس کے کمال کا بیان ہے۔باقی کتابوں پر اس کی فوقیت کا اظہار ہے کہ اس نے ان کے تمام کمالات کو جمع کر لیا ہے۔گویا حقیقت میں قرآن ہی ہے۔جس پر کتاب کا نام بولا جائے

مزید ارشاد فرمایا۔

ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ۔ اس کتاب میں کچھ شک نہیں (البقرہ۔۲)

تفسیر السعدی میں ہے۔

ای هذا الکتاب العظیم الذی هو الکتاب علی الحقیقة المشتمل علی مالم تشتمل علیه کتب المتقدمین والمتاخرین من العلم العظیم والحق المبین	یعنی یہ عظیم کتاب ہی حقیقت میں کتاب کہلانے کی حقدار ہے۔یہ ایسے عظیم علم اور واضح حق پر مشتمل ہے جس سے پہلوں پچھلوں کی کتابیں خالی ہیں

ذیشان کتاب:

یہ کتاب ذی شان ہے۔اللہ کی برہان ہے۔تراشیدہ ہیروں کا ہار ہے۔تراشیدہ موتیوں کی لڑی ہے۔خوبیوں کا مجموعہ ہے۔اس کے اوصاف کثیر ہیں۔کمالات بے انتہا ہیں۔یہ علوم کا منبع ہے۔یقین کا سرچشمہ ہے۔اس میں معرفت کے ذخیرے ہیں۔حق اس کا ساتھی ہے۔سچ اس کا رفیق ہے۔توحید کا مخزن ہے۔شرک کا دشمن ہے۔نور کا خزینہ ہے۔نجات کا سفینہ ہے۔بار بار پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا۔سامعین اس سے سیر نہیں ہوتیں۔علماء کا اس سے جی نہیں بھرتا۔اندھیرے اس سے چھٹ جاتے ہیں۔شبہات کافور ہو جاتے ہیں۔کثافتوں کو دھو دیتا ہے۔کفر کی غلاظتیں صاف کر دیتا ہے۔وہم کے جالے اتار دیتا ہے۔شک کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔بادل

کی طرح گرجتا ہے۔بجلی کی طرح کڑکتا ہے۔کوندے کی طرح لپکتا ہے۔اس میں سمندروں کا تموج ہے۔دریاؤں کا تلاطم ہے۔جھیلوں کا سکون ہے۔جوئے رواں کی سبک خرامی ہے۔سیل رواں کی تندی ہے۔کہیں پایاب ہے۔کہیں بے پناہ ہے۔شعور سے ہم کلام ہوتا ہے۔لاشعور کو کھنگالتا ہے۔عقل سے خطاب کرتا ہے اور دماغ کے راستے دل میں اتر جاتا ہے۔اس کی باتوں میں رعب ہے۔تحکم نہیں۔تصلب ہے تعصب نہیں۔پختگی ہے ہچکچاہٹ نہیں۔اس کا موقف ٹھوس ہے۔دلائل سے اپنا آپ منواتا ہے۔ان دلائل کے مقدمات بدیہی ہیں فرضی نہیں۔فصاحت کا کمال ہے لفاظی نہیں۔جذبات کی رعایت ہے جذباتیت نہیں۔خود موثر ہے کسی کی تاثیر قبول نہیں کرتا۔یہ شعر نہیں لیکن ترنم میں اس سے بڑھ کے ہے۔جادو نہیں لیکن تاثیر میں اس سے زیادہ ہے۔بلکہ شعر اور جادو کا اس سے مقابلہ ہی نہیں۔جادو کی طرح ذہن کو جکڑتا نہیں اسے وسیع کرتا ہے۔اس کے الفاظ میں شکوہ ہے۔کلمات میں جلال ہے۔جملوں میں تلوار کی کاٹ ہے۔مضمون میں تازہ گلوں کی مہک ہے۔اس کی تلاوت زبان کو میٹھا اور سینے کو ٹھنڈا کرتی ہے۔اس کی سماعت کانوں میں رس گھولتی ہے۔اس کے الفاظ عربی سے ناواقف کو بھی سرور بخشتے ہیں۔اسے پڑھنے کے بعد تورات وانجیل کا مطالعہ کیا جائے تو لگتا ہے جنت سے زمین پر اتار دیا گیا۔تورات وانجیل اللہ کی کتابیں ہیں کلام نہیں۔یہ کتاب بھی ہے کلام بھی۔شاہوں کے شاہ کا یہ کلام کلاموں کا بادشاہ ہے۔ہر شک کا تریاق، ہر مرض کی دوا، ہر وہم کا علاج اور ہر سوال کا جواب ہے۔اس کی ہر بات حرف آخر ہے۔اس کے پیش کردہ انسانی فلاح کے اصول اٹل ہیں۔

ناصر الدین السعدی فرماتے ہیں

الذی هو اجل الکتب واعظمها المشتمل علی الحق فی اخباره واوامره ونواهیه فما اخبر به صدق وما حکم به فهو العدل مصدقا لما بین یدیه من الکتب السابقة فهو المزکی لها فما شهد له فهو	وہ کتاب جو کتابوں میں جلیل اور پر عظمت ہے اپنی خبر امر اور نہی میں حق پر مشتمل ہے۔اس نے جو خبر دی وہ سچ ہے۔جو حکم دیا وہ عدل ہے۔پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ان کا تزکیہ کرتا ہے۔جس کے حق میں گواہی دے وہ مقبول ہے۔جس کو رد کر

المقبول وما رده فهو المردود وهو المعظم ـ وہ مردود ہے۔ تمام انبیاء کا جن مطالب پر
لهم جميع المطالب التي اتفق عليها ـ اتفاق ہے ان میں قرآن سابقہ کتابوں کے مطابق
الرسول وهي شاهدة له بالصدق ـ ہے۔ اور وہ اسکی سچائی کی گواہ ہیں۔ (آل عمران ۔۳)

اس کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ آج تک محفوظ ہے۔ یاد کرنے میں آسان ہے۔ بے مثل اور لاثانی ہے۔ اپنی صداقت اور سچائی پر خود گواہ ہے

قرآن کی مثل اور مقابلے کا طریقہ

اس کی سچائی پر کسی کو شبہ ہے تو اسے چھان بین کی ضرورت نہیں۔ وہ بلا وجہ اپنا خون نہ جلائے۔ مقابلے کا طریقہ یہ خود بتاتا ہے۔ آؤ مرد میدان بنو جیسا میں ہوں ویسا کلام لے آؤ۔ پوری کتاب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو دس سورتیں ہی لے آؤ۔ یہ بھی مشکل ہے تو مجھ جیسی ایک سورہ ہی لے آؤ۔ ابن کثیر میں ہے

... مثل ما جاء به ان زعمتم انه من ... اگر تم سمجھتے ہو رسول صلی اللہ علیہ وسلم جو کلام
عند غير الله فعارضوه بمثل ما جاء ... پیش کر رہے ہیں یا اللہ کا نہیں تو اس کے مقابلے
به واستعينوا على ذلك بمن شئتم ... میں اس جیسا کلام لے آؤ۔ اور اللہ کے علاوہ ہر
من دون الله ... اس کی مدد لے لو جو تم چاہو۔ (بقرہ ۔۲۳)

یہ مثلیت سائنس اور طرز میں نہیں کیونکہ انسانوں میں بھی کسی کا انداز اپنانا مشکل ہوتا ہے۔ یہ مثلیت فصاحت و بلاغت میں ہے۔ حسن نظم میں ہے۔ ایسا کلام جس کی ترتیب بدیع ہو۔ تسلسل عجیب ہو۔ اسلوب میں ندرت و ایجاز ہو۔ اس کے معانی مضبوط ہوں۔ تبدیلی اور تحریف سے محفوظ ہو۔ غیب کی خبریں دینے میں سچا ہو۔ امر، نہی، وعد، وعید، قصص، حکم، مواعظ، امثال، اخبار، قوانین، آداب، اخلاق اور دیگر کئی علوم کو جامع ہو۔ اور دیگر ان باتوں میں مثلیت جو گزر چکی ہیں۔

قرآن میں بہت سی باتیں ہیں جو فصاحت میں کمی کا تقاضا کرتی ہیں۔ ان کے ہوتے کوئی کلام فصیح نہیں ہو سکتا اس کے باوجود قرآن فصاحت کی انتہا تک پہنچا ہوا ہے۔ اہل عرب کی فصاحت میں زیادہ حصہ مشاہدات کا تھا مثلاً اونٹ، گھوڑے، جنگ، شراب کے برتن، عورتوں کی

خوبیاں وغیرہ۔ قرآن میں یہ باتیں نہیں پھر بھی اس کی فصاحت معجزہ ہے۔ شعر کے بارے میں کہا گیا ہے

... الكذبه ... جس شعر میں جتنا جھوٹ ہوگا وہ اتنا ہی شیریں اور خوشگوار ہوگا۔

اللہ نے سچائی کی پابندی کی۔ جھوٹ سے بالکل گریز کیا۔ پھر بھی اسکی اثر آفرینی معجزہ ہے۔ حالانکہ جس شاعر نے سچ کی پابندی کی اس کے شعر درجۂ فصاحت سے گر گئے۔ مثلاً لبید بن ربیعہ رضی اللہ عنہ اور حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو ان کے اشعار بلحاظ فصاحت عمدگی میں پرانے اشعار سے کم ہو گئے۔ قصیدے میں دو چار اشعار ہی فصیح ہوتے ہیں۔ باقی بھرتی ہوتی ہے۔ قرآن ایسا نہیں۔

لانه بجملة فصيح ـ کیونکہ یہ سارے کا سارا یکساں فصیح ہے۔

ہر وہ شخص جس نے کسی خوبی میں فصیح شعر کہا جب اسی بات کی تکرار کی تو اس وصف میں دوسرا کلام پہلے کلام کے برابر نہ ہو سکا۔ قرآن میں تکرار کی کثرت ہے پھر بھی کہیں فرق نہیں۔ ہر ایک نہایت فصیح ہے۔ ہر شاعر کے اشعار کسی خاص وصف یا فن میں حسین اور باقی میں بودے ہوتے ہیں۔ قرآن میں کئی علوم و فنون جمع ہیں۔ پھر بھی کہیں کمزوری نہیں۔

حضور ﷺ کی صداقت پر گواہ

اس کے الفاظ میں ابہام نہیں۔ زبان میں اجنبیت نہیں۔ ترکیب میں خرابی نہیں۔ جملے سلیس ہیں۔ عبارت رواں ہے۔ بیان بلیغ ہے۔ شروع سے آخر تک کلام کا زور کہیں ٹوٹتا نہیں۔ ہر جگہ آہنگ اور ردھم مضمون کے مطابق ہے۔ جملوں کی ڈور میں پروئے ہوئے الفاظ یوں جگمگاتے ہیں جیسے سورج کے سامنے ہیروں کی لڑی جگمگاتی ہے۔ حالانکہ اس نے حقائق سے بحث کی۔ کہیں خشک ترین موضوعات پر بات کی۔ سچائی کی رعایت کی اور مختلف علوم کو مس کیا ہے۔ یہ عمرانیات کی کتاب نہیں۔ معاشیات کے لیکچر نہیں۔ جغرافیے کے مقالے نہیں۔ سائنس وغیرہ کا بیان نہیں۔ اس نے مختلف علوم کی باتیں اپنے موضوع کی مناسبت سے ذکر کیں لیکن صدیوں کی فکر اور برسوں کے تجربے جس نتیجے پر پہنچے قرآن وہ باتیں پہلے ہی کہہ چکا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں۔

دلالۃ القران علی صدق محمد صلی	قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی پر تین
اللہ علیہ وسلم من ثلاثۃ اوجہ اولہا	طرح سے دلیل ہے۔ اول فصیح ہے۔ دوم
فصاحۃ وثانیہا اشتمالہ علی الاخبار	غیب کی خبروں پر مشتمل ہے۔ سوم اس
عن الغیوب وثالثہا سلامۃ عن الاختلاف	میں اختلاف نہیں (النساء۔۸۲)

پھر فرماتے ہیں۔ اس میں اختلاف نہ ہونے کی تین وجہ ہیں۔

(۱) اس نے غیب کی جو خبریں دیں ان میں سچا ہے۔ (۲) قرآن بڑی کتاب اور مختلف علوم وفنون پر مشتمل ہے۔ اگر اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں متناقض بیانات ہوتے۔ (۳) فصاحت میں حد کمال تک ہے۔ کہیں کوئی لفظ بھی ایسا نہیں جو رکیک کہا جائے۔ انسان اگرچہ فصاحت وبلاغت کی انتہا تک پہنچ جائے۔ مختلف علوم ومعانی پر مشتمل کوئی بڑی کتاب لکھے گا تو لازماً اس کے کلام میں فرق ہوگا۔ کہیں مضبوط کہیں کمزور کہیں متین اور کہیں اترا ہوا ہوگا۔

قرآن کے نام

قرآن میں اللہ نے اس کے مختلف نام ذکر فرمائے ہیں۔ ناموں کی کثرت اس کے کمالات کی نمائندہ ہے۔ امام رازی نے مندرجہ ذیل نام ذکر کئے۔

(۱) الکتاب۔ کتاب مکتوب کے معنی ہے یعنی لکھا گیا۔

لانہ اجتمع فیہ جمیع العلوم	کیونکہ اللہ نے اس میں مختلف علوم جمع فرمائے

(۲) القرآن۔

وسمی القران قرانا لان الحروف	حروف سے کلمات، کلمات سے آیات کو
جمعت فصارت کلمات والکلمات	جمع کرنے سے سورتیں بنیں۔ سورتوں کو
جمعت فصارت ایات والایات	جمع کرنے سے قرآن بنا۔ پھر اس میں
جمعت فصارت سورا والسور جمعت	اولین وآخرین کے علوم جمع کئے گئے۔
فصارت قرانا ثم جمع فیہا علوم	اسی لئے قرآن کو قرآن کہتے ہیں۔

الاولین والاخرین	(کہ یہ جوڑنے والا ہے)

(۳) الفرقان۔ فرق کرنے والا۔ کیونکہ حلال حرام اور حق وباطل میں فرق کرتا ہے۔

(۴) الذکر یعنی نصیحت

انہ ذکر من اللہ تعالی ذکر بہ	اللہ کی طرف سے نصیحت ہے۔ اسکے ساتھ اللہ نے بندوں
عبادہ فعرفہم تکالیفہ واوامرہ	کو نصیحت کی پس انہوں نے اس کے احکام کو جان لیا۔

(۵) الشفاء۔

والقران یزول کل شک من القلب	قرآن پاک کے ساتھ دل سے ہر شک زائل ہو جاتا ہے۔

(۶) الروح۔ لانہ سبب لحیاۃ الروح — کیونکہ یہ روح کی زندگی کا سبب ہے

(۷) النجوم۔ لانہ نزل نجما نجما — کیونکہ یہ تھوڑا تھوڑا کر کے اترا

(۸) البرہان۔

وکیف لایکون برہانا وقد عجزت	اور یہ کیسے برہان نہ ہو حالانکہ اس نے
الفصحاء عن ان یأتوا بمثلہ	فصحاء کو اپنی مثل لانے سے عاجز کر دیا۔

(۹) المہیمن۔ نگران

وہو ماخوذ من الامین لانہ من تمسک	اور یہ امین سے ماخوذ ہے۔ کیونکہ جس نے قرآن کو
بالقران امن الضرر فی الدنیا والاخرۃ	پکڑا وہ دنیا وآخرت کے نقصان سے مامون ہو گیا۔

(۱۰) النور۔

وسماہ نورا لانہ سبب	اور اس کا نام نور رکھا کیونکہ یہ دل میں
لوقوع الایمان فی القلب	نور ایمان پیدا کرنے کا سبب ہے۔

(۱۱) العزیز۔

وللعزیز معنیان القاہر والقران	عزیز کے دو معانی ہیں۔ غالب اور قرآن
کذالک والثانی ان لایوجد مثلہ	اسی طرح ہے۔ دوسرا جس کی مثل نہ ہو۔

(۱۲) الہدی۔ الہادی (۱۳) صراط مستقیم (۱۴) الحبل

(۱۵) الرحمة (۱۶) القصص (۱۷) البیان التبیان المبین (۱۸) البصائر (۱۹) الفصل (۲۰) المثانی (۲۱) النعمه (۲۲) التنزیل (۲۳) الموعظه (۲۴) الحکم والحکمة والحکیم والمحکم (۲۵) بشیر و نذیر (۲۶) قیّم (۲۷) الحق (۲۸) الکریم (۲۹) العظیم

مبارک کتاب

(۳۰) مبارک۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

والقران مبارك لانه يدل على الخير	اور قرآن مبارک ہے۔ کیونکہ بڑی خیر پر دلالت کرتا ہے
العظيم فالبركة كائنة به فكان البركة	پس برکت اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہے۔ گویا کہ برکت
جعلت في الفاظه ولان الله تعالى قد	اس کے الفاظ میں رکھ دی گئی اور اس لئے کہ اللہ نے اس
اودع فيه بركة لقارئه المشتغل به بركة	میں اس کے پڑھنے والے اور مشغول رہنے والے کے
في الدنيا والاخرة ولانه مشتمل على ما	لئے دنیا و آخرت میں برکت رکھی ہے۔ نظری اور عملی
في العمل به كمال النفس وطهارتها	معارف کیساتھ قرآن ایسے عمل پر مشتمل ہے۔ جس
بالمعارف النظرية ثم العملية فكانت	کے ساتھ نفس کا کمال اور اس کی طہارت وابستہ ہے۔
البركة ملازمة لقرائته وفهمه	پس برکت اس کے پڑھنے اور سمجھنے کے ساتھ
(الانعام ۹۲)	ہے۔

ہر طبقے کے ساتھ اسکی برکت کی نوعیت الگ الگ ہے۔ مفسر حقی فرماتے ہیں

مبارك على العوام بان يدعوهم	عوام کے لئے اس طرح مبارک ہے کہ انہیں ان کے
الى ربهم وعلى الخواص بان	رب کی طرف بلاتی ہے۔ خواص کے لئے اس طرح
يهديهم الى ربهم وعلى خواص	کہ انہیں رب کی طرف چلاتی ہے۔ خواص الخواص
الخواص بان يوصلهم الى ربهم	کیلئے اس طرح کہ انہیں رب سے ملاتی اور اللہ کے
ويخلقهم باخلاقهم وفي كتاب	اخلاق میں رنگتی ہے۔ اور محبوب کی کتاب میں

المحبوب شفاء لما في القلوب — دلوں کی بیماریوں کی شفاء ہے۔ (الانعام۔ ۹۲)

مقام مصطفیٰ ﷺ: اس میں مقام مصطفیٰ خود ظاہر ہے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ جس کلام کا بوجھ پہاڑ برداشت نہ کر سکیں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں اسے سہارنے کے لیے کتنے مضبوط اور طاقتور دل کی ضرورت ہوگی؟ اس کا تصور ہی کیا جاسکتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کسی دل میں تاب ہی نہیں تھی جو اس پُر عظمت کلام کا نزول برداشت کر سکتا۔ کسی سینے میں ہمت ہی نہیں تھی جو اس بھاری کلام کا بوجھ اٹھا سکتا یہ شرف میرے نبی کے حصے میں آیا۔ اس فضیلت کے لیے اللہ نے میرے مصطفیٰ کا انتخاب کیا۔ اس کا نزول آپ کی قوت قلب اور مقام معرفت کی روشن دلیل ہے۔ اس پیغمبر کی کیا شان ہوگی جس کا مبارک دل اس کے نزول کے لئے، مبارک سینہ اس کے تحمل کے لئے اور مبارک زبان اس کی تلاوت و بیان کیلئے چنی گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں

یہ رسول کریم ہی کا ظرف تھا جو اس پر عظمت وجلال وحی کے بار کو برداشت کر سکے۔ اور پھر اسی کے ذریعے انہوں نے عرب کے پتھر دل والوں کو موم کر دیا۔ ایک سیلاب رواں کر دیا۔ دلوں میں آگ لگادی۔ دماغوں میں انقلاب برپا کر دیا (ماجدی۔ ص 12۔ ج 1)

نبی القبلتین ﷺ

کعبہ کی طرف رخ کرنا ایسی فضیلت ہے۔ جو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کے لئے ذخیرہ کر رکھی تھی۔ یہ اللہ کی عطا ہے لیکن بلا سبب و بلا حکمت نہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت کو اللہ نے عالی کمالات اور اعلیٰ اوصاف سے نوازا۔ ان کی وجہ سے بجا طور پر وہ ابراہیمی ملت کے اس شعار کی طرف راہ نمائی اور اس نشانی کی یافت کے مستحق تھے۔ اللہ نے جو بلندیاں انہیں عطا کیں ان کے مناسب یہی تھا کہ کعبہ ہی انکا قبلہ ہو۔

کعبہ کی شان

اور کیوں نہ ہو کعبہ بجائے خود فضل و شرف والا ہے۔ شش جہات میں اسی جہت کو اللہ نے فضل و کمال عطا فرمایا۔ اپنے فضل و شرف اور مرتبے کے لحاظ سے بجا طور پر خاتم المساجد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کعبہ بھی سردار ہے اور مستقبل بھی سردار۔ یہ جہت بھی معظم و مکرم ہے اور مستقبلین بھی معظم و مکرم۔ یہ برکتوں کی آماجگاہ ہے۔ فضائل کا منبع ہے۔ لوگوں کا مرجع ہے۔ ان کے قیام کا ذریعہ ہے۔ ان کی دینی اصلاح کا سبب اور دنیاوی فائدوں کا واسطہ ہے۔ تقویٰ اس گھر کی اساس ہے۔ یہ وہ پہلا گھر ہے جس کی بنیاد توحید ہے۔ اس پر ہیبت و جلال کے سائے پھیلتے ہیں۔ جود و عطا کے بادل امڈ امڈ کر آتے ہیں۔ یہاں لحظہ لحظہ داد و دہش کی بارش برستی ہے اور لمحہ لمحہ رحمتیں پھوار بن کر اترتی ہیں۔ یہاں مغفرت و بخشش کے موتی لٹائے جاتے ہیں۔ اور کثرت ثواب و بلندی درجات کے انعام سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ کعبہ وہ نگینہ ہے جسے زمین کی انگشتری میں لگا کر کائنات کی انگلیاں سجائی گئیں۔ یہ انوار کا گڑھ اور اللہ کی تجلیوں کا مہبط ہے۔

تحویل قبلہ

جہت کعبہ اگرچہ تمام انبیاء کے لئے قبلہ رہی لیکن ان کی امتیں اس قبلہ پر نہ رہیں۔ یا تو وہ مختار

تھیں اور اپنے اختیار سے دوسری جگہوں کو قبلہ بنایا۔ یا بعد میں اس حکم الٰہی کو بدل کر اپنے لئے الگ قبلہ تجویز کیا۔ یا ان کے لئے بطور قبلہ کوئی جہت متعین نہ کی گئی۔ وجہ جو بھی ہو بہر حال اس عظمت و حرمت والے گھر کو قبلہ بنانے کی فضیلت سے محروم رہیں۔

حضور ﷺ اور آپ کی امت کے ساتھ اللہ نے سب سے جدا اور ممتاز معاملہ کیا۔ چنانچہ مکہ میں نماز فرض ہوئی تو کعبہ قبلہ مقرر ہوا۔ بعد از ہجرت یا اس سے کچھ پہلے بیت المقدس کو قبلہ بنا دیا گیا۔ سترہ اٹھارہ ماہ اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھی گئی۔ اور رجب کی کسی تاریخ کو تحویل قبلہ کی آیات نازل ہوئیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم بنو سلمہ کی مسجد میں نماز ظہر پڑھا رہے تھے۔ دوران نماز ہی آپ اور آپ کے ساتھیوں نے رخ پھیر کر کعبہ کی طرف کر لیا۔ اس جگہ مسجد ابھی تک موجود ہے جسے مسجد قبلتین کہا جاتا ہے۔ حضور ﷺ کو اللہ نے دو قبلوں کی سعادت بخشی۔ **نبی القبلتین** بنایا۔ اور آپ کے توسط سے آپ کی امت بھی دو قبلوں والی امت بنی۔

آپ کے لئے ایک جہت متعین کی۔ کعبہ کو آپ کا قبلہ بنایا۔ پھر باقاعدہ خطاب کے ساتھ آپکی امت کو بھی اس حکم میں شامل کیا۔ یہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی نسبت مسلمانوں کی طرف کر کے اس کے ساتھ ان کے خاص تعلق کا ذکر بھی کیا اور فرمایا ابھی بے وقوف لوگ کہیں گے

مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ۔ کس چیز نے انہیں ان کے قبلے سے پھیر دیا۔

ابن عاشور قبلتھم کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

واضافة القبلة الى ضمير المسلمين للدلالة على مزيد اختصاصهم اور قبلہ کو مسلمانوں کے ساتھ منسوب کرنا اس کے ساتھ ان کے زیادہ خاص تعلق پر دلالت کرتا ہے (البقرۃ)

حجیت حدیث

ضمنی طور پر عرض ہے تحویل قبلہ کے حکم سے حدیث حجت ہونے کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم اللہ نے دیا تھا۔ آپ نے یہ کام اپنی رائے یا مرضی سے نہیں کیا۔ قرآن مجید سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ فرماتے ہیں۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا جس قبلہ پر آپ تھے یہ ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا

لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ — تا کہ ہم جان لیں کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔
عَلٰى عَقِبَيْهِ — اور کون اپنی ایڑیوں کے بل پھرتا ہے۔(بقرہ)

اس میں اللہ نے واضح فرمایا دیا آپ کے لئے مسجد اقصیٰ کو قبلہ کی حیثیت ہم نے دی۔ مزید فرمایا

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ — بیشک ہم دیکھتے ہیں بار بار اٹھنا تیرے منہ کا آسمان کی طرف
فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا (بقرہ) — سو البتہ پھیریں ہم تجھ کو جس قبلہ کی طرف تو راضی ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے تحویل قبلہ کے لئے آپ حکم کے منتظر تھے۔ اسی انتظار میں مبارک نگاہیں آسمان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کعبہ کی طرف از حد میلان ہونے کے باوجود آپ تبدیلی قبلہ کے مجاز نہیں تھے۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ مامور ہوں۔ اور اس میں اجتہاد کا دخل نہ ہو۔ معلوم ہوا مسجد اقصیٰ کی طرف بھی آپ کا رخ اللہ کے حکم سے ہوا لیکن پورے قرآن میں کہیں اس حکم کا ذکر نہیں۔ حالانکہ اللہ خود فرما رہا ہے بیت المقدس کو بھی ہم ہی نے قبلہ بنایا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے قرآن کے علاوہ بھی آپ پر کوئی وحی کی گئی۔ جو اللہ کا حکم بھی ہے اور سب پر حجت بھی۔ یہی وہ وحی ہے جسے پوری امت وحی غیر متلو اور حدیث رسول ﷺ کہتی ہے۔

آپ کو اور آپ کی اُمت کو استقبال کعبہ کا پابند کرنا بہت بڑی فضیلت ہے۔ یہ تب صحیح سمجھ میں آئے گی جب قبلہ کی حقیقت، اہمیت، ضرورت اور کعبہ کی وجہ ترجیح معلوم ہوگی۔

قبلہ کی حقیقت :

قبلہ سمت توجہ کو کہتے ہیں۔ جس کی طرف انسان اپنا رخ کرتا ہے۔

القبلة هي الجهة التي يستقبلها — قبلہ سے وہ سمت مراد ہے۔ انسان جس کے سامنے
الانسان (رازی۔ البقرہ) — اپنا چہرہ کرتا ہے۔

قبلہ کسی قوم اور ملت کا مرکز توجہات ہوتا ہے۔ پوری قوم اور ملت پر اس مرکز کے اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے کسی قوم کا ایک عمومی اور مخصوص مزاج بنتا ہے۔ دوسری طرف ہر فرد یا ملت کے کچھ مخصوص عقائد و نظریات ہوتے ہیں۔ فرد یا ملت کی پوری زندگی انہی کے دائرے میں گھومتی ہے۔ انکا مرکز توجہ انہیں نظریات کا آئینہ دار اور مخصوص عقائد کا غماز ہوتا ہے۔ کوئی آتش پرست

ہے اور اس کا قبلہ آگ ہے۔ کوئی سورج پرست ہے اور اس کا قبلہ سورج ہے۔ یہ ان کی مظاہر پرست فطرت کو ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے یہ شخص مخلوق کا غلام، محدود سوچ کا مالک، ظاہر بین اور ان حقیر چیزوں سے خائف ہے۔ کسی کا قبلہ خود تراشیدہ بت ہیں۔ جو اس کی صنم پرستی کا اظہار ہیں۔ صنم پرست حماقت اور بیوقوفی میں مظاہر پرستوں سے بھی کمتر ہیں۔ کسی کا قبلہ مقدس شخصیتوں کی نسبت سے ہوتا ہے۔ یہ ان کی شخصیت پرستی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ علامت ہے کہ ایسا شخص حق کا پیرو نہیں شخصیات کا پیروکار ہے۔ وہ صحیح ہوں یا غلط۔ حق پر ہوں یا باطل پر اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں۔ ہر قوم یا ملت نے اپنے لئے کوئی نہ کوئی قبلہ رکھا۔ ابتدا سے آج تک ایسے ہی ہو رہا ہے۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا (بقرہ۔۱۴۸)

اور ہر کسی کے واسطے ایک جانب ہے یعنی قبلہ کہ وہ منہ کرتا ہے اس طرف

تفسیر کبیر میں ہے۔

المراد لكل من اهل الملل وجهة — مراد یہ کہ اہل ملت میں سے ہر ایک کے لئے ایک سمت
قد اختارها اما بشريعة واما بهوى — ہے۔ جس کو اس نے اختیار کیا۔ یا تو اللہ کے حکم سے
(البقرہ) — یا اپنی خواہش سے۔

قبلہ کی ضرورت

قبلہ مقرر کرنا انسان کا طبعی اور فطرتی تقاضا ہے۔ جس کو مختار اور اپنا ملجا و ماوی سمجھا جاتا ہے انسان کا دل انکی طرف ہی جھکتا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے انہیں مرکز توجہ بنانا انسانی طبیعت کی چاہت ہے۔ اس سے واضح ہو گیا اصل قبلہ وہی ذات ہوتی ہے جس کے متعلق انسان کا یہ مذکورہ عقیدہ ہو۔ لیکن یہ فطری طلب کسی محسوس چیز کا تقاضا کرتی ہے۔ انسان چاہتا ہے معبود کا دربار ہو جہاں وہ حاضری دے۔ اس کا گھر ہو جہاں وہ پہنچے۔ اعضاء و جوارح سے اس کی تعظیم و تکریم کا اظہار کرے۔ ہاتھ پاؤں سے اس کی خدمت کرے۔ اس کے روبرو ہو۔ زبان سے اس کی مدح و ثنا کرے۔ مظاہر پرست جن کی پرستش کرتے ہیں انہی کو اپنا مرکز توجہ اور قبلہ بنا لیتے ہیں۔ اس کی

دو وجہ ہیں۔ ان کا اصل عقیدہ بھی انہی ہستیوں سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ چیزیں محسوس بھی ہوتی ہیں۔ صنم پرست جن طاقتوں کی عبادت کرتے ہیں عموماً وہ غیر محسوس یا غائب ہوتی ہیں۔ پھر وہ ان کے بت بنا لیتے ہیں۔ یہ شکلیں دراصل انہی طاقتوں کی علامت اور نشانی ہوتی ہیں۔ اس سے وہ چیز اپنی علامت کے ساتھ حس کے دائرے میں آجاتی ہے۔ ان کی سجدہ گاہ بظاہر مورتیاں اور بت ہوتے ہیں لیکن درحقیقت وہ ان غائب بزرگوں اور طاقتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے اللہ نے ان میں سے کسی کی سند نہیں اتاری۔

مومن کا اصل قبلہ اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی معبود اور مسجود ہے۔ لیکن فطرت سب کی یکساں ہے جو محسوس قبلے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس سے معبود کے استحضار میں قوت حاصل ہوتی ہے۔ جس سے عبادت اور بندگی میں خضوع اور جماؤ پیدا ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کس طرح یہ مطالبہ پورا کیا جائے؟ معبود تو غیر محسوس اور غیر مرئی ہے۔ سمت اور جہت سے منزہ ہے۔ تو دو ہی باتیں ممکن ہیں آزادی ہو جدھر جس کا منہ اٹھے اسی رخ پر عبادت شروع کر دے۔ یا ادراک کے لیے کوئی محسوس چیز اس کی علامت ہو۔ پہلی صورت میں یکسوئی اور خضوع تو کیا پیدا ہوتا الٹا پراگندگی اور انتشار پیدا ہو جاتا۔ یہی بات آگے بڑھ کر تفریق اور جھگڑے کا سبب بن جاتی۔ ہر ایک اپنے ہی رخ کو اولیت دیتا۔ جبکہ دین میں اتفاق، اتحاد اور نظم ایک مطلوب چیز ہے۔ لہٰذا دوسری صورت ہی بہتر ہے۔ اس کے ضمنی سوالات سے تعرض کیے بغیر بلا تفصیل عرض ہے

جب حواس کے ساتھ اللہ کا ادراک ممکن نہیں تو اس کیلئے کون سی چیز ہونی چاہیے؟ مخلوق میں سے کون ہے جو بندے کے نفس میں خالق کے استحضار و ادراک کا وسیلہ بننے کیلئے اولیٰ اور زیادہ بہتر ہے۔ یقیناً وہ مخلوق جس کا وجود صرف اس لئے ہوتا کہ اللہ کی توحید اور صفات کمال کا اظہار کر سکے۔ جس کی نسبت براہ راست اللہ کی طرف ہو۔ اللہ پر دلالت جس میں سب سے زیادہ ہو۔ استحضار کا وسیلہ بننے سے یہ وہم بھی پیدا نہ ہو کہ خود اس کی عبادت مقصود ہے۔ اور یہ وہ مساجد ہیں جن کی بنیاد ابراہیم علیہ السلام نے رکھی۔ انہیں ہر اس بات سے خالی رکھا جو ان کی عبادت کا وہم پیدا کرتی ہو۔ یہاں تک کہ ان کا نام بھی غیر اللہ کے نام پر نہیں رکھا۔ کعبہ ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی

مسجدوں میں سے پہلی مسجد ہے۔

وانه بناها للصلاة حولها	انہوں نے اس لئے بنائی کہ اس کے چوگرد نماز
(ابن عاشور۔ البقرۃ۔۱۴۲)	نماز ادا کی جا سکے

اللہ نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي	بے شک لوگوں کیلئے جو سب سے پہلا گھر
بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ	مقرر ہوا وہ یہی ہے جو مکہ میں ہے۔ (آل عمران)

پس قبلہ کے تقرر اور کعبہ کے تعین سے دو چیزیں حاصل ہوتی ہیں۔

(۱) تقاضائے فطرت کی تکمیل اور (۲) نظم و اتفاق۔

امام رازیؒ استقبال قبلہ کی حکمت بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں

جب کمزور بندہ بڑے بادشاہ کی خدمت میں پہنچا تو ضروری ہے کہ اپنا چہرہ اس کے سامنے کرے۔ اس کی طرف سے منہ نہ پھیرے۔ زبان کے ساتھ اس کی ثنا اور اعضاء جوارح سے اس کی خدمت اور اظہار عاجزی میں انتہائی کوشش کرے۔ پس نماز میں استقبال قبلہ بادشاہ کے روبرو ہونے کے قائم مقام ہے۔ قراءت اور تسبیح اسکی ثناء اور رکوع سجدہ خدمت کے قائم مقام ہے۔

قبلہ کی اہمیت

جیسا کہ ابھی بتایا جا چکا ہے۔ قبلہ فکر و نظر کا محور اور قلبی عقائد کا مظہر ہوتا ہے۔ قبلہ بنانا اس کے ساتھ گہرے باطنی تعلق کی علامت اور اندرونی جذباتی وابستگی کی نشانی ہے۔ یہ اس کی واقعی یا غیر واقعی تمام صفات کو ماننا ہے۔ ان تمام باتوں کا اعتراف کرنا ہے جن پر اس کی دلالت ہے۔ ان سب تصورات کو اپنانا ہے جو اس سے وابستہ ہیں۔ اور اس سے اعراض کرنا ان سب کی نفی ہے۔ اس سے قبلہ کے تعین اور تحویل کی اہمیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کسی قبلہ کے ساتھ وابستگی مخصوص عقیدے، خاص فکر، جدا تہذیب اور الگ ملت کے ساتھ منسلک ہونے کی علامت ہے۔ اسکی تحویل اور تبدیلی دراصل اس عقیدے، فکر، تہذیب اور ملت سے منہ پھیرنے کی نشانی ہے۔ الگ قبلے کا تعین مستقل دین کا اظہار ہے۔ اور سابق قبلے کے مقابل ان تمام تصورات کو قبول کرنے کا

اعلان ہے جو نئے قبلے سے وابستہ ہیں۔ اور خدانخواستہ غلط انتخاب

اٹھا تھا قدم غلط راہِ شوق میں ۔۔۔ منزل تمام عمر مجھے ڈھونڈتی رہی

کا مصداق ہے۔ اس کی اہمیت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ۔

(۱) اللہ نے تحویل قبلہ کا باضابطہ حکم دینے سے کئی رکوع پہلے ہی اس کیلئے مسلمانوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا شروع فرمادیا۔

(۲) تحویل کا حکم بعد میں دیا اور مخالفین کی طرف سے اٹھنے والے اعتراضات کا جواب پہلے دیکر مومنین کے ایمان کو مضبوط کیا۔ اور جواب کے ہتھیار سے انہیں لیس فرمایا۔ اعتراض کرنے والوں کو بے وقوف کہا۔ کیونکہ یہ ملت ابراہیمی سے اعراض کرنے والے ہیں۔ اور جواب دیتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۔۔۔ کہو مشرق اور مغرب اللہ کا ہے۔ (بقرہ۔۱۴۲)

مشرق اور مغرب سے مراد تمام جہات ہیں کہ یہ سب اللہ کی ہیں۔ جس طرف چاہے حکم دے۔ وہ خود جہت سے منزہ ہے۔ لہٰذا جہت کعبہ کی طرف اسکا حکم دینا صحیح ہے۔ تفسیر السمرقندی میں ارشاد ہے۔

یقول ان الصلاۃ الی بیت المقدس و ۔۔۔ چونکہ نماز بیت المقدس کی طرف ہو یا کعبہ کیطرف

الصلاۃ الی الکعبۃ للہ اذا کان بامر اللہ ۔۔۔ جب اللہ کے حکم سے ہے تو اللہ کے لئے ہے۔

اور فرمایا

وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ

اور اللہ جس کی چاہتا ہے راہنمائی کرتا ہے (بقرہ۔۱۴۲)

اشارة الی وجه ترجیح التولیة الی الکعبة علی التولیة غیرها

ان الفاظ میں جہت کعبہ کو دوسری جہات پر ترجیح دینے کا اشارہ ہے۔ (ابن عاشور)

(۳) تحویل قبلہ کی بابت احکام دو رکوعوں میں بیان فرمائے۔

(۴) انہی آیات میں فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَا ۔۔۔ اور جس قبلہ پر آپ پہلے تھے۔ وہ ہم نے تمہیں مقرر کیا

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ ۔۔۔ تھا، مگر اس واسطے تاکہ معلوم کریں کون تابع رہے گا

يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ۔۔۔ رسول کا، اور کون الٹے پاؤں پھر جائے گا۔ (بقرہ۔۱۴۳)

یعنی یہ کھرے اور کھوٹے کی شناخت کا معیار ہے۔

(۵) اس تحویل کو خود لکبیرۃ کہا۔ ای ثقیلة شاقة جدا ۔۔۔ یعنی بہت بھاری اور دشوار (البقاعی)

کعبہ کی وجہ ترجیح

جہتِ کعبہ کو قبلہ بنانا بلا سبب نہیں۔ اسے ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح نہیں۔ ابتدائے آفرینش سے ہی اللہ نے اس جہت میں کمالات رکھ دیے۔ ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ ۔۔۔ بے شک سب سے پہلا گھر جو مقرر ہوا لوگوں

بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔۔۔ کے واسطے یہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا

(آل عمران۔۹۶) ۔۔۔ اور ہدایت جہان کے لوگوں کو

اس آیت میں کعبہ کے کئی فضائل بیان فرمائے

(۱) پہلی فضیلت:

والواضع هو الله تعالی ۔۔۔ اسے جائے عبادت بنانے والا اللہ ہے۔

یہ شان کسی دوسری عبادت گاہ کے حصے میں نہیں آئی۔

(۲) دوسری فضیلت: تفسیر السعدی میں ہے

کونه اسبق بیوت العالم وضع فی الارض ۔۔۔ زمین پر جو گھر بنائے گئے یہاں سب میں پہلا ہے۔

پہلا ہونے کا مطلب علامہ آلوسی نے بیان فرمایا

المراد بالاولیة الاولیة بحسب ۔۔۔ اوّلیت سے مراد بلحاظ زمانہ اوّلیت ہے اور

الزمان وقیل بحسب الشرف ۔۔۔ کہا گیا شرف کے لحاظ سے اوّل ہے۔

بلحاظ زمانہ اول ہونے کا تقاضا ہے اس کا وجود تمام گھروں اور عبادت گاہوں سے پہلے ہو۔ جیسا کہ روایات میں ہے اسے وجود ملا پھر یہیں سے زمین کو اطراف میں پھیلایا گیا۔ گویا یہ مقام

زمین کا وسط اور ناف ہے۔ پہلے گزر چکا ہے بلحاظ زمانہ تقدیم و تاخیر میں کوئی ذاتی فضیلت نہیں۔ لہذا کوئی وجہ تقدیم کی ہونی چاہیئے۔ اور وہ اس کا شرف اور بزرگی ہے۔ اس لئے یہاں زمانے کے لحاظ سے اوّلیت کو شرف کے لحاظ سے اوّلیت لازم ہے۔ امام رازی کا فرمان ہے۔

لان المقصود الاصلی من ذکر	کیونکہ یہ اولیت ذکر کرنے کا اصلی
هذه الاولیة بیان الفضیلة	مقصد اس کی فضیلت بیان کرنا ہے۔

نتیجہ یہ نکلا یہ جگہ اللہ کے نزدیک شرف میں سب سے زیادہ تھی۔ لہذا وجود میں بھی اسے مقدم رکھا گیا۔ اور بلحاظ شرف اوّل ہونے کا مطلب ہے۔ عبادت کیلئے جو مقام تجویز کیے گئے ان میں سب سے افضل ہے۔ اگرچہ تعمیر میں موخر ہو۔ یوں بھی کہا جاسکتا ہے یہ مقام اور جہت ابتدا سے ہی فضل و شرف والی ہے۔ ہاں باقاعدہ تعمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں ہوئی۔

امام رازی بناؤ شرف ہر دو میں اول کہتے ہیں۔ انکی ایک دلیل یہ کہ یہ تمام انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ سورہ مریم آیت نمبر ۵۸ سے معلوم ہوتا ہے نماز تمام انبیاء کے دین کا اہم جزء رہی ہے۔ سبھی انبیاء اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہے۔

والسجدة لا بد لها من قبلة فلو كانت	اور سجدہ کیلئے قبلہ لازمی ہے۔ پس اگر شیعب،
قبلة شيث وادريس ونوح عليهم	ادریس اور نوح علیہ السلام کا قبلہ کعبہ کے علاوہ
السلام موضعا اخر سوى القبلة لبطل	ہوتو اللہ کا قول ان اول بیت وضع للناس باطل
قوله ان اول بيت وضع للناس فوجب	پڑتا ہے۔ پس یوں کہنا ضروری ہے کہ انبیاء
ان يقال ان قبلة اولئك الانبياء المتقدمين	متقدمین کا قبلہ کعبہ ہی ہے۔ اور یہ اس بات کی
هي الكعبة فدل هذا على ان هذه	دلیل ہے کہ یہ سمت ہمیشہ سے شرف و کرامت
الجهة كانت ابدا مشرفة مكرمة	والی ہے۔ (رازی۔ آل عمران)

دوسری دلیل کہ اللہ نے مکہ کو ام القریٰ (بستیوں کی ماں) کہا

وظاهر هذا يقتضى انها كانت سابقة	اس کا ظاہری تقاضا ہے جب سارے وجود
على سائر البقاع فى الفضل والشرف	دیا گیا فضل و شرف میں تمام جگہوں پر

مذ كانت موجودة	سبقت رکھتی ہے۔ (رازی)

تیسری دلیل کہ حضور ﷺ نے فرمایا۔

الا ان الله قد حرم مكة يوم خلق السموت	خبردار یقیناً اللہ نے ارض و سما اور شمس و قمر پیدا کرنے
والارض والشمس والقمر وتحريم مكة	کے دن مکہ کو حرمت والا قرار دیا۔ اور مکہ کی حرمت
لا يمكن الا بعد وجود مكة	اس کے وجود کے بعد ہی ممکن ہے۔ (رازی)

مفسر ابن عاشور نے للناس سے اہل کتاب اور مسلمان مراد لئے جو ابراہیم تک اصالت دین کے معترف اور اس پر متفق ہیں کہ کعبہ ہی پہلا قبلہ ہے۔ ان کے اعتراف سے لازم آیا کہ اللہ کی عبادت کیلئے جو گھر بنائے گئے یہ ان سب سے افضل ہو۔ فرماتے ہیں

وانما كانت الاولية موجبة التفضيل	اور اس کے سوا کچھ نہیں کہ اول ہونا افضل ہونے کو
لان مواضع العبادة لا تتفاضل من	واجب کرتا ہے۔ کیونکہ مقامات عبادت کو عبادت کے
جهة العبادة اذهى فى ذالك سواء و	رخ سے باہم دگر فضیلت نہیں ہوتی اس میں وہ برابر ہیں
لكنها تتفاضل بما يحف بذالك	لیکن عبادت کی جگہ اس پر فضیلت رکھتی ہے جو ان باتوں
من طول ازمان التعبد فيها ونسبتها	میں بلکا ہے۔ جیسے اس میں عبادت کا زمانہ طویل ہو اور
الى بانيها وبحسن المقصد فى ذالك	اپنے بانی کی نسبت سے اور بنیاد میں حسن نیت سے اور
وقد يقال فى مسجد قباء لمسجد	اللہ نے مسجد قبا کے بارے میں فرمایا۔ البتہ وہ مسجد جس
اسس على التقوى من اول يوم احق	کی بنیاد رکھی گئی تقویٰ پر وہ پہلے دن سے لائق ہے کہ تو
ان تقوم فيه وقد جمعت الكعبة جميع	کھڑا ہو اس میں۔ اور تحقیق کعبہ میں تمام خوبیاں جمع کر
هذا المزايا فكانت اسبق بيوت العبادة	دی گئیں۔ پس وہ اللہ کی عبادت کے گھروں میں سب
التحق (ال عمران)	سے پہلا ہے

خلاصہ یہ کہ اس کی تعمیر مقدم زمانہ میں ہو یا موخر۔ شرف میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں۔ اور اللہ کا مذکورہ فرمان اس بات کی دلیل ہے کہ

ان هذا البيت وضعه الله تعالى	بیشک اس گھر کو اللہ نے طاعات،

موضعا للطاعات والخيرات و	خیرات اور عبادات کے لئے مقرر کیا ہے
العبادة فيدخل فيه كون هذا	۔اس میں یہ بھی شامل ہے کہ یہ گھر نماز
البيت قبلة للصلاة وموضعا للحج	کا قبلہ اور حج کی جگہ ہے۔ایسا مکان ہے
ومكانا يزداد ثواب العبادات	جس میں عبادتوں اور طاعتوں کا ثواب
والطاعات فيه	بڑھا دیا جاتا ہے۔(رازی)

(۳) تیسری فضیلت:

انه مبارك والبركة كثرة الخير	بے شک یہ برکت والا ہے۔اور برکت بھلائی کی زیادتی اور ہمیشگی کا
ودوامه وليس في بيوت العالم	نام ہے۔اور دنیا کے گھروں میں کوئی ایسا نہیں جو برکت میں اس
ابرك منه ولا اكثر خيرا ولا ادوم	سے سوا ہو۔بھلائی میں اس سے بڑھ کر ہو۔ہمیشگی میں اس سے
ولا انفع للخلائق (السعدی)	فزوں ہو۔اور مخلوق کے لئے فائدے میں اس سے زیادہ ہو

برکت کے دو معنی ہیں۔(۱) النمو والتزايد۔بڑھوتری اور اضافہ (۲) البقاء والدوام۔بقا اور ہمیشگی اس کی برکت یہ کہ خطیات اور گناہوں کو مٹاتا ہے۔اس میں عبادت کا ثواب کئی گنا بڑھ جاتا ہے۔اس میں ہمیشہ عبادت جاری رہتی ہے۔کبھی رکوع،سجدہ یا طواف کرنے والوں سے خالی نہیں رہتا۔ان عبادات کیلئے بھی مخصوص ہے۔جو اس سوا کہیں انجام نہیں دی جا سکتیں۔ایسی جگہ ہے جہاں کچھ پیدا نہیں ہوتا۔پھر بھی دنیا کی ہر چیز میسر ہے۔اللہ فرماتے ہیں۔

يُجْبٰىٓ اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ کھنچے چلے آتے ہیں اس کی طرف میوے ہر چیز کے (القصص۔۵۷)

(۴) چوتھی فضیلت:

انه هدى ووصفه بالمصدر نفسه	وہ ہدایت ہے۔اور مبالغہ کیلئے ہدایت مصدر
مبالغة حتى كانه نفس الهدى	ذکر کیا۔گویا کہ وہ سراپا ہدایت ہے۔(السعدی)

زاد المسیر میں اس کے متعلق چار قول ہیں۔

(۱) ھدی بمعنی القبلة۔تمام جہاں کیلئے قبلہ (۲) ھدی بمعنی الرحمة۔عالمین کے لئے رحمت ہے۔(۳) ھدی بمعنی الصلاح۔اہل جہان کے لئے درستگی۔لان من قصده

صلحت حاله عند ربه اس لئے کہ جس نے اس کا ارادہ کیا اس کی حالت اپنے رب کے پاس درست ہو گئی۔(٤) ھدی بمعنی البیان۔دنیا والوں کے لئے اللہ کے وجود اور صفات پر گواہی دینے والا ہے۔

(۵) پانچویں فضیلت:

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ اس میں نشانیاں ہیں ظاہر (ال عمران۔۹۷)

علامہ ناصر الدین نے تفسیر سعدی میں وضاحت کی

ما تضمن من الايات البينات	چالیس سے زیادہ کھلی اور واضح
التي تزيد على اربعين اية	نشانیاں جو اس میں رکھی گئیں۔

امام شوکانی نے چند نشانیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا

ايات بينات الواضحات منها الصفا	کھلی واضح اور روشن نشانیوں میں سے مثلاً صفا
والمروة ومنها اثر القدم في الصخرة	اور مروہ ہیں۔سخت چٹان پر ابراہیم کا نقش قدم
الصما ومنها ان الغيث اذا كان	ہے بارش جب رکن یمانی میں ہو تو سرسبزی یمن
بناحية الركن اليماني كان الخصب	میں ہوتی ہے۔رکن شامی کی طرف ہو تو شام
في اليمن واذا كان بناحية الشامي	میں ہوتی ہے جب بیت اللہ کے چاروں طرف
كان الخصب بالشام واذا عم البيت	ہو تو زرخیزی تمام علاقوں میں ہوتی ہے
كان الخصب في جميع البلدان و	پرندے اس سے ہٹ کے پرواز کرتے ہیں
منها انحراف الطيور عن ان تمر على	ہر زمانے میں ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔اور ایک نشانی
هوائه في جميع الازمان ومنها هلاك	یہ کہ ظالموں میں سے جس نے اسے مٹانے کا
من يقصده من الجبابرة وغير ذالك	ارادہ کیا وہ ہلاک ہوا۔(فتح القدیر)

زاد المسیر فی علم التفسیر میں ہے۔

حيث يجتمع الكلب والظبي فلا الكلب	جہاں درندہ اور ہرن یکجا ہوں تو نہ درندہ ہرن پر
يهيج الظبي ولا الظبي يستوحش منه	مشتعل ہوتا ہے اور نہ ہرن اس سے بھاگتا ہے

(٦) چھٹی فضیلت:

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا۔ اور جو اس کے اندر آیا اُس کو امن ملا (آل عمران۔ ٩٧)

سورہ بقرہ میں فرمایا

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً اور جب ہم نے کعبہ کو اجتماع کی
لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔ جگہ اور امن کی جگہ مقرر کیا۔

طبری نے مثابہ کا معنی بیان کیا ہے

مرجعا للناس ومعاذا۔ لوگوں کیلئے لوٹنے کی جگہ اور جائے پناہ ہے۔ (بقرہ)

لوگ بار بار یہاں لوٹ کر آتے ہیں۔ یہ ان کا مرجع اور جائے پناہ ہے۔ اس لئے جو اس میں داخل ہو وہ مامون ہو جاتا ہے۔

(٧) ساتویں فضیلت:

اسی آیت میں فرمایا۔ طَهِّرَا بَيْتِيَ۔ دونوں میرے گھر کو صاف رکھنا۔

گھر کو اپنی طرف منسوب کر کے بَيْتِيَ میرا گھر کہا۔ اس کے علاوہ کسی گھر یا مسجد کی نسبت براہ راست اپنی طرف نہیں کی۔ مساجد اللہ (اللہ کی مسجدیں) تو کہا مساجدی (میری مسجدیں) نہیں فرمایا۔

علامہ ناصر الدین اس شرف کے بارے میں کیا خوب لکھتے ہیں

ولو لم یکن له شرف الا اضافته میرا گھر کہہ کر اللہ نے اپنی طرف نسبت کی۔ اگر اس کے سوا
ایاہ الی نفسه بقوله وطهر بیتی کوئی اور شرف نہ ہوتا تب بھی اسکی فضیلت اور بلندی کے
لکفی بهذہ الاضافة فضلا وشرفا لئے یہی نسبت کافی تھی۔ یہ وہ نسبت ہے۔ جس کی وجہ سے
وهذه الاضافة هی التی اقبلت جہاں والوں کے دل اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔
بقلوب العلمین الیه و سلبت نفوسهم اس کی زیارت کا شوق اور اسکی محبت ان کے نفسوں کو سلب
حباله وشوقا الی رؤیته فهذه کر لیتی ہے۔ پس یہ محبت کرنے والوں کیلئے مرجع ہے
المثابة للمحبین یثوبون الیه ولا اسکی طرف لوٹنا ہی انہیں ہوش میں لاتا ہے۔ اور اس سے
یقضون منه وطرا ابدا کلما ازدادوا اسکی طلب کبھی پوری نہیں ہوتی۔ جتنا وہ اس کی زیارت

له زیارة ازدادوا له حبا والیه میں آگے بڑھتے ہیں اتنا اس کی طرف شوق اور محبت میں
اشتیاقا فلا الوصال یشفیهم بھی ترقی ہوتی ہے۔ پس نہ وصال انہیں شفا بخشتا ہے اور نہ
ولا البعاد یسلیهم (السعدی۔ آل عمران) دوری ہی انہیں تسلی دیتی ہے۔

(٨) آٹھویں فضیلت:

سورۃ المائدہ میں فرمایا

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ اللہ نے کر دیا کعبہ کو جو کہ گھر ہے بزرگی والا قیام کا باعث
قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ لوگوں کے لیے اور بزرگی والے مہینوں کو اور قربانی کو جو نیاز
وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ (مائدہ۔ ٩٧) کعبہ کی ہو اور جن کے گلے میں پٹہ ڈال کر لے جاویں کعبہ کو

قیاماً للناس کا مطلب ہے یہ دین دنیا کی اصلاح کا سبب اور ان کی بہتر معیشت کا ذریعہ ہے۔ عذاب سے امن ہے۔ اس آیت میں چار چیزوں کو قیاماً للناس کہا کعبہ، حرمت والے مہینے، ھدی اور قلائد۔ لیکن ترتیب عجیب رکھی ہے۔ پہلے پورا جملہ ذکر کیا کہ ہم نے کعبہ کو جو حرمت والا گھر ہے قیاماً للناس بنایا ہے۔ باقی تین کا ذکر اسکے تحت کیا ہے۔

لان هذه الثلاثة انما صارت سببا کیونکہ یہ تین کعبہ کی طرف منسوب ہونے کی وجہ
لقوام المعیشة لانتسابها الی البیت سے معیشت کی مضبوطی کا سبب ہو گئی ہیں۔ پس
الحرام فکان ذالك دلیلا علی یہ بات اس گھر کی عظمت اور اس کے بہت بلند
عظمة هذا البیت و غایة شرفه مرتبہ ہونے کی دلیل ہے۔ (رازی۔ المائدہ۔ ٩٧)

(٩) نویں فضیلت:

یہ گھر اللہ کی توحید پر دلالت کرتا ہے۔ آل عمران کی آیت کے علاوہ درج ذیل آیتوں سے بھی یہ بات معلوم ہوتی ہے۔

اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ کہ شریک نہ کرنا میرے ساتھ کسی کو اور پاک رکھ میرا گھر۔

فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا

سو (مشرک) نزدیک نہ آنے پائیں مسجد حرام کے اس برس کے بعد۔

اس بارے میں ابن عاشور فرماتے ہیں

ولا شك ان اول هيكل اقيم لتو حيد الله وتنزيهه واعلان ذالك وابطال الاشراك هو الكعبة التي بناها ابراهيم اول من حاج الوثنيين بالادلة واول من قاوم الوثنية بقوة يده فجعل الاوثان جذاذا ثم اقام لتخليد ذكر الله وتوحيده ذالك الهيكل العظيم ليعلم كل احد ياتي ان سبب بنائه ابطال عبادة الاوثان	اور کوئی شک نہیں کہ یہ وہ پہلی عبادت گاہ ہے جو اللہ کی توحید کیلئے، عیب سے اس کی پاکی کے اظہار کیلئے اور شرک کو باطل کرنے کیلئے قائم کی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی بنیاد رکھی۔ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے پہلے بت پرستوں سے دلائل کے ساتھ بات کی پھر ہاتھ کی قوت سے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد یہ عظیم عبادت گاہ قائم کی تا کہ اللہ کا ذکر اور اس کی توحید ہمیشہ ہے اور ہر آنے والا جان لے کہ یہ گھر بتوں کی عبادت باطل کرنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ (بقرہ، ۱۳۳)

(۱۰) دسویں فضیلت:

یہ وہ گھر ہے، جس کی تعمیر میں اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں نے حصہ لیا۔ بقول امام رازی تعمیر کا حکم دینے والا ملک جلیل ہے۔ جگہ بتانے والا جبرائیل ہے۔ بانی خلیل اور تلمیذ اسماعیل ہے۔ جبکہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت سلیمانؑ کے حکم سے ہوئی۔ کام کرنے والے جنات تھے۔ ابن عاشور سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۴ کی تفسیر میں کہتے ہیں

ثم فيه مزية مباشرة ابراهيم عليه السلام بناءه بيده وبيد ابنه اسماعيل دون معونة احد فهو لهذا المعنى اعرق في الدلالة على التوحيد وعلى الرسالة معا وهما قطبا ايمان المومنين وفي هذه الصفة لايشاركه غيره	پھر اس کو یہ کمال حاصل ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام نے اسے بدست خود تعمیر کیا۔ کسی دوسرے کی مدد حاصل نہ کی۔ اس معنی میں وہ بیک وقت توحید و رسالت دونوں پر دلالت کرتا ہے۔ اور اس میں زیادہ پر عظمت ہے۔ یہ دونوں مومنین کے ایمان کا محور ہیں۔ اور اس خوبی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

(۱۱) گیارھویں فضیلت:

اس گھر کے بارے میں اللہ نے ابراہیمؑ کی تمام دعائیں قبول فرمائیں۔ مثلاً انہوں نے دعا کی

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا۔ اے اللہ اس شہر کو جائے امن بنا۔

اللہ نے اسے قبول کیا اور فرمایا۔

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا۔

کہ ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن کی جگہ بنایا ہے۔

انہوں نے عرض کی۔

وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ۔ اس میں رہنے والوں کو پھلوں میں سے رزق دے۔

اسے قبول فرمایا اور کہا۔

يُجْبٰى اِلَيْهِ ثَمَرَاتُ كُلِّ شَيْءٍ۔ چلے آتے ہیں اس کی طرف پھل ہر طرح کے

ابراہیم نے التجا کی۔

فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْ اِلَيْهِمْ۔ سو رکھ لوگوں میں سے کچھ کہ مائل ہوں انکی طرف۔

اسے سند قبولیت عطا فرمائی۔ ارشاد ہوا ہم نے اس گھر کو مثابہ (مرجع) بنا دیا۔

مفسرین نے اس گھر کے اور بھی کئی فضائل و مناقب بیان کئے ہیں۔ ان پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ خاتم الانبیاء کا قبلہ خاتم المساجد ہی ہو سکتا ہے۔ رحمۃ للعالمین کے لائق وہی قبلہ ہے جو ھدی للعالمین ہے۔ عبداللہ کے لئے بیت اللہ ہی مناسب قبلہ ہے۔ اور داعی الی اللہ کا قبلہ وہی ہونا چاہیے جو سب سے زیادہ اللہ کی توحید پر دلالت کرتا ہے۔

تحویل اور تقرر قبلہ میں پنہاں حکمتیں:

(۱) یہ شریعت گزشتہ تمام شریعتوں کی معترف ہے۔ ان سب کی جامع ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ عالمی ہے۔ صرف بنی اسرائیل یا عرب تک محدود نہیں۔ ہر ایک کے لئے ہے۔ تمام سابقہ شریعتوں سے اکمل اور اتم ہے۔

(۲) ایک حکمت ان فضائل و کمالات کا حصول ہے جو اس مقام اور جہت میں ہمیشہ کیلئے اللہ

نے رکھ دیے۔ ان شرافتوں اور کرامتوں سے بہرہ ور ہونے کیلئے جس کمال کی ضرورت تھی کوئی امت بھی اس درجے کو نہیں پہنچی۔ بعض کمال دوسرے کمالات پر موقوف ہوتے ہیں۔ ہر جگہ استقبال قبلہ کی پابندی کا حکم بتاتا ہے اس گھر سے وابستہ فضائل حاصل کرنے کیلئے جو کمال ضروری ہے یہ امت اسے حاصل کر چکی ہے۔ وہ خاص کمال اس کا وسط ہونا ہے۔ اسلئے اس امت کی عمر اور وقت تھوڑا لیکن اجر زیادہ ہے

(۳) اس بات کا اعلان کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی امت ہی ملتِ ابراہیم کے پیروکار ہیں۔ ملتِ ابراہیم اللہ کی پسندیدہ ملت ہے۔ اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی پر چلنے کا حکم دیا۔ صرف حکم ہی نہیں دیا اس تک پہنچنے کی راہیں بھی کشادہ کر دیں۔ ابراہیمی ملت جو نجانے کب سے مستور ہو چکی تھی، بتمام وکمال آپ کے لئے کھول دی۔ اس ملت کا ایک شعار اور اہم علامت کعبہ کی تعظیم وتکریم بھی ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

ان اللہ امر الکفرۃ باتباع ملۃ ابراھیم
اللہ نے کافروں کو ملت ابراہیمی پر چلنے کا حکم دیا۔

ومن ملتہ تعظیم بیت اللہ الحرام
اور انکی ملت میں اللہ کے محترم گھر کی تعظیم بھی ہے۔

(روح المعانی۔ آل عمران)

اس کی طرف اللہ نے آپ کی راہ نمائی فرمائی۔ ہر جگہ ہر نماز کے لئے استقبال قبلہ کا لازمی حکم دیتے ہوئے فرمایا

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ
اور جہاں سے آپ نکلیں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کیجیے اور (اے مسلمانوں) جہاں بھی تم ہو اپنا منہ اسی طرف کرو۔ (البقرہ)

پوری امت کو استقبال قبلہ کا حکم دینا امت محمدیہ کی خصوصیت اور شرف ہے۔ کعبہ کو قبلہ بنانا بھی صراط مستقیم ہے۔ اللہ کی مشیت کا تقاضا تھا۔ اس نے ہماری راہنمائی فرمائی اور صیغہ خطاب کے ساتھ باقاعدہ حکم دے کر ہمیں استقبال کا پابند کیا۔

واماالتوجھہ الی جھتھامن بلد بعید
اور یہ کہ (ملت ابراہیمی میں) دور رہ کر بھی اس

عنھافلادلیل علی وقوعہ فیکون
سمت توجہ کرنا ضروری ہو تو اس کی کوئی دلیل نہیں۔

الامر بالالتزام الاستقبال فی الصلاۃ
پس ہر جگہ استقبال قبلہ کا لازمی حکم اس شرع

من خصائص ھذہ الشریعۃ
محمدی کی خصوصیت ہے۔ (ابن عاشور۔ البقرہ)

مشرکین اور اہل کتاب خاص طور پر اس شرف سے محروم رہے۔ حالانکہ وہ ملت ابراہیمی پر کاربند ہونے کا دعوی کرتے اور خود کو فخر سے ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے تھے۔ مشرک کعبہ کی تعظیم تو کرتے تھے لیکن وہ نماز ہی نہیں پڑھتے تھے تو کعبہ کو قبلہ کیا بناتے؟ الٹا اس پاک گھر کو شرک کا اڈا بنا رکھا تھا۔

یہودی اور عیسائی کسی درجے میں بیت المقدس کو قبلہ سمجھتے تھے لیکن وہ بھی ان کے اصل مذہب میں نہیں تھا۔ یہودی دین موسوی کے پیروکار تھے۔ اور بیت المقدس موسی علیہ السلام کے کئی صدیوں بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ نماز میں ان کے لئے کوئی جہت متعین نہ تھی۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

انھم کانوا یتممون فی دعائھم بالتوجہ الی صوب بیت المقدس علی اختلاف موقع جھتہ من البلاد التی ھم بھا۔
جن جن علاقوں میں وہ رہتے تھے وہاں جہت کا اختلاف واقع ہونے پر بیت المقدس کی طرف متوجہ ہوتے اور اپنی دعا میں اس کی دائمی جہت کا خیال کرتے تھے۔ (ابن عاشور۔ البقرۃ)

مشرق ومغرب اور ان کے درمیان کوئی سمت ان کے دین میں مقرر نہ تھی۔ عیسائیوں کے لئے بھی انجیل میں کوئی جہت متعین نہیں تھی۔ اپنی مرضی سے مشرکین روم کے صنم خانوں کی مخالفت میں اپنے کنیسے مشرق کے رُخ بنائے اور دروازے مغرب کی جانب رکھے۔ اب تو یہ چیز بھی باقی نہ رہی۔

(۴) آپ کا دین یہود ونصاری کے دین کا جزء یا تابع نہیں اپنی جگہ مستقل دین ہے۔ بیت المقدس ہی قبلہ رہتا تو یہ شبہ ہوتا کہ اسلام اصول وفروع میں دین موسوی کے ماتحت ہے جیسا کے عیسائیت۔ تحویل قبلہ نے واضح کر دیا یہ اسی سلسلے کی کڑی ہونے کے باوجود ان کا ماتحت نہیں۔

ایک جدا اور مستقل دین ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان سے اشرف وافضل ہے کجا یہ کہ ماتحت ہو۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

ولان فی استقبالها ایماء الی	اور کیونکہ استقبال قبلہ میں اس دین کے مستقل
استقلال هذا الدین الذین	ہونے کا اشارہ ہے۔ ان لوگوں کے دین سے
عن دین اهل الکتاب	جو اہل کتاب ہیں۔ (بقرہ۔۱۴۴)

(۵) اہل کتاب بھی اس کا قبلہ ہونا پہچانتے تھے۔ فرمایا

يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ أَبْنَاءَهُمْ۔

وہ اس کی اسی طرح معرفت رکھتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔

اس کی ایک تفسیر کعبہ سے کی گئی۔ امام رازی نے بیان کیا

ان قوما من علماء الیهود کانوا عرفوا	یہودیوں میں سے علماء کا ایک گروہ اپنے نبیوں
فی کتب انبیاء هم خبر الرسول وخبر	کی کتابوں سے رسول اور قبلہ کو پہچانتا تھا۔
القبلة وانه یصلی الی القبلتین وثانیها	انہیں معلوم تھا کہ آپ قبلتین کی طرف نماز
انهم کانوا یعلموا ان الکعبة هی البیت	پڑھیں گے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ کعبہ
العتیق الذی جعله الله تعالیٰ قبلة	ہی وہ بیت عتیق ہے جسے اللہ نے ابراہیم
ابراهیم واسماعیل علیه السلام	واسماعیل کا قبلہ بنایا۔ (بقرۃ۔۱۲۵)

بیت المقدس ہی قبلہ رہتا تو انہیں اعتراض کا موقعہ ہاتھ آ جاتا۔ لہذا بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ مقرر کیا۔

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ۔ تاکہ لوگوں کو تم پر الزام کا موقعہ نہ ملے۔ (بقرہ)

(۵) کعبہ کو قبلہ بنانے کے متعلق فرمایا۔

إِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ یقیناً یہی آپ کے رب کی طرف سے حق ہے۔

یعنی اللہ کے علم میں بھی اصل اور مستقل قبلہ کعبہ ہی ہے۔ جو اللہ کے نزدیک حق ہے وہی صراط مستقیم ہے۔ اور اللہ اپنی مشیت سے لوگوں کی راہنمائی کرتا ہے۔ تحویل قبلہ کا حکم دیتے ہوئے فرمایا جس قبلہ

کی طرف آپ کی رضا ہے ہم آپ کو اسی طرف پھیر دیں گے۔

معتزلہ نے اس پر اعتراض کیا کہ کیا آپ کے میلان طبع کا نام شریعت ہے؟ علماء اہلسنت نے اسکے جوابات دیئے۔ دور حاضر کے منکرین حدیث بھی بعض باتوں میں انہی کے نقش قدم پر ہیں۔ اہل ایمان کے لئے اس میں روشنی ہے۔ تحویل قبلہ آپ علیہ الصلاۃ والسلام کے میلان طبع کی تکمیل سہی لیکن لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ اور صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ کہہ کر بتادیا کہ پیغمبر کی طبع اور اس کی رضا اللہ کی رضا میں فنا اور اس کے نزدیک عین حق اور صراط مستقیم ہے۔ آپ کی مبارک طبیعت بہت مجلی، مصفی، مزکی اور لطیف ہے۔ اس وجہ سے خود بخود اسی بات کی طرف مائل ہوتی ہے جو عین حق ہے۔ ایسی طبیعت والے سے جو کلام صادر ہوگا وہ بھی عین حق وصواب ہوگا۔

ابن عاشور نے تَرْضٰهَا کی تفسیر میں فرمایا

وعبر برضاها الله دلالة علی ان	اور آپ کی رضا سے تعبیر کرنا اس بات کی دلیل
میله میل لقصد الخیر بناء علی	ہے کہ کعبہ کی طرف آپ کا میلان خیر کے ارادے
ان الکعبة اجدر بیوت الله بان	سے ہے۔ اس کی بنیاد اس پر ہے کہ کعبہ کی توحید پر
یدل علی التوحید کما تقدم	دلالت اللہ کے تمام گھروں سے زیادہ ہے۔
فهو اجدر بالاستقبال من	جیسا کہ گزر چکا ہے۔ اس لئے بیت المقدس کے
بیت المقدس	بجائے کعبہ استقبال کی زیادہ اہلیت رکھتا ہے

الشهيد الاعظم ﷺ

شہادت گواہی کو کہتے ہیں۔ اور شاھد کا مطلب ہے گواہی دینے والا۔ یہ اعزاز بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ سچی گواہی تلوار کی دھار پر چلنے کے مترادف ہے۔ یہ کانٹوں کا راستہ اور نوکیلے پتھروں کی کارگاہ ہے۔ اس راہی کو کہکشاؤں سے نہیں ابتلاؤں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہادت اظہار حق کا نام ہے اور شاھد مظہر حق ہے۔ یہ سانحہ نہیں واقعہ اور حادثہ نہیں منصب ہے۔ وہم وخیال نہیں ایک رویہ بلکہ ہر رویے کا بطن ہے۔ یہ وہ عمل ہے جو نگاہوں سے برستا اور اداؤں سے ٹپکتا ہے۔ یہ دنیا عالم شہادت ہے۔ اور اس کارگاہ شہادت میں ہر چیز شاھد ہے۔ تمام شاھدوں میں ایک شاھد سب سے نرالا ہے۔ ایک کی شہادت سب شہادتوں سے جدا ہے۔ یہ شاھد محمد رسول اللہ ہیں۔ اور تمام انسانوں پر آپ کی گواہی منفرد گواہی ہے۔

یوں تو ہر نبی اپنی امت کا گواہ ہے۔ زاد المسیر میں ہے

والشهيد نبي الامة	شہید سے مراد ہر امت کا نبی ہے۔

لیکن محمد ﷺ شاھد مطلق ہیں۔ آپ ﷺ دونوں جہانوں میں سب زمانوں کے تمام انسانوں پر گواہ ہیں۔

حضور ﷺ کی گواھی کا تذکرہ

اس ہمہ جہت شاھد کی شہادت کا تذکرہ چند آیتوں میں کیا گیا۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا	اور اسی طرح ہم نے تمہیں معتدل امت
شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ	بنایا تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر
عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا	گواہی دینے والا ہو۔ (بقرہ۔١٤٣)

اس آیت میں معتدل بنانے کے دو سبب بتائے

(۱) تاکہ تم لوگوں پر گواہ ہو (۲) اور رسول تم پر گواہ بنے۔

امت اس لئے عادل ہے تاکہ گواہ بن سکے۔ یہ مربوط کلام ہے کیونکہ گواہ کیلئے عادل ہونا ضروری ہے۔ لیکن امت اس لئے عادل ہے تاکہ رسول اس پر گواہ بن سکے بظاہر اس میں ربط نہیں۔ کیونکہ عدالت گواہ کیلئے ضروری ہے۔ جس پر گواہی دی جائے اس کا عادل ہونا ضروری نہیں۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ پر بات مکمل ہوگئی۔

اگلا جملہ بڑھانے سے دو باتیں مفہوم ہوتی ہیں۔

(۱) آپ کی گواہی تتمیم وتکمیل ہے۔ یہی اصل گواہی ہے۔ امت کی گواہی اس وقت قابل قبول ہے جب آپ ﷺ ان پر گواہی دیں۔

(۲) امت وسط پر گواہی دیکر دراصل آپ ان کی تصدیق اور تزکیہ فرمائیں گے۔

اس میں حضور ﷺ کی خاطر داری ہے۔ آپ کی خاطر امت کو وسط بنا کر تصدیق وتعدیل کے قابل بنایا۔ اور آپکو پہلے ہی آگاہ فرما دیا تاکہ نہ صرف یہ کہ آپ بے کھٹکے تصدیق کر سکیں۔ بلکہ کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ آپ ہر جگہ موجود تھے اس لئے گواہی دے رہے ہیں۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

لان جعلنا وسطا يناسبه عدم	کیونکہ ہمارا وسط کے مناسب ہے ہمارے حق
الاحتياج الى الشهادة لنا وانتفاء	میں اور ہمارے خلاف گواہی کی ضرورت
الشهادة علينا	نہ ہو۔ (بقرۃ۔١٤٣)

شہادت کا کوئی بھی معنی لیا جائے بہر حال

ففي ذالك الشرف التام لهم	مخلوقات میں سب سے اشرف ان پر گواہ ہے
حيث كان اشرف المخلوقات	اس حیثیت سے اس میں امت کیلئے انتہائی
هو الشاهد عليه	فضیلت ہے (البحر المحیط۔ البقرہ۔١٤٣)

(۲) دوسری آیت

فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ	پھر کیا حال ہوگا جب بلائیں گے ہم ہر امت
بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ	میں سے احوال کہنے والا۔ اور بلائیں گے تمہیں
شَهِيْدًا	ان لوگوں پر احوال بتانے والا۔ (النساء۔٤١)

تفسیر البحر المحیط میں ہے

والامة هنا من بعث اليهم النبی من مومن به و كافر
اور یہاں امت سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی طرف نبی کو بھیجا گیا۔ خواہ وہ اس پر ایمان لائے یا کافر رہے۔

(۳) تیسری آیت

وَيَوْمَ نَبْعَثُ فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ شَهِيْدًا عَلَيْهِمْ مِّنْ اَنْفُسِهِمْ وَجِئْنَا بِكَ شَهِيْدًا عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ
اور جس دن ہم ہر فرقہ میں ان پر ایک بتلانے والا کھڑا کریں گے انہی میں سے۔ اور تمہیں لائیں گے ان لوگوں پر بتلانے کو۔ (النحل۔۸۹)

یہاں پر دوسرے نبیوں کیلئے مِنْ اَنْفُسِهِمْ (انہی میں سے) کا لفظ استعمال ہوا آپ کیلئے نہیں کیونکہ

انه مبعوث الى جميع الامم وشهيد عليهم جميعا

آپ تمام امتوں کی طرف مبعوث ہوئے اور ان سب پر گواہ ہیں۔ (ابن عاشور۔ النحل)

دوسرے نبیوں کیلئے نَبْعَثُ (ہم اٹھائیں گے) مستقبل کا صیغہ اور آپ کیلئے وَجِئْنَا بِكَ (ہم لا چکے ہیں آپکو) ماضی کا صیغہ استعمال کیا کیونکہ

انه صلى الله عليه وعلى اله وسلم لم يزل من حين بعثه متصفا بهذه الصفة العلية

بیشک جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تب سے برابر اس بلند صفت سے متصف ہیں۔ (البقاعی)

(۴) چوتھی آیت

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا
اے نبی ہم نے تجھے بھیجا بتانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا۔ (الاحزاب۔۴۵)

مفسر ابو حیان فرماتے ہیں۔

شاهدا على من بعثت اليهم و على تكذيبهم وتصديقهم اى مقبولا قولك عند الله وشاهدا بالتبليغ اليهم وبتبليغ الانبياء قولك
اور جنکی طرف آپ کو بھیجا گیا ان کی تکذیب و تصدیق پر آپ گواہ ہیں۔ یعنی آپ کا قول اللہ کے ہاں مقبول ہے۔ اور آپ کا قول اس بات کا گواہ ہے کہ انہیں تبلیغ کی گئی اور انبیاء نے انہیں دین پہنچا دیا۔

پانچویں آیت سورۃ فتح کی اور چھٹی آیت سورۃ مزمل کی ہے۔ آپ کو مطلقاً شاھد قرار دیکر آپ کی کیا شان بتائی گئی اسے سمجھنے کے لئے دو باتیں جاننی ضروری ہیں۔

(۱) شاھد کیا ہوتا ہے۔

(۲) شاھد کی مختلف حیثیات کیا ہیں۔

عربی میں شاھد کا لفظ گواہی دینے والے کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ جو اپنے علم کے مطابق کسی بات کی یقینی خبر دے۔ آنکھوں دیکھی اور کانوں سنی بات حاکم کے روبرو بیان کرے۔

(القاموس الوحید۔ فرہنگ آصفیہ)

شاھد اور حاضر میں فرق

جیسا کہ معلوم ہوا شاھد گواہ کو کہتے ہیں۔ حاضر اور موجود اردو میں مترادف سمجھے جاتے ہیں۔ عربی لغت دونوں میں فرق کرتی ہے۔ کچھ لوگ شاھد کو اپنی لغوی وضع سے ہٹا کر اس کا معنی حاضر کرتے ہیں۔ یہ کھینچ تان صرف اپنے من گھڑت نظریے کو سہارا دینے کے لئے کی جاتی ہے۔ وہ نظریہ ہے کہ حضور ﷺ ہر جگہ حاضر و ناضر ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کسی بات کی گواہی اسے دیکھے بغیر اور موقعے پر حاضر ہوئے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس لئے لازمی ہے کہ گواہی دینے والا وہاں حاضر ہو۔ بچشم خود مشاھدہ کرے اور گواہی دینے کے وقت بھی وہاں حاضر ہو۔ جب اللہ نے آپ ﷺ کو تمام لوگوں پر گواہ ٹھہرایا تو لازم ہے کہ آپ ﷺ ان کے پاس موجود ہوں انہیں دیکھ رہے ہوں تبھی آپ گواہی دے سکیں گے۔ حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے

ہر جگہ موجود ہونا صرف اللہ کی صفت ہے۔ آپ کو ہر جگہ حاضر قرار دینا آپ کو اللہ کی صفت میں شریک کرنا ہے جو آپ کے دامن عبدیت پر دھبہ اور آپ کے حضور بدترین گستاخی ہے۔

شاھد کیلئے حاضری اگر ایسی ہی ضروری ہے تو لازم آئے گا کہ آپ ہر لحہ، ہر جگہ ہر ایک جن و انس پر حاضر ہوں۔ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے لیکر قیامت کے قیام تک یہ حاضری اس طرح دائمی اور مستمر ہو کہ ایک لحہ کے لئے بھی اس میں انقطاع نہ ہو۔ کیونکہ اگر انقطاع اگرچہ ایک لحہ کیلئے مانا جائے تو اس صورت میں آپ حاضر نہیں ہوں گے اور اختراعی معنی کے لحاظ سے گواہی نہیں دے

سکیں گے۔ یہ سیدھا سادھا شرک اور آپ کی مقدس سیرت کے بالکل منافی ہے۔ ہر قدم آپ کی سیرت واضح کرتی ہے کہ آپ ہر جگہ موجود نہیں۔

شاھد کو حاضر کا جامہ پہنانا بجائے خود غلط اور لغوی تحریف ہے۔ کیونکہ گواہ کے لئے حقیقتاً حاضر ہونا قطعاً ضروری نہیں۔ یقینی علم کی بنیاد پر بھی گواہی دی جا سکتی ہے۔ اور یہ ایسی ہی گواہی ہے گویا کہ شاھد خود وہاں موجود ہے۔ پس شاھد میں حاضر کا معنی پایا جاتا ہے لیکن حقیقتاً نہیں مجازاً۔

شہادت کے دو پہلو ہیں (۱) شاھد جب بار شہادت اٹھاتا ہے۔ (۲) جب اس سے سبکدوش ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کسی موقعے پر بھی ضروری نہیں کہ شاھد بذات خود وہاں حاضر ہو۔ ہو سکتا ہے دونوں وقت حاضر نہ ہو اور ہو سکتا ہے ایک ہی موقعے پر حاضر ہو۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ جہاں حاضر ہو وہاں ہر وقت حاضر رہے۔ خلاصہ یہ کہ حقیقی طور پر حاضر ہونا شاھد کی لازمی صفت ہے نہ دائمی۔ البتہ مجازی طور پر اس میں حاضر کا معنی یقیناً پایا جاتا ہے۔ شہادت کا یقینی علم حاصل ہونا ایسا ہے گویا کہ شاھد خود وہاں موجود ہے۔ اس اعتبار سے ہی شاھد کو حاضر کہہ دیا جاتا ہے۔ شاھد کو حقیقی طور پر حاضر ہونے کے معنی میں بند کرنا درست نہیں۔ ان دونوں میں واضح فرق ہے۔

(۱) شاھد کا لفظ گواہ کیلئے بولا جاتا ہے جو شہادت دینے کے قابل ہو اور حقیقت سے پردہ اٹھا کے مخفی بات کو سامنے کر دے۔ حاضر کیلئے وضع نہیں ہوا۔ شاھد الگ لفظ ہے حاضر الگ۔

(۲) حاضر کے لفظ میں ایک سے دوسری جگہ منتقل ہونے کا معنی پایا جاتا ہے۔ حاضر اسے کہتے ہیں جو ایک جگہ سے دوسری جگہ آئے اور پوشیدہ نہ ہو فرمایا۔

وَلَا يَأْبَ الشُّهَدَآءُ إِذَا مَا دُعُوا۟ اور انکار نہ کریں گواہ جب بلائے جائیں۔ (آل عمران۔ ۲۸۲)

گواہ حاضر ہے تو بلانا کیسا؟ بلایا وہی جاتا ہے جو حاضر نہیں ہوتا۔ تبھی اللہ کیلئے شھید کا لفظ بولا گیا حاضر کا نہیں۔ کیونکہ اللہ کی ذات مکان، مکین اور منتقل ہونے سے پاک ہے۔

(۳) شاھد اور حاضر دونوں غائب کی ضد ہیں۔ الگ الگ دونوں کو غائب کی ضد بتلانا دلیل ہے کہ معنی و مفہوم کے لحاظ سے دونوں میں فرق ہے۔

(۴) دونوں میں ایک باریک فرق اور بھی ہے۔ یہ فرق مفہوماً ان کے جدا ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حاضر کیلئے شاھد ہونا اور شاھد کیلئے حقیقتاً حاضر ہونا ضروری نہیں۔ حاضر فاتر العقل، مخبوط الحواس، مجنون اور اندھا بہرا بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن شاھد صحیح الحواس اور صحیح عقل والا ہی ہوگا۔

ابو بلال عسکری فرماتے ہیں

الشهادة فى الاصل ادراك الشئ من جهة سمع او رؤية فالشهادة تقتضى العلم بالمشهود على ما بيناه والحضور لا يقتضى العلم بالمحضور الاترى انه يقال حضره الموت ولا يقال شهده الموت (فروق اللغويه۔ ۱۱۰)	شہادت اصل میں سننے یا دیکھنے کی جہت سے چیز کے ادراک کا نام ہے۔ پس اس اصول پر جو ہم نے بیان کیا گواہی اس چیز کے علم کا تقاضا کرتی ہے جس کی گواہی دی گئی۔ اور حاضر ہونے سے اس چیز کا علم لازم نہیں آتا جو سامنے ہو۔ کیا تم نہیں دیکھتے اسے موت آئی تو کہا جاتا ہے موت نے اس کی گواہی دی نہیں کہتے۔

خلاصہ یہ ہوا جو قابل شہادت ہو وہ شاھد ہے۔ جو چل کر آئے وہ حاضر ہے۔ اور جس میں دونوں باتیں جمع ہوں وہ حقیقت میں حاضر بھی ہے اور شاھد بھی۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

والشهداء جمع شهيد فعيل بمعنى فاعل من شهد اذا حضر واصله الحاضر قال تعالى ولا ياب الشهداء اذا ما دعوا ثم استعمل هذا اللفظ فيما يلازمه الحضور مجازا او كناية لا باصل وضع اللفظ (ابن عاشور۔ البقرہ۔ ۲۳)	اور شھداء شھید کی جمع فعیل کے وزن پر فاعل کے معنی میں ہے۔ جس نے گواہی دی جب وہ حاضر ہوا۔ اور اصل اس کی حاضر ہے۔ (اسی مفہوم میں جو بتایا گیا) اللہ نے فرمایا گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں۔ پھر یہ لفظ اصل وضع کو چھوڑ کر ان معنی میں استعمال کیا گیا جہاں حضوری مجازاً یا کنایہ کے طور پر ہو

شاھد اور ظاھر

جو چیز نگاہوں کے سامنے ہو وہ ظاہر بھی ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی چیزوں پر بھی شاھد کا اطلاق ہوتا ہے۔ فرمایا

عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ۔ وہ پوشیدہ اور ظاہر کا عالم ہے۔

یہاں غائب اور حاضر کا تقابل نہیں۔ شہید اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ علامہ ابن اثیر فرماتے ہیں۔

والشهيد الذی لایغیب عن علمه شیء، والشاهد الحاضر فاذا اعتبر العلم مطلقاً فهو العليم واذا اضيف فی الامور الباطنة فهو الخبير واذا اضيف الی الامور الظاهرة فهو شهيد	شہید وہ ہے جس کے علم سے کوئی چیز باہر نہیں۔ شاهد حاضر ہے۔ پس جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے۔ اور جب اندرونی امور کی طرف مضاف ہو تو وہ خبیر ہے۔ اور جب ظاہری امور کی طرف مضاف ہو تو وہ شہید ہے۔ (نہایہ فی غریب الاثر)

لغت میں شہادت کا معنی ہے۔

خبر قاطع یقینی خبر فی اللغة البيان۔ فیصلہ کن بات بیان کرنا (تاج العروس۔ السمرقندی)

اور اصطلاح میں معنی ہوگا۔

المخبر عن حجة المدعی المحق ودفع دعوی المبطل

جو مدعی کی طرف سے درست خبر دے اور اسے باطل کرنیوالے کا دعوی رد کردے۔ (ابن عاشور۔ الاحزاب)

لا الہ الا اللہ یعنی توحید دعوی ہے۔ مدعی اللہ تعالی ہے۔ اس کے شاهد آپ ﷺ ہیں۔ اسی کی تبلیغ اور قبول وعدم قبول پر روز قیامت گواہ ہوں گے۔ ہر نبی اس کا شاهد ہے پر آپ کی شان نادر، انوکھی اور بلند و بالا ہے۔ آپ علیہ السلام شاهد مطلق ہیں۔ تمام انبیاء کو وصف شہادت آپ کے واسطہ سے عطا ہوا۔ ہر نبی شہید امت ہے۔ حضور پر نور ﷺ شہید الانبیاء والامم ہیں۔

شاهد کی حیثیات

شاهد کی مختلف حیثیات پیش نظر ہوں تب اس میں آپ کی شان کا صحیح اور کامل عکس دل و دماغ پر پڑے گا۔

(۱) مشاهد ۔ مشاہدہ کرنے والا۔

واصل الشهادة الاخبار بما شاهده (لسان العرب)

اور شہادت کی اصل ان باتوں کی خبر دینا ہے جن کا مشاہدہ کیا۔

شاهد کی ایک حیثیت مشاہدہ کرنے والے کی ہے۔ جن باتوں کی آپ ﷺ نے خبر دی ان کا مشاہدہ بھی فرمایا۔ عالم غیب سے آپ کے لئے پردے اٹھا دیئے گئے۔ برزخ و آخرت کو آپ پر منکشف کردیا گیا۔ زمانے آپ کیلئے سمیٹ دیئے گئے۔ ماضی سے لپٹیں بُعد کی سیاہ چادریں اتار کر اس کا بہت سا حصہ آپ پر روشن کردیا گیا۔ مستقبل کے کئی مناظر آپ کو دکھائے گئے۔ آپ ﷺ نے دو طرح سے ان کا مشاہدہ فرمایا۔

(ا) کئی مقامات اور افراد و احوال کی آپ کو سیر کرائی گئی۔ گویا ان جگہوں پر آپ کو حاضر کیا گیا۔ اپنے مبارک جسم کے ساتھ آپ مکہ سے بیت المقدس اور وہاں سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ بحالتِ بیداری جسمانی آنکھوں سے آپ نے سابقہ انبیاء کو دیکھا۔ فرشتوں پر نظر کی۔ برزخ اور جنت و جہنم کے مناظر دیکھے۔ اللہ کی غیبی سلطنت کا مشاہدہ کیا۔ اللہ کی تجلیات دیکھیں۔ مکان سے لامکاں میں قدم رکھا۔ وہاں تشریف لے گئے جہاں کوئی نبی پہنچ سکا نہ کسی ملک مقرب کی رسائی ہوئی۔ جب تک جس مقام پر آپ موجود تھے وہاں حاضر تھے۔ دوسرے مقام پر تشریف فرما ہوئے تو پہلی جگہ کی حاضری ختم ہوگئی۔ جب واپس تشریف لائے تو سب جگہ کی حاضری ختم ہوگئی۔ اس کی دلیل عقل سلیم کے علاوہ وہ روایت بھی ہے۔ جس میں اہل مکہ نے آپ سے بیت المقدس کی بابت دریافت کیا تو وہ آپ کے سامنے کردیا گیا۔ اور آپ نے اسے دیکھ کر جوابات دیئے۔ اگر آپ وہاں اس وقت بھی حاضر ہوتے تو بیت المقدس آپ کے حضور پیش کرنا تحصیل حاصل کے سوا کچھ نہیں۔ اسی طرح یہی روایت اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آپ کے مشاہدات اجمالی تھے۔ تفصیلی نہ تھے۔ اگر تفصیلی مشاہدہ ہوتا تو آپ ﷺ اپنے مشاہدے کی بنیاد پر اس کے جملہ احوال بتا دیتے دوبارہ آپ کے سامنے اسے متمثل کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

(ب) آپ ﷺ اپنے مقام پر رہے اور وہیں آپ پر کونی حقائق اور غیبی موجودات کو منکشف کردیا گیا۔ جنت و جہنم آپ کے سامنے کی گئیں۔ برزخ و حشر کے مناظر آپ کو دکھائے گئے۔ گذشتہ امتیں آپ پر پیش کی گئیں۔ اپنی امت کے اعمال آپ کو دکھائے گئے۔ مستقبل کی بہت سی باتیں

آپ کو بتائی گئیں۔ اپنی جگہ پر رہتے ہوئے آپ نے ان سب کا مشاہدہ فرمایا۔ کبھی عالم بیداری میں کبھی عالم خواب میں۔ اس بارے میں روایات کثیر ہیں۔

ان سے دوامی حاضر و ناظر کا معنی کشیدہ کرنا درست نہیں۔ یہ قرآن و حدیث اور آپ کی سیرت کے خلاف ہے۔ قرآن مجید میں بیسیوں آیات ہیں جہاں شہادت کے مشتقات استعمال ہوئے وہاں حاضری کا حقیقی معنی بن ہی نہیں سکتا۔ مفردات راغب کتاب الشین میں ہے۔

والشهادة قول صادر عن علم حصل بمشاهدة بصيرة او بصر

اور شہادۃ علم کی وجہ سے صادر ہونے والا قول ہے۔ جو دلیل سے یا آنکھوں سے دیکھ کر حاصل ہوتا ہے۔ گویا رؤیت بصری یعنی ظاہری آنکھوں سے مشاہدہ کوئی ضروری نہیں۔ تفسیر البحر المحیط میں عادل کی شہادت کے چار اسباب بتائے۔

بمعائنة كالشهادة على الزنا و بخبر	آنکھوں سے دیکھ کر شہادت دینا جیسے زنا پر۔
الصادق كالشهادة على الشهادة و	سچے کی خبر پر یقین کر کے گواہی دینا جیسے
بالا ستفاضة كالشهادة على الانساب	گواہی پر گواہی۔ شہرت پر گواہی دینا جیسے انساب
وبالد لالة كالشهادة على الا ملاك	پر گواہی۔ دلالت کی وجہ سے جیسے زیر ملکیت
و كتعديل الشاهد وجرحه (البقره ۱۴۳)	چیز پر گواہ کی جرح و تعدیل کرنا وغیرہ۔

اسے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رؤیت بصری ہی لازمی نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا۔

سيد الايام يوم الجمعة شاهد مشهود	جمعہ دنوں کا سردار ہے گواہی دینے والا ہے۔
لمن حضر صلاته (النهاية في غريب الاثر ابن اثير)	جو نماز جمعہ کیلئے حاضر ہوئے ان پر شاهد ہے۔

جمعہ کیسے حاضر ہو سکتا ہے؟ پھر شہد اور حضر کا تقابل۔ عاقل کیلئے اسمیں بحث کا بہت سامان ہے۔

(۲) عالم

شاھد کی ایک حیثیت عالم ہونے کی ہے۔ لغت کی کتاب تاج العروس میں ہے

الشاهد هو العالم الذى	شاھد وہ عالم ہے جو اس چیز کو بیان کرتا ہے
يبين ما علمه۔	جس کا اسے علم ہوا۔

آپ کو مطلقاً شاھد کہنا آپ کے کامل علم کا بیان بھی ہے۔ یقیناً اللہ کی تمام مخلوقات میں آپ ﷺ سے بڑا عالم کوئی نہیں۔ اللہ کی ذات و صفات کی معرفت، اس کی عظمت و قدرت، اسکے ملک و سلطنت کی شناخت، اس کی پسند و ناپسند کی پہچان، ماضی کے حالات پر اطلاع اور مستقبل کے واقعات کی خبر، بے شمار کونی حقائق کے ادراک اور غیبی امور کے علم میں کوئی آپ کا ثانی نہیں۔ آپ کے کمال علمی پر گذشتہ صفحات میں بات ہو چکی ہے۔

(۳) مبین

شاھد کی ایک حیثیت مبین کی ہے۔ مبین وہ ہے جو بات کو خوب کھول کر بیان کرتا ہے۔ ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی اپنی تفسیر بحر العلوم میں فرماتے ہیں

والشهادة فى اللغة هى البيان فلهذا يسمى الشاهد بينة لانه بين حق المدعى

شہادت کا لغوی معنی واضح کرنا ہے اسی لئے شاھد کو بینہ کہتے ہیں کیونکہ وہ مدعی کا حق واضح کرتا ہے۔ (البقرہ ۱۴۳)

آپ نے دعوائے توحید کو کھولا۔ دین کو بیان کیا۔ حق کو واضح کیا۔ مخفی اسرار و رموز کو آشکار کیا۔ اور قرآن کی مراد سمجھائی۔ اللہ نے فرمایا۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ	اور اتاری ہم نے تجھ پر یہ یادداشت کہ تو کھول
لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ	دے لوگوں کے واسطے وہ چیز جو اتری انکے واسطے (النحل)

جو کچھ اترا وہ اسی طرح بلا کم و کاست سنا دینا تلاوت آیات ہے تبیین نہیں۔ تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے اور بیان ان کے معانی و مراد کا ہوتا ہے۔ تلاوت آیات اجمال ہے۔ بیان آیات ان کی تفصیل ہے۔ آپ کا قول و فعل سکوت ان الفاظ کا بیان اور اس اجمال کی تفصیل ہے۔ اسی کو حدیث کہتے ہیں۔ آپ کی شہادت کا بیان دراصل حدیث کی تشریعی حیثیت اور اس کے حجت ہونے کا بیان بھی ہے۔ اس پر مفصل کلام مستقل عنوان سے ہوگا ان شاء اللہ۔

(٤) مُحق

شاھد کی ایک حیثیت مُحق کی ہے۔ مُحق یعنی حق بات بتانے والا۔ شاھد یقینی طور پر سچی اور حق بات سے آگاہ کرتا ہے۔ جس دعوے پر آپ کو گواہ بنایا گیا وہ حق ہے۔ واقع کے مطابق اور حقیقت کے

موافق ہے۔ آپ کا قول، فعل، سکوت، رفتار و گفتار، حرکت و سکون سب شہادت اور وجود حق کا گواہ ہے اور حق ہے۔ محق ہونے کی حیثیت بھی احادیث رسول کی تحریری حیثیت کو واضح کرتی ہے۔

اللہ حق ہے۔ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ سو یہ اللہ ہے رب تمہارا سچا۔ (یونس)

اسکی مخلوق اور اس کا بنانا حق ہے۔

مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ یوں ہی نہیں بنایا اللہ نے یہ سب کچھ مگر تدبیر کے ساتھ (یونس)

آپ کی تشریف آوری حق ہے اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بیشک ہم نے تجھ کو بھیجا سچا دین دیکر۔

قرآن حق ہے۔ اِنَّا اَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔ بیشک ہم نے اتاری تیری طرف کتاب سچی (النساء)

آپکا دین حق ہے۔

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ۔

اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ھدایت اور سچا دین دیکر (الصف)

اور اسی حق سے آپ نے آگاہ فرمایا

(۵) صادق اور مصدق

سچا ہونا گواہ کی لئے شرط ہے۔ گواہ اگر سچا نہ ہو تو مقام شہادت پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ آپ کی صداقت و سچائی کا بیان بھی ہے۔ شاھد کی ایک حیثیت مصدق یعنی تصدیق کرنے والے کی ہوتی ہے۔

ابن عاشورؒ نے فرمایا

فالشاهد المخبر بتصديق احد او تكذيبه فيما ادعاه او ادعى به عليه (الفتح۔۸)	شاھد جو کسی ایک کی تصدیق یا تکذیب کرتا ہے جس بات کا اس نے دعوی کیا یا اس کے ساتھ اس پر دعوی کیا گیا۔

آپ حق کے ساتھ آئے اور سچ لے کر آئے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ۔ اور جو لیکر آیا سچی بات۔ (الزمر)

تمام انبیاء کی تصدیق کی

صَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ۔ سچا مانتا ہے سب رسولوں کو۔ (الصافات)

جو کتاب وحکمت انہیں ملی اس کی تصدیق کی۔

مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ۔ سچا بتائے تمہارے پاس والی کتاب کو۔ (آل عمران)

جو کتاب آپ کو ملی وہ پہلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ۔ تصدیق کرنے والی سابقہ کتابوں کی (المائدہ)

روز قیامت آپ سارے نبیوں کی اور اپنی امت کی تصدیق فرمائیں گے۔

(۶) مجتنب اور بری

شاھد جیسے حق بات کی اور مدعی کی تصدیق کرتا ہے ویسے ہی مخالف دعوے کی تردید بھی کرتا ہے۔ پیغمبر ﷺ نے باطل عقائد، غلط رسوم، برے اعمال، ظالمانہ نظام، فاسد فکر اور گندی تہذیب و ثقافت سے اجتناب برتا۔ اور ان سے براءت کا اعلان کرتے ہوئے فرمایا۔

اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ	اور میں بیزار ہوں تمہارے شرک سے۔ (الانعام)
وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ	اور اگر تجھ کو جھٹلائیں تو کہہ میرے لئے میرا کام
عَمَلُكُمْ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ مِمَّآ اَعْمَلُ	اور تمہارے لئے تمہارا کام۔ تم پر ذمہ نہیں میرے
وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ۔	کام کا اور مجھ پر ذمہ نہیں جو تم کرتے ہو۔ (یونس)

(۷) مخبر

شاھد مخبر یعنی حقیقی خبر دینے والے کی حیثیت بھی رکھتا ہے۔ اس معنی میں بھی آپ ﷺ شاھد ہیں۔ آپ نے ذات وصفات، مبدا و معاد، آغاز و انجام اور ماضی و مستقبل کی یقینی خبریں دیں۔

اللہ تعالی سورہ ہود میں فرماتے ہیں

تِلْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهَآ اِلَيْكَ۔ یہ باتیں منجملہ غیب کی خبروں کے ہیں کہ ہم بھیجتے ہیں تیری طرف

اللہ کی توحید وہ دعوی ہے جو آپ ﷺ لے کر آئے۔ یہ سب سے بڑی، سچی اور یقینی خبر ہے۔

والوحدانية اظهر من الشمس۔ اللہ کی یکتائی سورج سے زیادہ روشن ہے۔ (رازی۔ احزاب)

(۸) مقر

شاھد مقر یعنی اقرار کرنے والا بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

اے پیغمبر وہ وقت یاد کریں جب آپ کے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو نکالا اور

اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟

بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا بولے ہاں ہے ہم اقرار کرتے ہیں۔ (الاعراف۔۱۷۲)

تفسیر السعدی میں ہے

قالوا بلی قد اقررنا انہوں نے کہا یقیناً ہم نے اقرار کیا ہے۔

مفسر ابن عاشور شہادت علی النفس کے متعلق فرماتے ہیں

والاشهاد على الانفس يطلق على اور نفس پر شہادت دینے کا اطلاق اس بات پر ہوتا

ماهساوی الاقرار او الحمل علیه و ہے جو اقرار کے مساوی ہو یا اس پر حمل کیا جائے اور

هو هنا حمل علی الاقرار یہاں اسے اقرار پر حمل کیا گیا ہے (الاعراف۔۱۷۲)

روح المعانی میں ہے۔

ان هذه الاية اصل فی الاقرار اقرار میں یہ آیت اصل ہے (اعراف۔۱۷۲)

اس عہد الست میں سب سے پہلے آپ ﷺ ہی کی روح مبارک نے جواب دیا اور اللہ کی ربوبیت کا اعتراف کیا۔ عالم شہادت میں جو کچھ آپ ﷺ پر اتارا گیا سب سے پہلے آپ خود اس پر ایمان لائے۔ اسکی حقانیت وسچائی کا اقرار کیا اور فرمایا۔

لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ۔

کوئی نہیں اس کا شریک اور یہی مجھ کو حکم ہوا اور میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔ (الانعام)

دوسری جگہ فرمایا

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ مان لیا رسول نے جو اس پر اترا اسکے رب کی طرف سے

یہاں واضح کیا گیا کہ ایمان کے حکم میں رسول کے ایمان کو اصل اور مومن تابع ہیں۔ ما انزل الیہ کا رسول نے سب سے پہلے اقرار کیا

(۹) مظهر

مظہر کے معنی ہیں اظہار کرنے والا۔ شاھد مظہر بھی ہوتا ہے۔

وشهد الشاهد عند الحاكم اى اور گواہ نے حاکم کے پاس گواہی دی یعنی اپنا علم

بین ما یعلمه واظهره۔ بیان کیا اور اس کو ظاہر کر دیا۔ (تاج العروس)

شاھد حق کو بیان کرتا ہے۔ باطن کو کھولتا ہے۔ اندر کی بات باہر نکالتا ہے۔ پوشیدہ حقائق تراشیدہ نگینوں کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے حق کو ظاہر کیا۔ ہدایت کے چراغ روشن کیے۔ ظلمات اور اندھیروں میں سے سچائی وراستبازی کا منور آفتاب نکالا۔ کیسے وقت اور کیسے عالم میں؟ یہ سیرت پڑھنے والوں پر روشن ہے۔ شاھد اظہار حق کے ساتھ مخالف پر غالب آ جاتا ہے۔

عربی میں اظہار کا صلہ علی ہو تو بلندی اور غلبے کا معنی دیتا ہے۔ (لغات القرآن)

اللہ نے آپ ﷺ کو غالب بنا کر بھیجا۔ شاھد کی یہ حیثیت سامنے رکھی جائے تو اہل مکہ پر رسول اللہ ﷺ کے غلبے کی پیشین گوئی سامنے آتی ہے۔ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہونے والی سورہ مزمل میں ارشاد ہے۔

اِنَّآ اَرْسَلْنَآ اِلَيْكُمْ رَسُوْلًا شَاهِدًا عَلَيْكُمْ۔

ہم نے بھیجا تمہاری طرف رسول بتلانے والا تمہاری باتوں کا (المزمل)

اور دوسرے مقام پر بتایا گیا کہ آپ کا دین تمام ادیان پر غالب رہے گا۔ وہاں بھی اظہار بصلہ علی استعمال ہوا۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ (الصف)

وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول راہ کی سمجھ دے کر اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے

(۱۰) عارف

عارف معرفت اور پہچان رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ شاھد عارف بھی ہوتا ہے۔

العارف بالشئی شاهدا ومشاهدا کسی چیز کی پہچان رکھنے والا گواہ اور مشاہدہ کرنے

(رازی۔البقرہ۔۱۴۳) والا ہے۔

جس چیز پر آپ گواہ ہیں۔ وہ اللہ کی وحدانیت اور اس کی توحید ہے۔ پورا دین اسی کی تفصیل اور یہی اس کا محور ہے۔ امتوں پر گواہی اسی کے قبول و عدم قبول سے متعلق ہے۔ مظاہر فطرت اسی کے دلائل ہیں۔ غیب کے پوشیدہ حقائق اللہ کے عظمت و قدرت اور تنزیہ و تقدیس کی داستان ہیں۔ اللہ کا امر ہی عالم غیب و شہادۃ کی روح ہے۔ اور حضور پر نور ﷺ اس کی کامل ترین معرفت رکھتے ہیں۔ احادیث و سیرت اس پر شاھد ہیں۔ کمال معرفت کی وجہ سے ہی آپ علیہ الصلاۃ والسلام عبداللہ اور داعی الی اللہ ہیں۔ معرفت پر کلام داعی الی اللہ کے ضمن میں ہوگا۔ انشاءاللہ

(۱۱) امین

شاھد ایک حیثیت سے امین بھی ہوتا ہے۔ صدق و یقین اور امانت و دیانت لازم و ملزوم ہیں۔ شاھد اپنی بات پوری امانت و دیانت سے بتاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ اس کی زد کس پر پڑتی ہے۔ لسان العرب میں ہے

الشھید من اسماء اللہ الامین	شہید اللہ کے ناموں میں سے ہے۔
فی شھادتہ۔	وہ اپنی گواہی میں امین ہے۔

دنیا و آخرت دونوں جہانوں میں آپ کی گواہی امانت پر مبنی ہے۔ آپ ﷺ کی صداقت و امانت کے تو دشمن بھی معترف تھے۔ قبل از نبوت ہی آپ ﷺ صادق و امین کے لقب سے مشہور تھے۔ پیغام توحید آپ ﷺ نے بلا کم و کاست پہنچایا۔ اللہ کے حکم سے سر مو انحراف نہ کیا۔ ذرہ برابر بھی خیانت نہ کی۔ کوئی ایسی بات جس کا تعلق امت کی صلاح و فلاح سے تھا آپ نے نہ چھپائی۔ ارشاد ربانی ہے۔

مَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ۔	اور یہ غیب کی بات بتانے میں بخیل نہیں۔

تفسیر ابن کثیر میں حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

لو کتم محمد صلی اللہ علیہ وسلم	محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی کتاب میں سے جو کہ ان
شیئا مما اوحی الیہ من کتاب اللہ لکتم	کی طرف وحی کی گئی اگر کچھ چھپاتے تو یہ آیت ضرور

تخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ و تخشی	چھپا لیتے تُخْفِي فِي نَفْسِكَ مَا اللَّهُ مُبْدِيهِ
الناس واللہ احق ان تخشہ۔ (الاحزاب)	وَتَخْشَى النَّاسَ وَاللَّهُ أَحَقُّ أَنْ تَخْشَاهُ۔

کیونکہ اللہ نے اس آیت میں عتاب فرمایا ہے اور اپنے حبیب کو باانداز محبت ڈانٹا ہے۔ شاھد کی صفت آپ کی امانت کا بیان بھی ہے

(۱۲) رقیب و مھیمن

رقیب نگران اور مھیمن خبر رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ بھی شاھد کی حیثیتیں ہیں۔ شاھد مدعی کی حجت اور مدعا علیہ کے جواب دونوں کا نگران ہوتا ہے۔ اپنی شہادت کی خبر رکھتا ہے۔ حضور ﷺ امت کے نگران اور ان کے اعمال کی خبر رکھتے ہیں۔

ولما کان الشھید کالرقیب جئی	اور جب شہید رقیب کی مانند ہے۔ تو (اسکے
بکلمۃ الاستعلاء۔	کے لئے) کلمہ استعلا (علی) لایا گیا۔ (یعنی
(النسفی۔البقرہ۔۱۴۳)	علیکم شہیدا کہا گیا)

خاتم المحدثین شاہ عبدالعزیز دہلوی فرماتے ہیں

پیغمبر نور نبوت کے سبب ہر شخص کی دیانت و امانت کا درجہ بخوبی جانتا ہے۔ کہ کس درجے تک ان کا نور ایمان پہنچا ہے۔ اور کون سا امر ترقی سے مانع ہوا ہے۔ (تفسیر عزیزی۔البقرہ۔ ۱۴۳)

حضور ﷺ بحیثیت شاھد رقیب اور نگران ہیں۔ آپ کی یہ نگرانی کس طرح ہے؟ مذکورہ عبارت میں حضرت شاہ صاحب نے یہی بات واضح فرمائی ہے۔ اس کی مزید وضاحت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو کسی علم میں کمال اور کسی فن میں کامل دستگاہ رکھتا ہو وہ اس کی باریکیاں دوسروں سے زیادہ جانتا ہے۔ معمولی باتوں سے غلطی اور خرابی کا اندازہ کر لیتا ہے۔ ایک موٹر مکینک گاڑی کی محض آواز سن کر اس کی درستگی اور خرابی کا حال جان لیتا ہے۔ ایک حکیم کو مریض کی حرکات و سکنات اور چہرے مہرے سے بیماری کا بہت کچھ حال پتہ چل جاتا ہے۔ وہ بظاہر مضر نظر آنے والی چیز کو مفید بتاتا ہے اور کبھی اس کے برعکس کہتا ہے۔ گویا صرف آواز سن کر گلے میں خنا کی حالت محسوس کر لیتا ہے۔ اسی طرح

تزکیہ نفس کرنے والا شیخ مرید کی باطنی حالت پر مطلع ہو جاتا ہے۔ اس کے مرض، سبب مرض اور علاج کو جان لیتا ہے۔ فرائض و واجبات کے علاوہ کبھی بڑی نیکی سے ہٹا کر بظاہر چھوٹی اور غیر اہم عبادت پر لگا دیتا ہے۔ اگرچہ اسے معلوم ہے کہ فی الواقع یہ اہم عبادت ہے لیکن یہ بھی جانتا ہے کہ مرید کی بیماری میں اس سے اضافہ ہو رہا ہے۔ مرید کی باطنی ترقی کتنی ہوئی اس کا بھی مرشد کو علم ہو جاتا ہے۔ کبھی کشف والہام سے مرشد کو ان کا علم ہوتا ہے اور کبھی اتقاء و تجربے سے۔ اور کبھی مرید کے بتانے سے اصل سبب معلوم ہو جاتا ہے۔ جب ادنیٰ درجے کے لوگوں کی یہ حالت ہے تو نبی جو کتاب و حکمت کا معلم اور نفوس کا مربی ہوتا ہے۔ امتی جس کے سامنے طفل مکتب کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ اس کو نور نبوت یعنی وحی سے امتی کی حالت بدرجہ اولیٰ معلوم ہوگی کہ ترقی کتنی ہے اور اس میں رکاوٹ اور اس کا سبب کیا ہے۔ کس نے دعویٰ قبول کیا کس نے رد کیا۔ کہاں کس نے راہ حق کو چھوڑا اور آپ ﷺ کے اُسوہ سے انحراف کیا۔ احادیث میں آپ کی مختلف مزاجوں کی رعایت کرتے ہوئے تعلیم دینے کی جو مثالیں ملتی ہیں وہ اسی اصل پر مبنی ہیں۔ اپنی حیات میں خبر گیری آپ کا کام اور حدود شریعت قائم رکھنا آپ کا فرض تھا۔ بعد الوفات کتاب وسنت کو سمجھنے والے اور اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے علماء اس کے ذمہ دار ہیں۔ نگرانی کی ایک صورت وہ ہے جس کا ذکر ابن عاشور نے (الاحزاب۔۴۵) میں کیا ہے۔

فالرسول صلی اللہ علیہ وسلم	سابقہ شریعتوں میں سے جو درست ہے رسول اس کی
شاهد بصحته ما هو صحيح من	صحت کا گواہ ہے۔ اور اس کی بقا کا شاہد ہے جسے باقی
الشرائع وبقاء ماهو صالح للبقاء	رکھنا درست ہے۔ ان سے چمٹے ہوئے باطل کے بطلان
منها ويشهد ببطلان ما الصق بها و	کی اور ان کے احکام میں سے جو باقی رکھنا مناسب نہیں
بنسخ ما لاينبغي بقائه من احكامها	ان کے منسوخ ہونے کی شہادت دیتا ہے۔ اس خبر کے
بما اخبر عنهم في القرآن والسنة	ساتھ جو قرآن وسنت میں ان کے بارے میں دی ہے

رہا بعد الوفات عرض اعمال اور نگرانی کا مسئلہ تو وہ عنقریب مفصل ذکر ہوگا۔

(۱۳) نصیر

شاہد ایک لحاظ سے مددگار بھی ہوتا ہے۔ وہ اپنی شہادت سے مدعی کی مدد کرتا ہے۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

واطلق النصير على طريق الكناية	اور کنائے کے طور پر شاہد کو مددگار کہا گیا۔
فان الشاهد يؤيد قول المشهود	بیشک شاہد مدعی کی تائید کرتا ہے اور مخالف
فينصره على معارضه	قول پر مدعی کی مدد کرتا ہے۔ (البقرۃ۔۱۴۳)

امت کا تزکیہ اور انبیاء کی تائید کر کے قیامت کے دن آپ ان کی مدد فرمائیں گے۔ عالم دنیا میں اللہ نے آپ ﷺ کو دین کا سب سے بڑا مددگار بنایا۔ آپ ﷺ نے اپنی جان مال سے دین کی تائید اور مدد کی۔ اس کی خاطر پتھر کھائے۔ گالیاں سنیں۔ الزام سہے۔ مقاطعہ برداشت کیا۔ بھوک کاٹی۔ وطن چھوڑا۔ جنگیں لڑیں۔ مقدس خون بہایا، زخم لگے۔ دانت مبارک شہید کروائے۔ احباب و جانثاروں کو راہ حق میں قربان کیا۔ غموں کے پہاڑ سر کیے۔ دکھوں کے سمندر پاٹے۔ محنت مسلسل محنت کی۔ مصائب کے کٹھن مراحل سر کیے۔ 23 سال مسلسل وادی کرب و بلا سے گزرے۔ پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔ ثبات میں تغیر نہ ہوا۔ ہمیشہ حق کا نغمہ گایا۔ کوئی مصلحت اندیشی کی نہ مداہنت برتی۔ یہاں تک کہ دین جزیرۃ العرب میں سارا اللہ کا ہو گیا۔

(۱۴) دلیل

شاہد مدعی کے دعوے پر دلیل ہوتا ہے۔ اس لئے دلیل کو بھی شاہد کہتے ہیں۔

امام رازی نے فرمایا

ثم سميت الدلالة على الشيء	پھر کسی چیز پر دلالت کرنے والی شے کا نام
شاهدا على الشيء، لانها هي	شاہد رکھا گیا۔ کیونکہ اس کی وجہ سے شاہد
التي بها صار الشاهد شاهدا۔	گواہ بنتا ہے۔ (البقرہ۔۱۴۳)

دلیل وہ چیز ہے جس سے کسی بات پر استدلال کیا جاتا ہے۔ جیسے دھوپ طلوع آفتاب کی دلیل ہے۔ لا الہ الا اللہ دعویٰ ہے۔ محمد رسول اللہ اس کی دلیل ہے۔ اللہ واحد اور احد ہے۔ اس کا کوئی

شریک نہیں۔ آپکا مقدس وجود، مبارک اعمال اور عمدہ ترین اخلاق اس کے گواہ ہیں۔ دعویٰ توحید کا ہے اور اسکی اعظم واجل دلیل رسالت مآب ﷺ کی ذات ہے۔ پہلے اس عنوان پر بات ہو چکی ہے۔

(۱۵) عادل

شاھد کیلئے عادل ہونا ضروری ہے۔ شاھد کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں وہ اسی وقت معتبر ہوں گے جب یہ عادل ہو۔ آپ ﷺ کو شاھد کہا تو عدالت خود بخود لازم ہوگئی۔ آپ ﷺ شاھد مطلق ہیں اس لئے مطلقاً خیر اور سراپا خیر ہیں۔ عدل سے توازن اور مساوات پیدا ہوتی ہے۔ آپ ﷺ وہ دین لائے جس نے حقوق اللہ اور حقوق العباد میں توازن پیدا کیا۔ پھر ان حقوق میں حق اور فرض کی نسبت قائم کر کے مساوات پیدا کی۔ توازن اور تناسب سے حُسن اور خوبصورتی جنم لیتی ہے۔ عدل کی وجہ سے آپ کی شریعت حسین اور خوبصورت ہے۔ یہ شاھد ایسا عادل ہے کہ اس کی اُمت کو منصب عدالت ہی اس کے فیض سے ملا۔ کیونکہ امت پیغمبر کے کمالات کی مظہر ہوتی ہے۔ اس میں ہر خیر پیغمبر کی طرف سے آتی ہے۔ اس عادل کی عدالت سے بااصول دشمنوں کو بھی مجال انکار نہیں۔ دنیا میں عدل وانصاف کی زمزمہ خوانی اسی عادل کے دست عدالت کا کرشمہ ہے۔ آپ ﷺ کا دین معتدل، اُمت معتدل، سنن معتدل، اعمال معتدل، اخلاق معتدل، مبارک مزاج اور طبیعت معتدل ہے۔

شاھد کا فرض

شہادت کشف حقیقت کا نام ہے اس لئے شاہد کا شف حقیقت ہوتا ہے کیونکہ مدعی کا دعویٰ خلاف ظاہر مگر برطابق حقیقت ہوتا ہے۔ شاہد اسی حقیقت کو کھولتا ہے۔ حضور کو شاہد کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ حقائق کا انکشاف کرنے والے ہیں۔ یہی شاہد کی ذمہ داری ہے اگر وہ حقیقت کو چھپائے تو مجرم اور گنہ گار ہے۔ شاہد کا فرض ہے کہ کسی کی پرواکیے بغیر حقیقت کو واضح کردے اور کوئی بات جو شہادت سے متعلق ہو نہ چھپائے۔ اللہ فرماتا ہے

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ کَتَمَ شَھَادَۃً عِنْدَہٗ مِنَ اللّٰہِ

اور اس سے بڑا ظالم کون جس نے چھپائی وہ گواہی جو ثابت ہو چکی اس کو اللہ کی طرف سے۔

آپ ﷺ کی اسی حیثیت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ۔	اے رسول پہنچادے جو تجھ پر اترا تیرے رب کی طرف سے اور اگر ایسا نہ کیا تو تو نے کچھ نہ پہنچایا اس کا پیغام

جو کچھ آپ کو ملا وہ حقیقت ہے۔ آپ ﷺ پر لازم ہے شہادت کی ذمہ داری پوری کریں۔ اور حقائق کو کھول کر بیان فرمائیں اگر آپ ﷺ نے ایسا نہ کیا تو گویا شہادت کی ذمہ داری ادا نہ کی۔ مومن تو

لَا یَخَافُوْنَ لَوْمَۃَ لَآئِمٍ — کسی کے الزام سے نہیں ڈرتے

پس آپ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہ کریں۔ چنانچہ حضور ﷺ نے حقائق کو کھولا اوہام وظنون کے پردے چاک کیے۔ اشیاء کی اصلیت سے آگاہ فرمایا۔ کیوں کا سراغ لگایا۔ ہر حقیقت بتائی۔ اور کوئی بات جو شہادت کے متعلق تھی صیغہ و راز میں نہیں رکھی۔ پھر کیسے کوئی کہہ سکتا ہے کہ آپ ﷺ نے موجود قرآن سے کہیں زائد امت سے چھپا کر علی رضی اللہ عنہ کے حوالے کر دیا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ نے جو قرآن جمع کیا وہ ناقص اور نامکمل ہے۔ یہ بات کہنا آپ ﷺ کے دامن شہادت پر کتنا بڑا داغ لگاتا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ بنتا ہے کہ معاذ اللہ آپ ﷺ نے شاہد کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی۔ اسی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کا دین ہر لحاظ سے کامل اور محفوظ ہے۔ اس لئے کہ آپ ﷺ کی شہادت کامل علی الاطلاق ہے۔ اور یہ کمال اسی وقت ہوسکتا ہے جب آپ ﷺ نے پورا دین آگے منتقل کیا ہو۔ اگر آپ ﷺ نے دین کی وہ بات چھپائی نجات اور رضاء الٰہی کیلئے جس پر عمل ضروری ہے تو دین کا ناقص اور غیر محفوظ ہونا لازم آتا ہے۔ اور یہ نقص آپکی گواہی میں نقص پیدا کرتا ہے کیونکہ پورے عالم پر آپ ﷺ کی گواہی اسی دین کے واسطے سے ہے۔

شہادت کا تعلق:

بعض مفسرین نے یہ شہادت آخرت کے متعلق قرار دی ہے۔ اس لحاظ سے دنیا میں آپ حامل الشہادۃ (بار شہادت اٹھانے والے) اور آخرت میں مؤدی الشہادۃ (شہادت ادا کرنے والے) ہیں۔ جیسا کہ حضرت تھانوی نے بیان القرآن میں فرمایا۔ امام رازی سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۴۳ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

فبین انه یکون شاهدا علیهم فی المستقبل ولان حمله علی الشهادة فی الاخرة حقیقه و حمله علی البیان مجاز و الحقیقة اولی (حرل-۱۵)

پس واضح کر دیا کہ آپ مستقبل میں ان پر گواہ ہوں گے۔ کیونکہ اسے شہادۃ آخرت پر حمل کرنا حقیقت اور (حق بیان کرنے والے کی حیثیت سے) دنیاوی شہادت پر حمل کرنا مجاز ہے۔ اور حقیقت اولیٰ ہے۔

لیکن انہی کے کلام اور دیگر مفسرین کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آپ ﷺ دنیا و آخرت میں حقیقی گواہ ہیں۔ اور یہی بات آپ ﷺ کے شایان شان ہے۔ مفسرین کے کلام سے درج ذیل گواہیوں کا سراغ ملتا ہے۔

(۱) شاھد الانبیاء

دنیا میں تمام انبیاء کے حق میں گواہی دی کہ سب امین اور سچے تھے۔ اور انہوں نے تبلیغ میں کوتاہی نہیں کی۔ قیامت کے دن بھی انبیاء کے دعوے کی تصدیق کریں گے۔ تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔

شاهدا للرسل بالتبلیغ۔ رسولوں کے حق میں تبلیغ کے گواہ ہیں۔ (البغوی۔ الاحزاب)

ابوحیان فرماتے ہیں۔

تشهد علی صد قهم آپ ان کی سچائی پر گواہ ہوں گے۔ (البحر المحیط۔ الاحزاب)

(۲) گزشتہ امتوں پر گواہ

گذشتہ امتوں کے متعلق دنیا میں بتایا کہ انہوں نے انبیاء کی تکذیب کی۔ اور روز قیامت بھی گواہی

دیں گے کہ منکرین جھوٹے جبکہ انبیاء اور ان کے ساتھی سچے ہیں۔ ممکن ہے یہ انبیاء کے حق میں دیئے جانے والی گواہی کے ضمن میں ہو۔ آپ ﷺ انبیاء کی تصدیق کریں گے اور منکرین کی خود بخود تکذیب ہو جائیگی۔ علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں فرمایا

شاهد اعلی امته بالتبلیغ الیهم وعلی سائر الامم بتبلیغ انبیاء هم الیهم۔

اپنی امت پر گواہ کہ انہیں تبلیغ کی اور تمام امتوں پر گواہ کہ ان کے نبیوں نے بھی پوری تبلیغ کی۔ (الاحزاب۔۴۵)

تفسیر روح المعانی میں آتا ہے۔

وقیل المراد شاهدا علی جمیع الامم یوم القیامة بان انبیاء هم قد بلغوهم الرسالة ودعوهم الی الله تعالی

شاھد کی مراد بتاتے ہوئے کہا گیا آپ قیامت کے دن تمام امتوں پر گواہی دیں گے کہ انبیاء نے انہیں پیغام پہنچایا تھا اور اللہ کی طرف دعوت دی تھی (الاحزاب۔۴۵)

(۳) اپنی امت پر گواہی

آپ ﷺ کی امت کے دو حصے ہیں۔ امت اجابت اور امت دعوت۔ دونوں پر دنیا اور آخرت میں گواہ ہیں۔ بحالت حیات آپ ﷺ خود گواہ تھے۔ آپ ﷺ نے اللہ کا پیغام پہنچایا۔ حق واضح کیا۔ اللہ کی حجت تمام کی۔ ماننے والوں کے اعمال و اخلاق وغیرہ کی نگرانی کی۔ بعد الوفات آپ ﷺ کی کتاب و شریعت گواہ و نگران ہے۔ ابن عاشور میں ہے

فاما الدنیویة فشهادة الرسول علینا فیها هی شهادته بذاته علی معاصریه وشهادة شرعه علی الذین اتوا بعده انما بوفائهم ما اوجبه علیهم شرعه واما بعکس ذالك (البقرة۔۱۴۳)

اور رہی دنیاوی شہادت تو دنیا میں ہم پر رسول کی شہادت ایک تو ذاتی ہے جو اپنے زمانے کے لوگوں پر ہے۔ اور دوسری آپ کے بعد آنے والے لوگوں پر آپ کی شریعت کی شہادت ہے۔ وہ یہی ہے جو چیز آپ کی شریعت نے ان پر لازم کی وہ اسے پورا کریں۔ اور یا اس کے برعکس

تفسیر البقاعی میں ہے۔

شاهدا على افعالهم من كفر و ايمان وطاعة وعصيان من كان بحضرتك فلنفسك ومن كان بعد موتك اوغائبا عنك فبكتابك (الفتح-٨)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے افعال مثلاً کفر، ایمان، طاعت اور عصیان پر گواہ ہیں۔ جو آپ کی زندگی میں آپ کے سامنے تھے ان پر بذات خود گواہ ہیں۔ اور جو آپ کی وفات کے بعد ہیں یا آپ کی زندگی میں آپ سے غائب تھے ان پر آپ کی گواہی اپنی کتاب کے ذریعے ہے۔

موطا کی روایت تركت فيكم امرين (میں تم میں دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں) سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ روز قیامت امت اجابت پر گواہ ہوں گے اور ان کی تعدیل وتزکیہ فرمائیں گے۔

آپ نے فرمایا۔

يجئ النبي يوم القيامة ومعه الر جل ومعه الرجلان او اكثر من ذالك فيدعى قومه فيقال لهم هل بلغكم هذا فيقولون لا فيقال له هل بلغت قومك فيقول نعم فيقال له من يشهد فيقول محمد وامته فيدعى بمحمد وامته فيقال لهم هل بلغ هذا قومه فيقولون نعم فيقولون وما علمكم فيقولون جاء نا نبينا صلى الله عليه وسلم فاخبرنا ان الرسل قد بلغوا (ابن کثیر۔البقرة-۱۴۳)

نبی روز قیامت آئیں گے۔ کسی کے ساتھ ایک کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ دو سے زائد آدمی ہوں گے۔ ہر ایک کی امت کو بلا کر سوال کیا جائے گا۔ کیا تمہیں یہ پیغام پہنچا تھا؟ وہ انکار کریں گے تو ہر نبی سے سوال ہو گا کیا تم نے اپنی قوم کو پیغام پہنچایا تھا؟ نبی اقرار کریں گے تو کہا جائے گا تمہارا گواہ کون ہے وہ محمد اور آپ کی امت کا نام لیں گے۔ محمد اور ان کی امت کو بلا کر پوچھا جائے گا۔ کیا اس نبی نے پیغام پہنچا دیا تھا۔ یہ کہیں گے کہ ہاں۔ ان نبیوں کی امتیں جرح کریں گے تمہیں کیسے علم ہوا۔ یہ کہیں گے ہمیں ہمارے پیغمبر نے آ کر خبر دی کہ رسولوں نے تبلیغ کی۔

ابن کثیر کی ایک روایت میں مثال کے طور پر نوح علیہ السلام اور ان کی امت کا ذکر ہے۔ آپ

کہیں گے کہ میں نے تبلیغ کر دی تھی۔ امت کہے گی

ما اتانا من نذير وما اتانا من احد

ہمارے پاس رسولوں میں سے کوئی ایک بھی ڈرانے والا نہیں آیا۔

نوح علیہ السلام گواہ کے طور پر محمد ﷺ اور ان کی امت کو پیش کر دیں گے۔

فتدعون فتشهدون له بالبلاغ ثم اشهد عليكم۔

پھر تم آ کر ان کی تبلیغ کی گواہی دو گے پھر میں تم پر گواہی دوں گا۔

آپ کی گواہی کیا ہو گی؟ علامہ آلوسی نے نقل کیا۔

فيؤتى بمحمد فيسئال عن حال امته فيزكيهم و يشهد بعدالتهم (البقرة)

پس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بلایا جائے گا۔ آپ سے امت کا حال دریافت ہو گا۔ سو آپ ان کا تزکیہ کریں گے اور ان کی عدالت کی گواہی دیں گے۔

امت اجابت کی طرح امت دعوت پر بھی آپ ﷺ گواہ ہوں گے۔ دوسری امتوں کی طرح آپ ﷺ کی امت دعوت بھی تبلیغ کی منکر ہو گی۔ جیسا کہ فرمایا۔

وَجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰؤُلَاءِ شَهِيْدًا اور تجھ کو لائیں بتلانے کو ان لوگوں پر (النحل-۸۹)

ابن عاشور میں ہے۔

وقد اصطلح القرآن على اطلاق اشارة (هو لاء) مرادا بها المشركون

قرآن کی مقررہ اصطلاح میں ہؤلاء کے اشارے سے مشرک مراد ہوتے ہیں۔ (النساء-۴۱)

مزید فرماتے ہیں۔

وبعث شهيدا من كل امة يفيد ان محمدا شهيدا على هو لاء الكفرين

ہر امت میں سے گواہ کھڑا کرنا فائدہ دیتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی یقیناً اپنی امت کے کافروں پر گواہ ہوں گے۔ (النحل-۸۴)

علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

والمراد بهولاء امته صلى الله عليه وسلم عند اكثر المفسرين

اکثر مفسرین کے نزدیک ھولاء سے مراد آپ کی امت ہے۔ (روح المعانی، النحل-۸۹)

اپنی امت کے کفار پر آپ کی گواہی کی تین صورتیں ہیں۔

(۱) مسلمانوں کا تزکیہ وتعدیل کرنے سے بطریق لزوم کافروں کے خلاف گواہی ہو جائے گی۔

(۲) مسلمان کافروں پر گواہ ہوں اور آپ ﷺ مسلمانوں کی تصدیق فرمائیں۔

جیسا کہ امام مجاہد فرماتے ہیں۔

تکونوا شهداء لمحمد علیه السلام علی الامم الیهود والنصاری والمجوس۔

تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے دیگر امتوں مثلاً یہودی، عیسائی اور مجوسیوں پر گواہ ہو جاؤ۔

(الطبری۔ البقرہ۔ ۱۴۳)

(۳) دیگر انبیاء کی طرح اپنی امت کے کافروں پر آپ ﷺ مستقلاً گواہی دیں

شهادته علیهم انه قد بلغهم رسالة ربه۔	ان پر آپ کی گواہی یہ ہوگی کہ آپ نے اپنے رب کا پیغام انہیں پہنچا دیا تھا۔

عرض اعمال:

شہادت کی تفسیر تزکیہ وتعدیل کے ساتھ ہو یا اعمال کے ساتھ دونوں صورتوں میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ شہادت علم کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا وفات کے بعد آپ ﷺ کو تمام حالات کا علم تھا جبھی گواہی بھی دیں گے اور ان لوگوں کو شناخت بھی فرمائیں گے جو تزکیہ وتعدیل کا استحقاق رکھتے ہیں۔ پس اس سے جہاں آپ کا عالم الغیب ہونا ثابت ہوتا ہے وہیں حاضر وناظر ہونا بھی۔ اس کا جواب یہ ہے۔

(۱) قرآن وسنت سے معلوم ہوتا ہے ہر نبی کے ساتھ اپنی قوم ہوگی۔ اسی طرح آپ کے ساتھ اپنی امت ہوگی۔ جو دو بڑے طبقوں میں بٹی ہوئی ہوگی۔ ایک طبقہ مومنوں کا ہوگا جن کے چہرے چمک رہے ہوں گے۔ دوسرا طبقہ کافروں کا ہوگا جن کے چہرے سیاہ کالے ہوں گے۔ پس یہ فرق شناخت کیلئے کافی ہوگا۔ ایک تیسرا طبقہ بھی ہوگا۔ اول اول جن کا حال آپ ﷺ سے پوشیدہ ہوگا۔ یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے آپ ﷺ کے بعد بدعتیں پھیلائیں خود بھی بھٹکے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔ روایات کے مطابق کامل مومنوں کی مانند ان کے اعضاء وضو بھی چمک رہے ہوں گے۔ حوض

کوثر پر آپ ﷺ کے پاس آنے کی کوشش کریں گے لیکن فرشتے روک لیں گے۔ آپ ﷺ فرمائیں گے

یارب امتی فیقال انك لا تدری ما احدثوا بعدك انهم بدلوا وغیروا فاقول سحقا سحقا لمن بدل بعدی۔	یارب میری امت۔ پس کہا جائے گا آپ نہیں جانتے انہوں نے آپ کے بعد کیا کیا۔ انہوں نے دین بدلا اور اس میں تغیر کیا۔ فرماتے ہیں میں کہوں گا بربادی ہے ہلاکت ہے اس کیلئے جس نے میرے بعد تبدیلی کی۔

فرشتوں کے بتانے سے ان کا حال بھی کھل جائے گا۔ کفار کی سیاہی اور ان کے حال کا اظہار اس بات کا اعلان ہوگا کہ یہ لوگ گواہی دینے یا تزکیہ قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ آپ کیساتھ وہی ایماندار ہوں گے جن کے بارے میں آپ کو پہلے خبر مل چکی ہے۔

جعلنکم امۃ وسطا ای خیار اعدولا ہم نے تمہیں مرکزی امت بنایا یعنی منتخب اور عدل والی امت باقی رہا یہ کہنا کہ عرض اعمال کے سبب سب آپ پر روشن ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ عرض اعمال تو خود عالم الغیب ہونے کے منافی ہے۔ دوسری بات یہ کہ بعد الوفات امت کے اعمال یقیناً آپ پر پیش کیے جاتے ہیں لیکن اجمالی طور پر نہ کہ تفصیلی طور پر۔ سیئات وحسنات کا اجمالی علم تو آپ کو ہو جاتا ہے لیکن امت کے افراد کو علی التعین آپ ﷺ نہیں جانتے۔ ھؤلاء سے آپ کی امت مراد لے کر علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

ولم یستبعد ان یکون المراد بهم ما یشمل الحاضرین وقت النزول وغیر هم الی یوم القیامة فان اعمال امته علیه الصلاة والسلام تعرض بعد موته	اور یہ مستبعد نہیں کہ ان کی مراد میں وقت نزول کے حاضرین اور قیامت تک آنے والے امتی شامل ہوں۔ یقیناً امت کے اعمال بعد الوفات آپ پر پیش ہوتے ہیں۔ (النحل۔ ۸۹)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں۔

ثم ان تحمل الشهادة علی من عاصره صلی اللہ علیه وسلم واطلع علی عمله	اپنے زمانے کے لوگوں پر شہادت دینا اور ان کے اعمال پر مطلع ہونا تو ظاہر بات ہے۔ اور رہا

امر ظاهر وانما تحملها على من بعده	اُن افراد پر گواہی دینا جو آپ کے زمانہ حیات کے
باعيانهم فان كان مرادا ايضا ففيه خفاء	بعد ہیں اگر اس کی بھی یہی مراد ہے تو اس میں ایک
لان ظاهر الاخبار انه عليه الصلاة و	پوشیدگی ہے۔ کیونکہ ظاہر روایات سے معلوم ہوتا
السلام لا يعرف اعمال من بعده	ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد الوفات اعمال کو ان
باعيانهم۔	کے کرنے والوں کے ساتھ نہیں جانتے۔ (الاحزاب۔ ۴۵)

اس کے بعد حوض کوثر سے ہٹائے جانے والوں کے متعلق اوپر کی روایت سے ملتی جلتی روایت پیش کی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے آپ ﷺ اعمال کرنے والے افراد کو نہیں جانتے ورنہ انکا حال آپ پر پہلے ہی ظاہر ہو جاتا۔ فرماتے ہیں۔

نعم قد يقال انه عليه الصلاة و	ہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ یقیناً آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام
السلام يعلم بطاعات ومعاص	ان طاعتوں اور معصیتوں کو تو جانتے ہیں جو آپ کے بعد
تقع بعده من امته لكن لا يعلم	آپکی امت سے واقع ہوئیں لیکن اطاعت کرنے والے
اعيان الطائعين والعاصين۔	اور گناہ کرنے والے افراد کو نہیں جانتے۔ (الاحزاب۔ ۴۵)

(۲) ممکن ہے صحابہ اپنے زمانے والوں پر گواہ ہوں۔ تابعین اپنے زمانے والوں پر اور تبع تابعین اپنے اہل عصر پر گواہ ہوں۔ آخر تک یہی سلسلہ چلتا چلا جائے اور آپ صرف صحابہ رضوان اللہ علیہم ہی کی تصدیق وتعدیل فرمائیں۔ جیسا کہ اہل عصر کا اجماع حجت ہونے پر استدلال کیا گیا ہے۔ امام رازی نے النحل آیت ۸۹ اور علامہ الوسی نے الحج آیت ۷۸ میں اس طرح کی بات ارشاد فرمائی۔ ایک روایت بھی اسی کی تائید کرتی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا روز قیامت حوض کوثر پر آنے کے بجائے میرے امتی جہنم کی طرف لے جائے جائیں گے۔ میرے سوال پر جواب ملے گا آپ نہیں جانتے۔ انھوں نے آپ کے بعد کیا کیا۔

فاقول كما قال العبد الصالح	پس میں وہی کہوں گا۔ جو اللہ کے نیک بندے عیسیٰ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا دُمْتُ	نے کہا۔ اور میں ان سے خبردار تھا جب تک ان
فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ	میں رہا پھر جب تو نے مجھ کو اٹھا لیا تو تو ہی تھا خبر

الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ	رکھنے والا ان کی (جواہر القرآن۔ بقرہ۔ ۱۴۳)

مقام شہادت

شہادت بھاری ذمہ داری اور بڑا اعزاز ہے۔ یہ اس معنی میں آپ کا ذاتی وصف ہے کہ آپ کو اللہ تعالی نے اس سے براہ راست نوازا اور دیگر انبیاء کرام علیہم التحیۃ والتسلیم کو آپ کے واسطے حاصل ہوا۔ حضور ﷺ نبی الانبیاء بھی ہیں اور شاہد الشہداء بھی۔ شاہد کسی مقدمے کا مرکزی کردار ہوتا ہے۔ اس کے الفاظ سند اور قول حجت ہوتا ہے۔ انہی پر مقدمے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ فریقین کا مستقبل شاہد کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ میدان محشر میں اللہ کے حضور جو مقدمہ پیش ہوگا وہ انسانی تاریخ کا سب سے بڑا، سب سے اہم اور اصل مقدمہ ہے۔ اللہ نے آپ ﷺ کو وہ جلیل منصب عطا کیا جس کی عظمت ورفعت صرف احساس کے پیمانوں سے ناپی جاسکتی ہے۔

الفاظ اس کی بلندی نہیں پاسکتے۔ آدم ﷺ سے قیامت تک تمام انسانوں بلکہ جنوں کا مستقبل اور ان کی قسمت کا انحصار آپ ﷺ کی مبارک زبان سے نکلنے والے الفاظ پر ہے۔ آپ ﷺ کی مبارک زبان حق بیان ہے۔ اس سے ادا ہونے والے الفاظ کسی کو ابدی مسرتوں سے ہم کنار کر دیں گے۔ اور کسی کے لئے ابدی جہنم کی نوید ثابت ہوں گے۔ ایک اور اعزاز اس اعزاز سے بھی برتر ہے۔ انبیاء اپنا بیان دیں گے۔ ان سے گواہ طلب کئے جائیں گے۔ آپ ﷺ کی امت پر جرح ہوگی۔ آپ ﷺ ان کا تزکیہ فرمائیں گے۔ لیکن آپ ﷺ کے لئے کسی گواہ اور تزکیے کی ضرورت نہیں سمجھی جائے گی۔ آپ کی ﷺ ذات برکت مآب پر اعتماد کرتے ہوئے آپ کی گواہی بغیر کسی جرح کے قبول ہوگی۔ علامہ الوسیؒ اللہ کے فرمان "تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں" کی تفسیر میں کیا خوبصورت بات لکھتے ہیں۔

ويدل هذا القول منه تعالى على قبول	اور اللہ کے اس قول سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی
شهادته عليه الصلاة والسلام لنفسه	اللہ علیہ وسلم کی گواہی آپ کی ذات کے لئے
اعتمادا على عصمته ولعل هذا من	آپ کی عصمت پر اعتماد کرتے ہوئے قبول ہو
خواصه صلى الله عليه وسلم في	گی۔ شاید قیامت کے دن یا اعتماد آپ کے

ذالك اليوم (الحج - ٧٨)

ساتھ ہی مخصوص ہو۔

حضرت تھانوی فرماتے ہیں

اے نبی آپ مٹھی چند معترضین کے طعن سے مغموم نہ ہوں اگر یہ سفہاء آپ کو نہ جانیں تو کیا ہوا ہم نے تو ان بڑی بڑی نعمتوں اور رحمتوں کا جو کہ خطاب مومنین میں مذکور ہوئی ہیں آپ ہی کو واسطہ بنایا ہے۔ اور آپ کے مخالفین کی سزا کے لئے خود آپ کا بیان کافی قرار دیا گیا ہے کہ ان کے مقابلے میں آپ سے ثبوت نہ لیا جاوے گا پس اس سے ظاہر ہے کہ آپ ہمارے نزدیک کس درجہ مقبول و محبوب ہیں (بیان القرآن - الاحزاب)

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا شہادت میں یہ کمال اور مرتبہ اس بات کی دلیل بھی ہے کہ آپ ﷺ اللہ کی مخلوق میں سب سے افضل اور اللہ کے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ یہ مقام اس بات کی علامت ہے کہ آپ ﷺ نبی الانبیاء ہیں کیونکہ آپ تزکیہ الشہود کے مقام پر فائز ہیں۔ تزکیہ کرنے والا مزکی سے افضل ہوتا ہے۔ نبوت میں اشتراک کے ساتھ آپ ﷺ کی فضیلت نبی الانبیاء ہونے کے علاوہ اور کیا ہے؟ یہی آپکے خاتم النبیین ہونے کی دلیل بھی ہے شہادت وظیفہ نبوت ہے جس کا نقطہ انتہا، نقطہ کمال اور نقطہ آخر آپ کی ذات ہی ہے۔ یہی خاتمیت مرتبی ہے جسے خاتمیت زمانی لازم ہے۔ جب مرتبوں میں آپ آخر ہیں تو آمد میں بھی آپ ہی آخر ہوں گے۔ اور مفسر ابن عاشور رحمہ اللہ نے ایک باریک نکتہ یوں بیان فرمایا

وان التزكية اصل عظيم فى الشهادة وان المزكى يجب ان يكون افضل واعدل من المزكى وان المزكى لا يحتاج للتزكية۔ وان الامة لا تشهد على النبى صلى الله عليه وسلم ولهذا كان

اور بیشک گواہوں کو سچا قرار دینا گواہی کا بڑا بھاری اصول ہے۔ اور یہ بھی ضروری ہے کہ تزکیہ کرنے والا اس سے افضل اور زیادہ عدل والا ہو جس کا تزکیہ کیا جائے۔ اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ تزکیہ کرنے والا اپنے تزکیے کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور بے شک امت نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر گواہی نہیں دے گی (کیونکہ آپ تزکیہ

يقول فى حجة الوداع الا هل بلغت فيقولون نعم فيقول اللهم اشهد فجعل الله هو الشاهد على تبليغه وهذا من ادق النكت (البقرة - ١٤٣)

کرنے والے ہیں) اور اسی لئے آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کیا میں نے تمہیں دین پہنچا دیا؟ تو سب نے کہا جی ہاں۔ اس پر آپ نے فرمایا اے اللہ تو گواہ رہ۔ پس آپ نے اپنی تبلیغ پر اللہ کو گواہ بنایا (امت کو نہیں) اور یہ بات باریک نکات میں سے ہے

بشیر ونذیر

شروع میں تمام لوگ ایک ہی دین سے وابستہ تھے۔ یہ دین حق تھا۔ رفتہ رفتہ اختلاف شروع ہوا۔ لوگ راہ ھدایت سے ہٹنا شروع ہو گئے تب سے اللہ نے یکے بعد دیگرے رسول بھیجنے کا سلسلہ جاری فرمایا۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ ـ لوگ ایک ہی امت تھے۔ جب اختلاف کیا تو اللہ
اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ـ نے بشارت سنانے اور ڈرانے کو نبی بھیجے۔ (بقرہ۔۲۱۳)

نبی صرف اس لیے آتے تھے کہ لوگوں کو بشارتیں سنائیں اور انہیں اللہ کے عذاب سے ڈرائیں۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا ـ اور ہم رسول نہیں بھیجتے مگر خوشی اور
مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ـ ڈر سنانے کو۔ (الانعام۔۴۸)

تبشیر وانذار (خوش خبری سنانا اور ڈرانا) ہی رسول بھیجنے کی غرض وغایت تھی۔ تفسیر ابوالسعود میں ہے

ففيهما معنى العلة الغائية قطعا۔ رسول بھیجنے کی غرض قطعی طور پر تبشیر وانذار ہی ہے (انعام۔۴۸)

اسی مقصد کے لئے رسول مسلسل آتے رہے اور اللہ کا پیغام، اس کی بشارتیں اور اس کے ڈراوے لوگوں کو سناتے رہے۔ روح المعانی میں اسی جگہ ہے

وصيغة المضارع للايذان بان ذلك ـ اور مضارع کا صیغہ واضح کرتا ہے کہ ایک
امر مستمر جرت عليه العادة الالهية ـ تسلسل کے ساتھ اللہ کی یہ عادت جاری رہی

انبیاء کو مبشر اور منذر کیوں بنا کر بھیجا؟ قرآن اسکی یہ وجہ بتاتا ہے۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ ـ بھیجے پیغمبر خوشی خبری اور ڈر سنانے والے تا کہ رسولوں
عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ (النساء۔۱۶۵) ـ کے بعد لوگوں کو اللہ پر الزام کا موقع باقی نہ رہے۔

لوگوں کی اللہ پر حجت یا الزام کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے

وَلَوْ اَنَّاۤ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ ـ اور اگر ہم ہلاک کر دیتے ان کو کسی آفت میں اس سے
قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَاۤ اَرْسَلْتَ ـ پہلے تو کہتے اے رب کیوں نہ بھیجا ہم تک کسی کو کتاب
اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ ـ دیکر کہ ہم چلتے تیری کتاب پر ذلیل اور رسوا ہونے
قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ـ سے پہلے (طہ۔۱۳۴)

اس لئے اللہ نے یہ ضابطہ بنا دیا کہ حجت پوری ہونے سے پہلے سزا نہ ہو

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ـ اور ہم سزا نہیں دیتے جب تک کسی رسول کو نہیں
(بنی اسرائیل۔۱۵) ـ بھیج لیتے

تا کہ لوگ اللہ کو الزام نہ دے سکیں کہ جب ہمیں کچھ بتایا نہیں گیا تو اب دنیا آخرت میں ہماری پکڑ کیوں ہے۔ حجت کے بارے میں ابن عاشور کہتے ہیں

مايدل على صدق المدعى وحقية ـ مدعی کی سچائی اور معذرت خواہ کی حقانیت پر جو چیز
المتعلر فهو لقتضى عدم المواخذة ـ دلالت کرتی ہے اسے حجت کہتے ہیں۔ اسکا تقاضا
بالذنب والتقصير والمراد هنا العلر ـ یہ ہے کے گناہ اور غلطی کی وجہ سے پکڑ نہ ہو۔ اس
البين الذى يوجب التنصل من الغضب ـ آیت میں حجت سے مراد ایسا کھلا عذر ہے جو اللہ
والعقاب (مائدہ۔۱۶۵) ـ کے غصے اور اسکی پکڑ سے بری ہونے کو لازم کر دے

یہ اللہ کی مہربانی ہے جو بندوں کی طرف سے معذرت کا نام اللہ نے حجت رکھا۔ حالانکہ اللہ کو الزام دینا کسی کیلئے ممکن نہیں۔ وہ اپنے کاموں میں مختار ہے جو چاہے کرے۔ بہر حال رسول مبشر اور منذر بن کر آئے۔ مقصد انجام سے خبردار کرنا تھا۔ ابن عاشور کے الفاظ میں

جعل قطع الحجة علة غائية ـ بشارت وانذار کا مقصد اس حجت کو ختم کرنا تھا۔
للتبشير والانذار انما يبينان ـ یہ دونوں دراصل اعمال کے انجام اور نتیجے سے
عواقب الاعمال ولذالك لم يعلل ـ آگاہ کرتی ہیں۔ اسی لئے رسول بھیجنے کی یہ علت
بعثة الرسل بالتنبيه الى مايرضى ـ بیان نہیں کی کہ جن کاموں سے اللہ راضی یا
الله ويسخط الله (النساء۔۱۶۵) ـ ناراض ہوتا ہے ان سے خبردار کریں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے شریعت اور رسولوں کا بھیجنا ضروری تھا۔ عقل ان دونوں سے بے پروا نہیں ہو سکتی۔

انه لابد من الشرع وارسال الرسل وان العقل لا يغني عن ذالك (روح المعانی۔ النساء۔ ۱۶۵)

پہلے رسولوں کے ساتھ ساتھ آپکو بھی مبشر اور منذر کہا لیکن دو وجہ سے تبشیر و انداز میں آپکی شان انبیاء سے زائد ہوگی۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ آپکو مبشر اور منذر کے ساتھ بشیر اور نذیر بھی کہا۔ باقی نبیوں کو یہ نام نہیں دیئے گئے۔ عرفاً یہ الفاظ ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہو جاتے ہیں لیکن لغوی لحاظ سے ان میں کچھ فرق ہے۔ قرآن میں اور پھر مقام نعت میں انکا یہ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ حضور ﷺ کو اللہ نے ہر کمال آخری حد تک عطا فرمایا۔ جب آپ وصف نبوت میں انبیاء کے لئے واسطہ ہیں تو ان اوصاف میں بدرجہ اولی واسطہ ہوں گے جو انبیاء کو نبوت کی وجہ سے حاصل ہوئے۔ آپ ﷺ باقی انبیاء سے جس طرح نبوت میں ممتاز ہیں ویسے ہی ان اوصاف میں بھی ممتاز ہوں گے۔ آپ کا منصب اور وظائف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا

يا أيها النبي إنا أرسلناك شاهدا — اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا اور خوش خبری

ومبشرا ونذيرا — سنانے والا اور ڈرانے والا (الاحزاب۔ ۴۵)

سورہ بقرہ میں ارشاد فرمایا

إنا أرسلناك بالحق بشيرا — بیشک ہم نے تجھے بھیجا ہے سچا دین دے کر خوشخبری

ونذيرا — دینے والا اور ڈرانے والا

ایک اور جگہ ارشاد ہوا۔ إنما أنت منذر۔ تیرا کام تو ڈر سنا دینا ہے (الرعد)

آپ ﷺ کے یہ اوصاف کئی آیتوں میں بیان ہوئے۔ کچھ آیتوں میں آپ کے صرف نذیر ہونے کا ذکر ہے۔ ان اوصاف کے معانی، مراد اور جس سیاق میں انہیں لایا گیا انہیں سامنے رکھا جائے تو آپ ﷺ کی مندرجہ ذیل شانیں ظاہر ہوتی ہیں۔

(۱) آپ ﷺ خدائی صفات کے مالک نہیں

آپ ﷺ کا کام انذار و تبشیر ہے۔ فرمایا

إن أنت إلا نذير — تو تو بس ڈر کی خبر پہنچانے والا ہے (فاطر)

لہذا آپ ﷺ میں خدائی صفات نہیں۔ الوہیت اور خدائی علیحدہ چیز ہے اور نبوت علیحدہ چیز ہے۔ دونوں کا مقام جدا جدا ہے۔ قرآن مجید کی بیسیوں آیات میں آپ ﷺ سے خدائی صفات اور اختیارات کی نفی کی گئی۔ مثلاً فرمایا

قل لا أملك لنفسي نفعا ولا ضرا إلا ما شاء الله۔

تو کہہ دے کہ میں مالک نہیں اپنی جان کے بھلے کا اور نہ برے کا مگر جو اللہ چاہے (الاعراف)

سورہ آل عمران میں ارشاد ہوا

ليس لك من الأمر شيء أو يتوب عليهم أو يعذبهم

آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدا تعالیٰ ان پر یا تو متوجہ ہو جائیں اور یا ان کو کوئی سزا دے دیں سورۃ فاطر کی آیت جو اوپر درج کی گئی ہے اس سے پہلے ہی فرمایا۔

إن الله يسمع من يشاء وما أنت بمسمع من في القبور

اللہ سناتا ہے جسے چاہے اور تو نہیں سنانے والا قبر میں پڑے ہوؤں کو۔

مفسر اسماعیل حقی اس کی حکمت بیان کرتے ہیں۔ اللہ نے آپ کے وصف نذیر کا ذکر یہاں اسلئے کیا۔

لتمييز مقام الالوهية عن مقام	کہ الوہیت کا مقام نبوت سے جدا ہو جائے
النبوة كيلا يشتبها على الامة	اور امت پر اس طرح مشتبہ ہو کہ وہ گمراہ
فيضلوا عن سبيل الله كما ضل	ہوئی کچھ امتوں کی مانند اللہ کے راستے سے
بعض الامم السالفة فقال بعضهم	گمراہ ہو جائے۔ ان میں سے کچھ نے عزیر کو
عزير ابن الله وقال بعضهم المسيح	اور کچھ نے عیسیٰ کو اللہ کا بیٹا قرار دیا اور یہ تمیز
ابن الله وذالك من كمال رحمته	رکھنا اس امت پر اللہ کی رحمت کا کمال اور اس
لهذه الامة وحسن توفيقه	کی توفیق کی خوبی ہے۔

(۲) آپ کو معجزات پر بھی قدرت نہیں

یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ معجزے ایجاد کرنے پر قدرت نہیں رکھتے۔ نہ آپ ﷺ کو یہ طاقت ہے کہ جب چاہیں معجزہ دکھا دیں۔ اور یہ آپ ﷺ کی ذمہ داری بھی نہیں ہے۔ کئی آیتوں میں اللہ نے آپ ﷺ سے ان باتوں کی نفی بھی فرمائی اور محبت آمیز عتاب بھی فرمایا۔ ارشاد ہوا

اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ	اور اگر تجھ پر گراں ہے ان کا منہ پھیرنا تو اگر تجھ سے
فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي	ہو سکے کہ ڈھونڈ نکالے کوئی سرنگ زمین میں یا کوئی
الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ	سیڑھی آسمان میں (تو ایسا کر کے) پھر لائیں ان
فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ	کے پاس ایک معجزہ۔ (الانعام)

مزید فرمایا۔

مَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (الرعد)

اور نہیں ہوا کسی رسول سے کہ وہ لے آئے کوئی نشانی مگر اللہ کے حکم سے۔

تفسیر البحر المحیط میں ابو حیان نے اللہ کی مراد بیان کی گویا اللہ یوں فرما رہے ہیں۔

ارسلناھم للتبشیر والانذار لا لأن	ہم نے انہیں تبشیر وانذار کیلئے بھیجا اس لئے نہیں کہ جو حق
تقترح علیھم الایات بعد وضوح	والے اس کے واضح ہوتے اور اس کی صحت ثابت کرنے
ماجاء وا بہ و تبین صحتہ	کے باوجود نئی نشانیاں پیش کریں (الانعام ۴۸)

گذشتہ انبیاء کی طرح آپ ﷺ کی ذمہ داری بھی یہی تھی کہ لوگوں کو ان کے برے اعمال پر برے انجام سے آگاہ کر دیں۔ یہی آپ ﷺ کا کام ہے۔ تفسیر التحریر والتنویر میں ہے

انت منذر لا موجد خوارق عاد	آپ ڈرانے والے ہیں۔ معجزے ایجاد کرنے والے نہیں (الرعد ۷)

اللہ نے کافروں کا اعتراض نقل فرمایا

وَقَالُوْا لَوْلَا اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ	اور کہتے ہیں کیوں نہ اتریں اس پر کچھ نشانیاں

پھر آپ کو کہا کہ آپ ﷺ یوں جواب ارشاد فرمائیں

قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاِنَّمَا اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ

تو کہہ نشانیاں تو ہیں اللہ کے اختیار میں اور میں تو بس سنا دینے والا ہوں کھول کر

(۳) ہدایت دینا آپ کا کام نہیں

آپ ﷺ کا کام بشارت دینا اور ڈرانا ہے۔ دلوں میں ایمان کا بیج بونا اور ہدایت پر لانا آپ ﷺ کے ذمہ نہیں۔ آپ تو بس تبشیر و انذار کی دستکوں سے ان کے دلوں کے دروازے ہی کھٹکھٹا سکتے ہیں۔

فلا علیك الا التبشیر والا نذار	تبشیر و انذار کے سوا آپ پر کوئی ذمہ داری نہیں۔
لاھدایة الکفرة المقترحین و	نشانیوں کے طلب گار کافروں کو ہدایت دینا اور
اکراھھم علی الدین (روح المعانی)	دین پر انہیں مجبور کرنا آپ کے ذمہ نہیں۔

لہٰذا کوئی آپ ﷺ کی بات نہیں مانتا تو آپ ﷺ پر کوئی الزام نہیں۔ ابراہیم بن عمر البقاعی فرماتے ہیں

فان قبلوا فھو حظھم وان لم یقبلوا	آپ ان پر وکیل نہیں ہیں۔ اگر وہ مان لیں تو ان کا
کان علیھم وزرھم ولم یکن علیك	نصیب ہے۔ نہ مانیں تو اس کا بوجھ بھی انہیں ہی
لوما فاتا ما ارسلناك علیھم وکیلا	اٹھانا پڑے گا آپ پر کوئی ملامت نہیں (الاسراء ۱۰۵)

اور دوسری جگہ فرمایا

فلیس علیك الا ذالك فبشرو	پس آپ پر بشارت دینے اور ڈرانے کے سوا اور
انذر فانما علیك البلاغ ولیس	کوئی ذمہ داری نہیں آپ کے ذمہ تو بس پہنچا دینا
علیك خلق الھدایة فی قلوب	ہے آسودہ حال لوگوں کے دلوں میں ہدایت پیدا
اھل النعیم	کرنا آپ کا کام نہیں (البقرۃ ۱۱۹)
واصل الانذار الاعلام بموضع	اور انذار کی اصل ڈر کی جگہ کی اطلاع کرنا ہے تاکہ
المخافة لیتقی لا الك مثبت	اس سے بچا جائے ان کے دلوں میں ایمان جمانا
للایمان فی صدورھم	آپ کا کام نہیں (الرعد ۷)

(۴) باکمال تبلیغ

ان اوصاف سے آپ ﷺ کی تبلیغ کا کمال بھی معلوم ہوتا ہے۔ تبشیر و انذار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان کا تعلق اعمال کے نتائج کے ساتھ ہے۔ ان کے ذیل میں دو باتیں شامل ہیں۔ ایک اعمال کی تفصیل اچھے برے تمام اعمال سے آگاہ کرنا دوسری ہر عمل کا حکم بتانا کہ یہاں تعمیل حکم بصورت امتثال اور یہاں بصورت اجتناب ہے۔ یہ عمل کرنا ہے اور یہ عمل چھوڑنا ہے۔ دین انہی دو صورتوں پر مشتمل ہے۔ اور انھیں دوسروں تک پہنچانا تبلیغ ہے۔ آپ ﷺ نے نہ صرف نیک و بد اچھے اور برے عمل علیحدہ کر کے بتائے بلکہ ان پر مرتب ہونے والے نتائج سے بھی آگاہ فرمایا۔ یہی صراط مستقیم کی طرف راہ نمائی ہے۔ تبشیر و انذار تبلیغ بھی ہے راہ حق کی دعوت بھی اور ہدایت بھی۔ انذار و ہدایت میں تلازم ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

فان الانذار والهدی متلازمان	ڈرانا اور راہ نمائی کرنا لازم ملزوم ہیں۔ ہر
فما من انذار الا وهو هداية وما	انذار ہدایت ہے۔ اور کوئی ہدایت ایسی نہیں
من هداية الا فيها انذار والهداية	جس میں انذار نہ ہو۔ اور ہدایت انذار سے
اعم من الانذار۔	عام ہے (الرعد۔ ۷)

یہی حال بشارت کا ہے۔ پھر تبلیغ کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک ترغیب اور دوسرا ترہیب۔ ترغیب کا مطلب ہے کسی کے دل میں کسی چیز کی خواہش، امید اور شوق پیدا کرنا۔ ترہیب کا مطلب ہے کسی کو خوف زدہ اور دہشت زدہ کرنا۔ ترغیب اور ترہیب کا محل صحیح اور غلط دونوں کام ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس تبشیر کا مطلب ہے اچھے کام کی ترغیب دے کر اس پر ملنے والے فائدے کی خبر سنانا یا کوئی اچھی چیز ملنے کی خبر دینا۔ اور انذار کا مطلب ہے برے عمل کے برے نتیجے سے آگاہ کر کے خوف دلانا۔ شاید اسی لئے انبیاء کو مرغب اور مرہب نہیں کہا۔ کیونکہ منذر اور مبشر مبلغ بھی ہوتا ہے اور ترغیب و ترہیب کرنے والا بھی۔ انذار و تبشیر میں ان کا معنی موجود ہے لیکن ترغیب و ترہیب دینے والا ضروری نہیں کہ بشیر و نذیر بھی ہو۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

وکنی بالتبشیر والانذار عن التبلیغ	تبشیر اور انذار تبلیغ سے کنایہ ہے۔ کیونکہ تبلیغ
لان التبلیغ یستلزم الامرین وهما	کیلئے ترغیب اور ترہیب دو باتیں لازم ہیں۔
الترغیب والترهیب	(الانعام۔ ۴۸)

(۵) رؤف اور رحیم

یہ اوصاف آپ ﷺ کی رافت اور رحمت کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ ان سے مخلوق پر آپ ﷺ کی شفقت اور مہربانی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ آپ کے وعدے بشارت اور وعیدیں انذار ہیں۔ بشارت آپ کی رحمت اور انذار آپ کی شفقت ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

والبشارة الاعلام بخبر حصل او	بشارت تو اس خبر کی اطلاع ہے جو حاصل ہو چکی
سیحصل والنذارة بکسر النون الاعلام	ہے یا حاصل ہو گی اور ڈرانا اس شر اور نقصان
بشر وضر حصل او سیحصل وذلك	کا اعلان ہے جو مل چکا ہے یا ملے گا۔ اور یہی وہ
هو الوعد والوعید الذی تشتمل	وعدہ اور وعید ہے جن پر شریعتیں مشتمل ہوتی
علیه الشرائع	ہیں (البقرۃ۔ ۲۱۳)

اچھا عمل بتانا پھر اس پر اچھے نتیجے کا وعدہ کرنا بشارت ہے۔ اسمیں لوگوں کا نفع ہے جو رحمت ہے۔ برے عمل کی خبر دینا پھر اس کے برے انجام سے خبردار کرنا انذار ہے۔ یہ لوگوں کو ضرر اور نقصان سے بچانا ہے جو کہ رافت اور شفقت ہے۔ اس لئے آپ رؤف بھی ہیں اور رحیم بھی۔ حضور ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ اور شفقت رحمت کی شدت کا نام ہے اس لئے تبشیر کے بجائے انذار کا اہتمام زیادہ ہے۔ آپ کی بشارت تو رحمت ہے ہی انذار بھی رحمت ہے۔ ابراہیم بن عمر کہتے ہیں

ولما کان صلی الله علیه وسلم	آپ صلی اللہ علیہ وسلم نبی الرحمۃ ہیں اور اسی وصف
نبی الرحمة وکان الاقتصار علی	(رحمت) پر انحصار کرنا بھی دوسری چیز کا وہم پیدا کرتا
هذا الوصف ربما اوهم غیر ذالك	ہے۔ لہذا اظہر عظمت کی طرف التفات کرتے ہوئے

انبعه قوله بها نا لعظمة صلى الله رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بیان کرنے کیلئے اس
عليه وسلم بالا لتفات الى مظهر کے بعد اللہ نے یہ ارشاد فرمایا کیونکہ رسول کی عظمت
العظمة لان عظمة الرسول من بھیجنے والے کی عظمت کی وجہ سے ہے پس آپ کا
عظمة المرسل فنذارته رحمة انذار بھی رحمت ہے۔ (فاطر۔۲۴)

(۶) ناصح اور محسن

انذار کے زیادہ اہتمام سے آپ کی ایک اور شان بھی نمایاں ہوتی ہے۔ وہ نصح و خیر خواہی کی شان ہے۔ مخلوق خدا کا آپ ﷺ سے زیادہ خیر خواہ اور کوئی نہیں۔ کسی کو ابدی نقصان سے بچایا جائے اس سے بڑی خیر خواہی اور کیا ہو سکتی ہے۔ آپ ﷺ تو دائمی عذاب سے بچانا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ آپ سب سے بڑھ کر خیر خواہ اور انتہا درجے کے محسن ہیں۔ آپ ﷺ اتنے ہمدرد ہیں کہ اس حقیقی خیر خواہی اور بھلائی پر کسی اجر اور معاوضے کے طلب گار بھی نہیں۔

کلام عرب میں نذیر اس خبر دینے والے کا نام ہے۔ جو دیار قوم پر دشمن اتر جانے کی خبر دیتا ہے۔ اس کی مثال ہے۔

انا النذير العريان میں برہنہ ڈرانے والا ہوں۔

اور عریان سے وہ شخص مراد ہے جو خیر خواہی، بصورت حال کی سنگینی اور اطلاع کی غرض سے اپنی قمیض اتار دیتا ہے تاکہ بلند مقام پر کھڑے ہو کر اس کے ساتھ اشارہ کرے اور جس تک اس کی آواز نہیں پہنچ سکتی وہ اس کو دیکھ کر سمجھ جائے۔ وصف نذیر کے ساتھ آپ کی مثال بیان کرنا نذیر القوم (قوم کو خطرے سے ڈرانیوالے) کے حال کے مناسب ہے۔ فرمایا

إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ لَّكُم بَيْنَ يَدَيْ عَذَابٍ شَدِيدٍ (سبا)

یہ تو ایک ڈرانے والا ہے تم کو ایک بڑی آفت کے آنے سے

(۷) کامل صفات، زائد اجر و ثواب کا باعث

بشیر و نذیر فعیل کے وزن پر ہیں۔ جس میں دوام اور مبالغہ پایا جاتا ہے۔ ابو حیان فرماتے ہیں۔

وعدل الى فعيل للمبالغة لان اور فعیل کی طرف مبالغہ کیلئے پھیرا گیا۔ کیونکہ فعیل ان صفات

فعيلا من صفات السجايا و میں سے ہے جو ایک حالت پر برقرار رہتی ہیں۔ اور بشیر میں
العدل فى بشير للمبالغة عدول مبالغہ کیلئے ہے۔ (البحر المحیط۔ البقرۃ۔۱۱۹)

اور تفسیر البقاعی میں ہے

وكانت المبالغة فى النذارة ازيد۔ اور نذیر میں مبالغہ زیادہ ہے۔ (الاحزاب۔۴۵)

آپ ﷺ کی بشارت اور انذار دونوں میں پہلے نبیوں کی بشارت اور ڈراوے سے زیادہ مبالغہ ہے۔ یعنی حضور ﷺ کی بشارتیں اور نذارتیں ہی دائمی اور اکمل ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کے بعد کسی بشیر و منذر کا آنا محال ہے۔ اور جس نے آپ ﷺ کی بات مانی اس نے زیادہ ثواب کمایا۔ کامل بشارت وہ ہے جس میں کسی ضرر اور نقصان کا امکان نہ ہو۔ کامل انذار وہ ہے جس میں کسی فائدے اور مسرت کا گزر نہ ہو۔ آپ ﷺ کی بشارات دائمی فائدوں کی موجب اور انذار ہمیشہ کے ضرر کا باعث ہے۔

(۸) مبشرین اور منذرین

یہاں ان لوگوں کا ذکر بھی لازمی ہے جن کو بشارتیں دی گئیں یا انہیں ڈرایا گیا۔ بشارت کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ اول ترغیب یعنی فلاں کام کرنے پر یا اس کے ترک پر یہ فائدہ ہوگا۔ ثانی استحقاق جس نے وہ کام کر لیا وہ فی الواقع اس کا مستحق ہو گیا۔ ایسے ہی انذار کے دو پہلو ہیں۔ ترہیب یعنی فلاں کام چھوڑنے یا کرنے پر یہ نقصان ہوگا۔ دوسرا پہلو استحقاق ہے جس نے اس کا ارتکاب کیا وہ عذاب کا مستحق ہو گیا۔ ترغیب و ترہیب تو مومن اور کافر دونوں کے لئے ہے۔ البتہ بشارت کے اصل مستحق کامل مومن اور انذار کے مستحق کافر و مشرک ہیں۔ (دیکھیے الاحقاف۔۱۲) گناہگار مومنوں کے حق میں آپ کا انذار وعدہ نہیں وعید ہے۔ کیونکہ ایمان کی وجہ سے وہ ایک درجے میں بشارت کے مستحق ہو چکے ہیں۔

والنبى صلى الله عليه وسلم مبشر لاهل الايمان نبی ﷺ اہل ایمان اور اطاعت گذاروں کے
والمطيعين بمراتب فوزهم والنبى عليه الصلاة لئے ان کی کامیابی کے مرتبوں کے لحاظ سے
والسلام منذر للذين يخالفون عن دينه من مبشر ہیں اور کافر جو آپ کے دین کے مخالف

کافرین به ومن اهل العصیان بمتفاوت مواخذتهم علی عملهم (ابن عاشور، الاحزاب ۔۴۵)
ہیں اور اہل عصیان کے لئے ان کے اعمال پر مواخذے کے فرق کے لحاظ سے منذر ہیں۔

(۹) بشارتیں اور انذار

جن اعمال پر قرآن صلاح، فلاح، خیر، جنت کی نعمتوں اور رضائے الٰہی کا وعدہ کرتا ہے وہ آپ ﷺ کی بشارتیں ہیں۔ اور جن اعمال پر مواخذہ، تہمت اور عذاب کی دھمکی دیتا ہے وہ آپ ﷺ کا ڈراوا ہے۔ لیکن انذار و تبشیر اسی میں منحصر نہیں۔ یہ آپ ﷺ کی بشارات و انذار کی اساس ہے۔
جنہوں نے آپ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا آپ ﷺ نے انہیں ثمرات طاعت کی بشارت دی مثلاً رزق میں اضافہ، بدن میں قوت، دل میں طاقت، پاکیزہ زندگی، کامیابی، جنت اور رضائے الٰہی۔ جنہوں نے منہ پھیرا اور اعراض کیا انہیں نتائج معصیت کی دھمکی دی مثلاً رزق سے محرومی، کمزوری، ذلت، زندگی کی تنگی، جہنم اور اللہ کی ناراضگی۔

قال الحسن مبشر ان هم امنوا بالنعمة فی الدنیا والجنة فی الاخرة وان لم یومنوا هلکهم الله بالعذاب فی الدنیا واد خلهم النار فی الاخرة (البغوی، الاحزاب ۔۴۵)
حسن نے فرمایا اگر وہ ایمان لائیں تو انبیاء نے بشارت دی دنیا میں نعمتوں کی اور آخرت میں جنت کی۔ اگر ایمان نہ لائیں تو ڈرایا کہ اللہ دنیا میں مبتلائے عذاب کر کے ہلاک کرے گا اور آخرت میں جہنم میں داخل کرے گا۔

آپ ﷺ کے یہ اوصاف تقویٰ کو بھی متضمن ہیں۔ تقویٰ کے دو رخ ہیں۔ امتثال امر (حکم کی تعمیل کرنا) اور اجتناب منہیات (جن سے روکا گیا ان سے رک جانا) جن کاموں کے کرنے کا حکم دیا گیا ان میں کئی مصلحتیں ہیں لہٰذا ان کی بجا آوری کرنے والا دنیا آخرت میں بشارت کا مستحق ہے۔ اسم نذیر نواہی اور عقوبات (سزاؤں) کا جامع ہے۔ جن کاموں سے روکا گیا ان میں کئی مفاسد ہیں لہٰذا ان پر اقدام کرنے والا دنیا آخرت میں انذار کا مستحق ہے۔

(۱۱) موضح اور فرقان

ان اوصاف سے نبی ﷺ کا موضح اور فرقان ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ موضح اور فرقان کا مطلب

ہے جو حق اور باطل کو جدا اور واضح کر دے۔ کیونکہ بشارت اچھے عمل پر ہے مگر اس سے آگاہ کرنے کے بعد اور انذار برے عمل پر ہے مگر اس سے خبردار کرنے کے بعد۔ گویا یہ وضوح حق اور ابلاغ کامل کے بعد ہیں۔ اچھے اعمال حق اور نور ہیں۔ برے اعمال باطل اور تاریکی ہیں۔ آپ ﷺ نے حق و باطل اور نور و ظلمت کو جدا جدا کر دیا۔ حلال و حرام کو علیحدہ کر دیا اور اس حد تک تمیز کر دی کہ ان کا انجام بھی بتلا دیا۔ ان کے تعین میں کوئی ابہام نہ رہا۔ ان کی شناخت میں کوئی رکاوٹ نہ رہی۔ حق دوپہر کے سورج سے زیادہ روشن اور باطل اماوس کی رات سے زیادہ تاریک ہو گیا۔ مشکوٰۃ شریف کی حدیث الحلال بیّن والحرام بیّن الخ میں یہی بات ارشاد فرمائی۔

(۱۲) حجیت حدیث

انذار و تبشیر سے حجیت حدیث کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ نبوت اور رسالت تو آپ کا منصب ہے جبکہ دعوت، تبلیغ، جہاد، شہادت اور انذار و تبشیر اس کے تقاضے اور وظائف ہیں۔
مفسر ابو السعود آیت وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

کلام مستانف مسوق لبیان وظائف منصب الرسالة علی الاطلاق

یہ جدا کلام ہے جو مطلقاً منصب رسالت کے وظائف بیان کرنے کے لئے چلایا گیا ہے (الانعام ۔۴۸)
اللہ نے آپ کو انذار و تبشیر کا فاعل قرار دیا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بالفعل بشیر اور نذیر ہیں۔ تو کیا اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے قرآن امت تک پہنچایا اس کا جو حصہ بشارت پر مشتمل ہے اس کے لحاظ سے آپ ﷺ بشیر ہیں اور جو حصہ انذار پر مشتمل ہے اسے پہنچانے کے لحاظ سے نذیر ہیں اور بس؟
نہیں ہرگز نہیں۔ بلکہ اس سے ہٹ کر قرآن کی اساس پر ہی آپ ﷺ کو ایک اور مقام دیا گیا۔ وہ اختیار ہے اس بات کا کہ آپ ﷺ قرآن کے علاوہ بھی اچھے برے اعمال کو متعین کر سکتے ہیں۔ ان پر جزا اور سزا بیان کرنے کے مجاز ہیں۔ بشیر و نذیر کا اگر یہ مفہوم نہ لیا جائے تو ان اسماء میں آپ ﷺ کا فاعل ہونا اعتباری اور مجازی قرار پاتا ہے۔ پھر مقام تعریف میں بطور وظیفہ رسالت مستقل طور پر ذکر کرنا کلام کی خوشنمائی تو ہو سکتی ہے آپ ﷺ کی مدح و ثنا نہیں۔ پھر یہ اختیار دینا ہی اس کے

حجت اور سند ہونے کا ثبوت ہے۔ ایسا نہ ہو تو اختیار دینا ہی بے فائدہ ہے۔ اسی اختیار کا دوسرا نام قرآن کا بیان اور تبیین ہے۔ اسی کو حدیث کہتے ہیں۔

رسالت کا مطلب صرف قرآن پہنچانا ہی ہو۔ اور آپ ﷺ اسی اعتبار سے بشیر و نذیر ہوں تو مطلب ہوگا یہ رسالت کے دو پہلو اور حیثیتیں ہیں۔ حالانکہ یہ حیثیات نہیں اس کے لوازم اور تقاضے ہیں۔ کیونکہ جہاں کسی فعل کی مختلف حیثیات کا لحاظ کیا جائے وہاں حقیقی فعل ایک ہوتا ہے۔ باقی اس کے ضمن میں اعتبار کر لئے جاتے ہیں۔ ان کی الگ اور مستقل حیثیت نہیں ہوتی۔ ورنہ ایک آن میں ایک سے زائد افعال ادا نہیں ہو سکتے۔ حالانکہ اعتباری افعال جتنے بھی ہوں ایک آن میں ادا ہو جاتے ہیں۔ جیسے شاھد کی بحث میں اس کی مختلف حیثیات اور اعتبارات گزر چکے ہیں۔ وہاں حقیقی فعل ایک ہے گواہی دینا۔ تو حقیقی فاعل اسی کا ہوگا۔ باقی افعال اعتبارات ہیں مثلاً مصدق بحق، مبین وغیرہ۔ یہ الگ اور مستقل نہیں۔ گواہی دیتے وقت یہ تمام بھی ایک ہی وقت میں ادا ہو جاتے ہیں۔ ایسے نہیں ہوتا کہ شاھد ایک وقت میں عالم ہے۔ دوسرے وقت میں خبر دے رہا ہے۔ تیسرے کسی وقت میں حق بتا رہا ہے۔ جب باقی افعال اعتباری ہیں تو لامحالہ ان کا فاعل بھی اعتباری ہوگا۔ بشیر و نذیر کی یہی حیثیت ہو تو

مَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا کہہ کر غایت قرار دینا کیسے درست ہے؟

آپ ﷺ کو یہ الگ نام دینا اور مقام تعریف میں بیان کرنا کیسے صحیح ہے جب کہ آپ ﷺ میں ان کی حقیقت نہ پائی جائے؟ نام نہ ہوئے کاغذ کے پھول ہو گئے۔ اگر کہا جائے آپ کا بشیر و نذیر ہونا قرآن پہنچانے کے ضمن میں ہے تو یہ کہنا بھی درست ہوگا کہ شاھد، رحیم اور رؤوف بھی رسالت کے حیثیتیں ہیں۔ آپ ﷺ نے قرآن پہنچا دیا اس لئے شاھد بھی ہیں۔ اس کا ایک حصہ رحمت و بشارت پر مشتمل ہے اس لئے رحیم بھی ہیں۔ ایک حصہ شفقت و انذار پر مشتمل ہے اس لئے رؤوف بھی ہوئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ رسالت اور چیز ہے شہادت اور چیز ہے۔ نبوت علیحدہ وصف ہے اور رحمت و شفقت جدا اوصاف ہیں۔ ایسے ہی رسالت، بشارت اور انذار میں بھی فرق ہے۔ ورنہ ما بہ الفرق کیا ہے؟

اگر یہ رسالت کی حیثیتیں ہوں تو آپ ﷺ کی اور جبرائیل علیہ السلام کی رسالت میں فرق کیا ہوا؟ جیسے جبرائیل علیہ السلام نے قرآن مجید پہنچایا ویسے ہی حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے بھی۔ پھر تو جیسے وہ رسول ہوئے ویسے حضور ﷺ بھی۔ سوال یہ ہے کہ محمد ﷺ بشیر و نذیر ہیں تو جبرائیل کیوں نہیں؟ جبرائیل بشیر و نذیر نہیں تو آپ کیوں ہیں؟

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام اور آپ ﷺ کی رسالت میں فرق ہے آپ ﷺ کی رسالت جبرائیل علیہ السلام کی طرح صرف سفارت نہیں۔ اس کے سوا بھی کچھ ہے اور انذار و تبشیر بھی رسالت کی حیثیتیں نہیں اس کے وظائف اور تقاضے ہیں۔

اللہ نے سورۃ البقرۃ میں فرمایا۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ	پھر بھیجے اللہ نے پیغمبر خوش خبری سنانے والے اور ڈرانے والے۔

اکثریت ایسے نبیوں کی تھی جن پر کتاب اتری نہ انہیں نئی شریعت دی گئی۔ وہ پہلے دین اور پہلی کتاب کی طرف ہی بلاتے رہے۔ اگر رسالت کا مطلب صرف نازل شدہ کتاب کی ترسیل تھا تو وہ کام انہوں نے نہیں کیا۔ اس کے باوجود انہیں مبشر و منذر کہا گیا۔ تو ان کا انذار و تبشیر کیا تھا؟ یقیناً وہ اختیاری صفت نہیں تھی۔ رسالت کا تقاضا اور کتاب پہنچانے سے جدا مستقل کام تھا۔ وہی اختیار جس کا ذکر ہو چکا ہے۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اختیار تبیین سے کام لیا۔ قرآن کے اجمال کی تفصیل کی۔ عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق ہر ایک کو واضح کیا۔ ان کے اصول بیان فرمائے۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی وضاحت کی۔ ان میں سے کرنے اور چھوڑنے کے کام اور ان پر ملنے والے ثواب و عذاب کا الگ سے ذکر فرمایا۔ ان تمام تفصیلات کا نام حدیث ہے۔ اگر حدیث حجت نہ ہو تو آپ کو بشیر اور نذیر کہنا کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

(۱۳) علم، معرفت، مشاهده

آپ ﷺ کی بشارتیں اور ڈراوے اللہ کی طرف سے دی گئی خبریں ہیں۔ چاہے وہ قرآن کی صورت

میں ہوں یا حدیث کی صورت میں لیکن محض خبریں نہیں مشاہدہ بھی ہے۔ اعمال کی جزا و سزا کا آپ نے بچشم خود مشاہدہ فرمایا۔ مشاہدہ سے وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ کے مصداق ان کی قوت بڑھ گئی۔ اس سے آپ ﷺ کے قلب مبارک پر وہ اثر ہوا جو انذار و تبشیر اور مشاہدہ کا لازمہ ہے۔

حضور ﷺ کو اللہ کی معرفت تامہ حاصل ہوئی۔ اللہ کے قہر و مہر اور جمال و جلال کا انتہائی گہرا نقش آپ کے مبارک دل پر ثبت ہوا۔ حضور ﷺ اللہ سے ڈرنے، اسی سے امید رکھنے، اسی کی طرف لپکنے، اسی پر توکل کرنے اور اس کی رضا پر بہر حال دل سے راضی رہنے میں سب سے بڑھ گئے۔ ان محمود صفات میں کمال کی ان بلندیوں تک پہنچے کہ کمال بھی گرد راہ بن گیا۔ بلندی پائے مبارک کی دھول ہو گئی۔ اس لئے فرمایا میں تم سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا اور سب سے زیادہ اس کی معرفت رکھنے والا ہوں۔ یہ وہ ناقابل تنسیخ نقش ہے جس کی وجہ سے اللہ کی جناب میں رائی برابر سوئے ادب بھی بار خاطر ہو جاتا اگرچہ اس کا صدور کسی دوسرے سے ہو۔

(۱۴) بشارت و انذار کی حکمتیں اور تقدیم و تاخیر کی وجوہ

بشارت و انذار میں کیا حکمت ہے؟ بشارت کیوں مقدم ہے؟ انذار کا اہتمام بشارت سے زیادہ کیوں ہے اس کی کئی وجوہات مفسرین نے بیان فرمائیں۔

(۱) بشارت مقصود بالذات اور انذار مقصود بالعرض ہے۔

(۲) بشارت حفظ صحت اور غذا کی طرح ہے انذار ازالہ مرض اور دوا کی طرح ہے۔

(۳) اطاعت اور اس پر بشارت دونوں اصل اور بنیاد ہیں۔ نافرمان اس اصل سے خارج اور بنیاد سے اکھڑا ہوا ہے۔

(۴) بشارت میں مومن اور متقی لوگوں کی تکریم، اعزاز اور شان ہے اور انذار میں کفار اور ظالم لوگوں کی اہانت و خذلان ہے۔

(۵) آپ علیہ الصلاۃ والسلام رحمت اللعالمین ہیں۔ آپ پر تبشیر کا غلبہ ہے اور یہ آپ کی رسالت کی اصل ہے۔ ان وجوہ سے بشارت کا مقدم کیا گیا۔

(۶) انذار چونکہ زیادہ اہم ہے لہذا اس کا اہتمام بھی زیادہ ہے۔ ابن عاشور نے فرمایا

لان الانذار یجمع معانی التحذیر من	کیونکہ انذار ایسے کام سے جو اس کے لائق نہیں
فعل شئی لا یلیق وعواقبه فالانذار	اور اس کے انجام سے خبرداری کے معانی کو جمع
حقیق بالتقدیم قبل الامر بمحامد	کرتا ہے۔ پس فاعل کی خوبیوں کے ساتھ انذار
الفعال لان التخلیة مقدمة علی التحلیة	امر پر تقدیم کا حق رکھتا ہے۔ کیونکہ تخلیہ تحلیہ پر
ودرء المفاسد مقدم علی جلب	اور مفاسد کو زائل کرنا مصلحتوں کے حصول پر
المصالح ولان غالب احوال الناس	مقدم ہے اور اسلئے بھی کہ لوگوں کے عام احوال
یومئذ محتاجة الی الانذار والتحذیر	اس وقت انذار و تحذیر کے محتاج تھے (المدثر۔۲)

اور یہی مفسر ایک اور مقام پر ارشاد فرماتے ہیں۔

والحکمة فی الانذار ان	اور ڈراوے میں حکمت یہ ہے کہ گمراہی کا رواج
لایبقی الضلال رائجا وان	ختم ہو جائے۔ اور اللہ اپنے بندوں کی حق کی
یتخول الله عباده بالدعوة	طرف بلانے کے ساتھ نگہداشت کرے چاہے
الی الحق سواء عملوا بها	وہ اس کے مطابق عمل کریں یا نہ کریں۔ سو بے
اولم یعملوا فانها لا تخلوا	شک یہ بلانا ان میں نیکی کے اثر سے
من اثر ۔۔۔ الخ فیهم	خالی نہیں۔ (فاطر۔۲۴)

داعی الی اللہ

اللہ نے حضور ﷺ کے کمالات قرآن مجید میں بیان کر کے ان کو دوام عطا فرما دیا۔ اس نے آپ ﷺ کی شان میں جو الفاظ ارشاد فرمائے ان میں سے ہر ایک اپنے اندر معانی کا سمندر رکھتا ہے۔ غور و فکر سے کام لیا جائے تو پرت در پرت آپ ﷺ کے کمالات کھلتے جاتے ہیں اور آپ کی شانیں مہ کامل کی مانند نمایاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ جیسے روشنی کا رنگ ایک ہی ہوتا ہے منشور سے گزرے تو ایک رنگ ست رنگے دھارے میں بدل جاتا ہے۔ داعی الی اللہ کہنے کو تین الفاظ پر مشتمل مرکب ہے لیکن اس میں جہانِ معنی پوشیدہ ہے۔ آپ ﷺ کی شان کے کتنے ہی رنگ اس میں پنہاں ہیں۔ یہ ایک شان کتنی شانوں سے بنی ہوئی ہے؟ اسے جاننے سے پہلے یہ سمجھئے کہ داعی کسے کہتے ہیں۔

داعی کا مفہوم:

دعا، دعوی اور دعوۃ کا مطلب ہوتا ہے۔ پکار، پکارنے کی حالت پکارنا، فریاد کرنا، بلانا، کھانے کیلئے بلانا وغیرہ

ودعا الرجل دعوا و دعاء ا ناداہ ۔ اور آدمی کو پکارا یعنی اس کو صدا دی۔

دعوت فلانا ای صحت بہ و استدعیتہ میں نے فلاں کو چیخ کر بلایا اور اسے طلب کیا (لسان العرب)

داعی بلانے والے کو کہتے ہیں۔ جب اس کا صلہ (prepostion) الیٰ ہو تو مطلب ہوتا ہے ایک کو دوسرے کی طرف بلانے والا۔ اس میں طلب اور تحریض کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ جیسے

دعا الی القتال لڑائی پر اکسانا۔

دعا الی الصلوۃ نماز کی ترغیب دینا (القاموس الوحید)

الدعاء الرغبۃ الی اللہ دعا کرنا یعنی اللہ کی طرف رغبت کرنا (لسان العرب)

پس داعی الی اللہ کا ترجمہ ہوا۔ اللہ کی طرف سے بلانے والا۔ لیکن اس ترجمے سے پورا مفہوم ظاہر نہیں ہوتا۔ داعی الی اللہ کا پورا مفہوم ہے۔ وہ ہستی جو لوگوں کو ترغیب دیکر ان میں طلب پیدا کرے اور اللہ کی طرف بلائے۔ جو اس پکار پر لبیک کہے اسے اللہ کے حضور پہنچائے۔ اس سے حضور ﷺ کی جو شانیں نمایاں ہوتی ہیں اب وہ سمجھیں

(۱) واسطہ

اس مفہوم سے واضح ہوتا ہے آپ ﷺ خدا اور بندے کے درمیان واسطہ اور وسیلہ ہیں۔ واسطہ درمیانی کڑی کو کہا جاتا ہے جس کے ذریعے مقصود تک پہنچا جا سکے۔ انسانوں کو پیدا کرنے کا مقصد ان سے اللہ کی معرفت کا حصول ہے۔ آپ ﷺ کو واسطہ بنائے بغیر کوئی شخص یہ مقصد حاصل نہیں کر سکتا۔ جو اللہ کی معرفت حاصل کرنا چاہتا ہے اس پر آپ ﷺ کو واسطہ بنانا لازم ہے۔ کیونکہ داعی اللہ کا دین مخلوق تک پہنچا کر مخلوق کو اللہ کی طرف بلاتا ہے۔ آپ ﷺ کو واسطہ بنانے کا مطلب ہے آپ کی بات ماننا اور آپ کی پیروی کرنا۔ اس کا تعلق علم و معرفت سے ہے ہر وہ فکر، عقیدہ اور عمل گمراہی ہے جس میں آپ کا واسطہ نہ ہو۔ جیسے آپ ﷺ کے بغیر حق پانا ممکن نہیں ویسے ہی حدیث کے بغیر قرآن کو سمجھنا ممکن نہیں۔ جیسے آپ ﷺ ذات حق تک پہنچانے والے ہیں ویسے ہی آپ ﷺ کی سنت راہ حق پر چلانے والی ہے۔ بدعت اسی لئے مردود ہے کہ بدعتی درمیان سے آپ ﷺ کا اور آپ کی سنت کا واسطہ نکال دیتا ہے۔ اور جو چیزیں دین نہیں ہوتیں اپنی رائے سے انہیں دین بنا دیتا ہے۔

(۲) موصل

داعی الی اللہ ہونے میں موصل کا مفہوم بھی پوشیدہ ہے۔ موصل اسے کہتے ہیں جو ایک چیز کو دوسری چیز سے ملا دے۔ موصل وہ واسطہ ہے جو صرف ذریعہ نہیں بنتا یقینی طور پر مقصود تک پہنچاتا ہے۔ کیونکہ داعی ہوتا ہی وہ ہے جو ایک کو دوسرے کی طرف بلا کر اسکے حضور پہنچائے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

واصل دعاه الی فلان انه اس کی اصل یہ ہے کہ اس نے اسے فلاں کی طرف بلایا یعنی دعاه الی الحضور عنده داعی نے اس کو بلانے والے کے حضور پہنچا دیا۔ کہا جاتا ہے یقال ادع فلانا الی فلاں کو میرے حضور پہنچا دو۔ (الاحزاب۔۴۶)

(۳) ھادی

داعی الی اللہ ہونا آپ کے ہادی ہونے کو بھی متضمن ہے۔ ہدایت کا معنی ہے۔

ارشاد الناس الی طریق الخیر۔ خیر کی طرف لوگوں کی راہ نمائی کرنا۔ (ابن عاشور، الشوریٰ۔۵۲)

داعی یہی کام کرتا ہے۔ جو لوگ راہِ حق سے بھٹک چکے ہیں اور اللہ سے ہٹ کر دنیا کی رنگینیوں میں گم ہو چکے ہیں انہیں صراطِ مستقیم کی طرف بلاتا ہے۔ آپ بھی لوگوں کی صراطِ مستقیم کی طرف راہ نمائی کرتے ہیں۔ اللہ فرماتا ہے

اِنَّكَ لَتَهْدِىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ۔ اور بے شک تو سجھاتا ہے سیدھی راہ (الشوریٰ۔۵۲)

اور آپ کا ہادی ہونا خود آپ کے صراطِ مستقیم پر ہونے کو مستلزم ہے لہذا فرمایا

عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (تو ہے) اوپر سیدھی راہ کے۔ (یٰس۔۴)

صراطِ مستقیم گویا آپ کی سواری ہے۔ سوار اپنی سواری سے جدا نہیں ہوتا۔ جس طرف سواری جاتی ہے وہ بھی اسی طرف جاتا ہے۔ آپ اس سواری سے اس طرح لپٹے ہوئے ہیں کہ اس سے ہٹنے کا تصور ہی ممکن نہیں۔

(۴) ھدایت دینا آپ کا کام نھیں

اس سے معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ کی ڈیوٹی اور ذمہ داری اللہ کی طرف بلانا ہے لانا نہیں۔ قرآن میں اس مفہوم کی حامل بیسیوں آیات ہیں۔ اسی لئے جا بجا آپ ﷺ کو تسلیاں دیتے ہوئے کفار کے اعراض پر پریشان ہونے سے روکا گیا۔ اور فرمایا گیا آپ ﷺ ان پر داروغہ اور حاکم ہیں نہ وکیل۔ اگر یہ منہ پھیرتے ہیں تو آپ پر کوئی الزام نہیں۔ راہِ حق پر لانا آپ کی ذمہ داری نہیں۔ ہاں جو آپ ﷺ کی پکار پر لبیک کہے اور خود آپ کی طرف آ جائے اسے منزل مراد کی طرف لے جانا آپ کا کام ہے۔ داعی کی ذمہ داری معلوم ہونے سے یہ بھی پتہ چل گیا آپ

راہِ حق دکھانے والے ہیں۔ آپ کے ھادی ہونے کا یہی مطلب ہے۔ قرآن میں اگر یہ ذکر ہے کہ آپ ﷺ راہِ حق کی ہدایت کرتے ہیں تو یہ بھی ارشاد ہے کہ

اِنَّكَ لَا تَهْدِىْ مَنْ اَحْبَبْتَ ۔ تو راہ پر نہیں لاتا جس کو چاہے۔

پہلی جگہ کا مطلب ہے آپ ﷺ راہِ حق دکھاتے ہیں۔ یہ آپ کے داعی ہونے کا تقاضا ہے۔ دوسری جگہ کی مراد ہے آپ ﷺ کسی کو راہِ ہدایت کی طرف لا نہیں سکتے اگرچہ وہ آپ ﷺ کا محبوب ہی ہو۔ کیونکہ لانا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں اور لانے پر آپ ﷺ کا اختیار بھی نہیں۔

(۵) مختصر راستے سے اللہ تک پھنچانے والے

جو حضور ﷺ کی دعوت قبول کرے گا آپ اسے مختصر ترین راستے سے خدا تک پہنچا دیں گے۔ دو انتہاؤں کے درمیان مختصر ترین راستہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اس میں کوئی موڑ اور ٹیڑھا پن نہیں ہوتا۔ بالکل سیدھا اور بھٹکنے سے پاک ہوتا ہے۔ بشرطیکہ راہی خود رائی نہ کرے۔ مختصر اور سیدھا ہونے کی وجہ سے آسانی اور جلدی سے طے ہو جاتا ہے۔ اسے طے کرنے میں کلفت، صعوبت اور تنگی نہیں ہوتی۔ فرمایا

قُلْ اِنَّنِىْ هَدٰىنِىْ رَبِّىْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا

تو کہہ مجھے میرے رب نے سیدھی راہ سجھائی۔ دین صحیح سیدھا (الانعام۔۱۶۱)

اور فرمایا۔

وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا قَيِّمًا اور نہیں رکھی اس میں کچھ کجی بالکل سیدھا ٹھیک (کہف۔۱)

تفسیر السعدی میں داعی الی اللہ کا تقاضا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔

والدعوة الی اللہ باقرب طریق موصل الیہ

اللہ کی طرف پہنچانے والے قریب ترین راستے کے ساتھ اس کی طرف بلانا۔ (الاحزاب۔۴۶)

(۶) استقامت اور تسلسل

اس سے آپ ﷺ کی شان استقامت بھی نمایاں ہوتی ہے۔ یہ ایک دفعہ کا کام نہیں۔ آپ ﷺ کو مداومت کے ساتھ مسلسل یہ کام کرنے کا حکم ہے۔ کسی ایک کو ایک دفعہ دعوت دے دینا یہ داعی کی

شان نہیں۔ اس کا کام تو ہر ایک کو بار بار بلاتا ہے۔ اس میں تحریض وترغیب کا معنی بھی تکرار کو چاہتا ہے۔

مفسر ناصر الدین تفسیر السعدی میں فرماتے ہیں

ای ارسله الله بد عو الخلق	اللہ نے انہیں بھیجا وہ مخلوق کو اس کے رب کی طرف
الی ربهم ویشوقهم لکرامته	بلاتے ہیں۔ انہیں اس کی عزت کا شوق دلاتے ہیں
ویامرهم بعبادته التی خلقوا	اور اس عبادت کا حکم دیتے ہیں جس کے لئے وہ پیدا
لها وذالك یستلزم استقامته	کئے گئے۔ اور جس بات کی طرف وہ بلاتے ہیں یہ
علی ماید عواليه (الاحزاب۔٤٦)	سب اس پر ان کی استقامت کا تقاضا کرتا ہے

ایک اور جگہ فرمایا۔

كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ۔

مشرکین پر وہ چیز بہت بھاری ہے جسکی طرف آپ انہیں بلاتے ہیں۔

یہاں تدعوھم میں فعل مضارع استعمال ہوا۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

للدلالة علی تجدد الدعوة	یہ آپکی دعوت کے نئے پن اور ہمیشگی پر
واستمرارها۔	دلالت کرتا ہے (شوری۔١٣)

اس سے اگلی آیت میں آپکو ارشاد ہوا۔

فَلِذَٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ۔ پس آپ اسی طرف بلائیں اور جیسے حکم دیا اس پر قائم رہیں۔

مفسر ابن عاشور نے اس کی تفسیر میں فرمایا

وانما امر بالاستقامة ای الدوام	بات یہی ہے کہ دعوت پر استقامت یعنی دوام کا حکم کیا
علیها للاشارة الی ان کمال	گیا اس بات کا اشارہ کرتے ہوئے کہ حق کی طرف بلانے
الدعوة الی الحق لا یحصل الا اذا	کا کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک داعی
کان الداعی مستقیما فی نفسه	اپنی ذات میں مضبوط اور ثابت قدم نہ ہو۔ (شوری۔١٥)

چنانچہ آپکی سیرت پاک اسپر شہادت دیتی ہے کہ اس راہ میں آپ ﷺ نے کس قدر ثابت قدمی

دکھائی۔ اپنی جان جوکھوں میں ڈالی۔ آپ ﷺ پر وہ مصائب آئے جو پہاڑوں پر پڑتے تو وہ ریت کے ذرے بن جاتے۔ لیکن آفرین ہے آپ ﷺ نے استقلال اور پامردی کیساتھ تمام حالات کا مقابلہ کیا۔ برس ہا برس شبانہ روز کوششیں کیں۔ دن رات ایک کیا۔ یہاں تک کہ تیئس سال گزر گئے۔ تب اللہ نے اکمال دین اور اتمام نعمت کا مژدہ سنایا۔ اتنا عرصہ پہلے جو شخص تنہا ایک مقصد لیکر چلا تھا آج اپنے لاکھ سے زائد جانثاروں سے سوال کرتا ہے۔ کیا میں نے دین پہنچا دیا؟ اور وہ بیک زبان یہ جواب دیتے ہیں۔ پہنچا دیا!!! اور آپ ﷺ اللہ کو مخاطب کر کے کہتے ہیں اے اللہ تو گواہ ہو جا جو ذمہ داری تو نے میرے سپرد کی تھی میں نے اسے پورا کر دیا۔

دعوت کا دوام یہی نہیں کہ آپ نے مسلسل یہ کام کیا بلکہ آپکے بعد آپکی امت کو بھی اسی مقام دعوت پر کھڑا کر کے تا قیام قیامت اس تسلسل کو جاری رکھا گیا۔ حق استقامت ادا کرنا اتنا مشکل تھا کہ فرمایا۔

شیبتنی هود واخواتها فقیل	مجھے ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا کر دیا پوچھا گیا
له لم ذالك یارسول الله فقال	کیوں یارسول اللہ؟ تو ارشاد ہوا کیوں کہ اس میں ارشاد
لان فیها فاستقم کما امرت۔	ہے جیسے تمہیں حکم دیا گیا اس پر ڈٹے رہو۔

علامہ حقی (شوری۔١٥) میں اس کے بعد فرماتے ہیں۔

فحقیقة الاستقامة لا یطیقها	پس انبیاء اور اکابر اولیاء کے علاوہ حقیقت
الا الانبیاء واکابر الاولیاء۔	استقامت کی طاقت اور کوئی نہیں رکھتا۔

(٧) مخلص

اس سے آپکی شان اخلاص بھی واضح ہوتی ہے۔ داعی الی اللہ کہہ کر اللہ نے آپکے اخلاص کی کھلی گواہی دی ہے۔ جو عمل کامل اخلاص پر مشتمل نہ ہو وہ اس پر کبھی تعریف کی سند نہیں دیتا۔ جس عمل میں ریاء کا شائبہ بھی ہو وہ عمل اللہ کے نزدیک کالعدم ہے۔ اخلاص ہی عند اللہ مقبول ہوتا ہے۔ پس یہ صرف کمال اخلاص کی گواہی نہیں عمل قبول ہونے کی علامت بھی ہے۔ اس ہستی کی کیا شان ہوگی عمل میں جسکے اخلاص اور قبولیت کی خدا گواہی دے۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام صرف مخلص ہی نہیں

اخلاص کے اس بلند ترین مرتبے فائز ہیں جو خود اللہ کو مطلوب ہے۔ ایک تو اخلاص اور دکھاوے میں تقابل ہے۔ اور ایک اس اخلاص میں مرتبے ہیں جو ریاء کے شائبے سے بھی پاک ہے۔ اخلاص معرفت سے پیدا ہوتا ہے جب معرفت میں درجے ہیں تو اخلاص میں یقیناً ہوں گے۔ دعوت وہ عمل ہے جس میں دیگر انبیاء آپکے شریک ہیں۔ سب میں صرف آپکو ہی یہ لقب دیا گیا۔ معلوم ہوا اخلاص میں آپ ﷺ کا درجہ تمام نبیوں سے بلند ہے۔

تفسیر السعدی میں فرمایا کہ داعی الی اللہ کا تقاضا ہے

واخلاص الدعوة الی الله لا الی نفسه وتعظيمها كما قد يعرض ذالك لكثير من النفوس فی هذا المقام.

اخلاص سے اللہ کی طرف بلانا نہ کے اپنے نفس اور اسکی تعظیم کی طرف۔ جیسا کہ اکثر لوگوں کو اس مقام پر یہ بات پیش آجاتی ہے۔ (الاحزاب۔۴۶)

اس کی بنا اس پر ہے کہ شاہد اور مبشر کی طرح داعی کو مطلق ذکر نہ فرمایا۔ اللہ فرماتا ہے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (آل عمران۔۷۹)

کسی بشر کا کام نہیں کہ اللہ اس کو دے کتاب اور حکمت اور پیغمبر کرے پھر وہ کہے لوگوں کو کہ میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر

داعی الی اللہ کہہ کر اللہ نے واضح کر دیا آپ کا کام لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ آپ نے اشارے کنائے میں بھی خود کو لوگوں کا محور اور مرکز بنانے کی کوشش نہ کی۔ آپ کی بابرکت سیرت اور مبارک احادیث اس پر گواہ ہیں۔ سید قطب شہید فرماتے ہیں

وداعيا الی الله لا الی دنيا، ولا الی مجد، ولا الی عزة قومية، ولا الی عصبية جاهلية، ولا الی مغنم، ولا الی سلطان او جاه و لكن داعيا الی الله فی طريق واحد يصل الی الله

اور ان میں آپ کا وظیفہ یہ ہے کہ آپ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں نہ دنیا کی طرف، نہ بزرگی کی طرف نہ قومی عزت کی طرف، نہ جاہلی عصبیت کی طرف اور نہ جاہ و سلطنت کی طرف بلکہ اس کی طرف پہنچنے والے ایک ہی راستے سے اللہ کی طرف بلاتے ہیں (فی ظلال القرآن۔ الاحزاب۔۴۶)

اس تواضع پر اللہ نے آپ کی یہ پذیرائی اور عزت افزائی کی کہ آپ کو دنیا اور آخرت تمام جہانوں میں سب کا سید اور سردار، قائد اور امام، محور اور مرکز بنا دیا۔ اسماعیل حقی فرماتے ہیں

وايضا داعيا الی الله لا الی نفسه فانه افتخر بالعبودية ولم يفتخر بالربوبية ليصح له بذالك الدعاء الی سيده.

اور اس میں اشارہ ہے کہ حضور نے اپنے نفس کی طرف نہیں اللہ کی طرف بلایا سو یقیناً ان کا مایۂ فخر رب ہونا نہیں بندہ بننا ہے تاکہ اپنے سردار کی طرف ان کا بلانا درست ہو جائے (الاحزاب۔۴۶)

(۸) حقیقت دعوت

اس اسم سے آپکی حقیقت دعوت بھی معلوم ہوتی ہے۔ داعی وہ ہوتا ہے جو کسی کی طرف بلائے اور آنے والے کو اس کے حضور پہنچائے۔ حضور ﷺ نے بندوں کو خدا کی طرف بلایا اور جو آئے انہیں اللہ کے حضور پہنچایا۔ پہنچانا تو اس تک ہوتا ہے جس کا کوئی مکان ہو اور وہ وہاں رہتا ہو یا اس کی کوئی سمت ہو جس کی طرف اسے چلایا جائے۔ مکان، زمان، سمت اور جہت مخلوق کی صفات ہیں۔ اللہ ان صفات سے پاک ہے۔ اس سے معلوم ہوا اللہ کے پاس پہنچنا یا اس کی طرف چلنا اس طرح نہیں ہوتا جس طرح مخلوق کی طرف پہنچا اور جایا جاتا ہے۔ اس سے اللہ کی طرف بلانے کا مطلب متعین ہو جاتا ہے یعنی کسی ایسی بات کی طرف بلانا جسے حضوری کہا جا سکے۔ حقیقی طور پر حاضر ہونے کا وہاں تصور نہیں۔ پس یہ دعوت اللہ کی معرفت کی دعوت ہے۔ معرفت شناختِ ذات سے تعلق رکھتی ہے اور اللہ نے یہاں اپنا وہ نام ذکر فرمایا ہے جو ذات پر دلالت کرتا ہے۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

كان المعرفة تتعلق غالبا بالذوات والامور المحسوسة.

زیادہ تر معرفت کا تعلق وجود اور محسوس امور سے ہوتا ہے (البقرۃ۔۱۴۶)

اللہ کے وجود کی حقیقت اور کنہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا امام رازی فرماتے ہیں

وتلك الحقيقة المخصوصة لا سبيل للعقل الی معرفتها فيصير العقل كالواله

اور اس کی مخصوص حقیقت پہچاننے کیلئے عقل کے پاس کوئی راستہ نہیں۔ اس مقام پر عقل بدحواس

المدهوش المتحير في هذا الموقف مدہوش اور حیران ہو جاتی ہے (ال عمران ۔۱۹۱)
اس لئے آثار اور علامات سے اس کی ذات کی طرف راہ نمائی ہوتی ہے۔ جس کی پہچان اس کی مخصوص حقیقت کے ساتھ ممکن نہ ہو اسے اس کے آثار و افعال سے ہی شناخت کیا جا سکتا ہے۔ پس داعی الی اللہ کا مطلب ہوا جو لوگوں کو اللہ کی معرفت کی طرف بلاتا ہے۔ پھر جو آجائیں انہیں اللہ کی پہچان کراتا ہے۔ اللہ کی صحیح پہچان کا نام ہی یہاں حضوری ہے۔ اس معرفت کا منطقی نتیجہ ہے غیر اللہ کا اعتراف ترک کر دیا جائے اور اللہ کو وحدہ لاشریک مانا جائے۔ یہی توحید اور یہی آپ کی دعوت ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں

ولما علم انه تعالى منزه عن جهة يحضرها الناس عنده تعين ان معنى الدعاء اليه الدعاء الى ترك الاعتراف بغيره فيشمل هذا الوصف اصول الاعتقاد في شريعة الاسلام مما يتعلق بصفات الله لان دعوة الله دعوة الى معرفته وما يتعلق بصفات الدعاة اليه من الانبياء والرسل والكتب المنزلة عليهم	اللہ جہت سے پاک ہے جہاں لوگ اس کے پاس حاضر ہوں۔ اس علم سے متعین ہو گیا کہ اس کی طرف بلانے کا مطلب اس کے غیر کا اعتراف ترک کرنا ہے۔ پھر اللہ کی صفات سے متعلق اسلامی اعتقاد کا اصول بھی اس میں شامل ہے۔ کیونکہ اللہ کی دعوت در حقیقت اس کی معرفت کی دعوت ہے۔ اور اس کی طرف بلانے والے انبیاء اور رسل اور ان پر اتاری گئی کتابوں کے متعلق اعتقاد بھی شامل ہے۔ (الاحزاب ۔۴۶)

(۹) کمال معرفت

اس خوبی سے اللہ کی معرفت میں آپ ﷺ کا کمال بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کون ہے جو اللہ کی معرفت میں آپ ﷺ کی ہمسری کا دعوی کر سکے؟ حضور ﷺ کا اللہ کے ساتھ ایسا انوکھا تعلق ہے جسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ معرفت میں کمال کی وجہ سے ہی آپ ﷺ براہ راست اللہ کی طرف بلانے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ کسی کی فکر، نظریے، رائے، اطاعت، سرداری یا حکومت کی طرف بلانا

الگ بات ہے اور خود اس کی ذات کی طرف بلانا چیزے دیگر ہے۔ یہ سمجھنے سے پہلے درج ذیل باتیں سمجھ لیں۔

(۱) ہر نبی نے اللہ کی طرف بلایا۔ ان کے بارے میں یوں تو فرمایا

يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا جو راہ چلاتے تھے ہمارے حکم سے (السجدہ)

لیکن کسی نبی کو سوائے آپکے داعی الی اللہ نہیں کہا۔ تو کیا وہ داعی الی اللہ نہیں تھے؟ حاشا وکلا۔ وہ یقیناً داعی اور اس بحر کے شناور تھے لیکن ان کی دعوت بالواسطہ دعوت تھی۔ دعوت الی اللہ میں وہ درجہ حاصل نہ تھا جو رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہے۔ حضور ﷺ ہی سزاوار تھے کہ داعی الی اللہ کا نام آپ پر بولا جاتا اور یہ تاج آپ ﷺ کے سر اقدس پر سجایا جاتا۔

(۲) قرآن نے پیغمبروں کی یہ دعوت ذکر کی ہے۔ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ ۔ اے قوم بندگی کرو اللہ کی آپ ﷺ نے بھی تمام انسانوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دی لیکن آپکو داعی الی عبادۃ اللہ نہیں کہا۔ معلوم ہوا آپکا مقام اس سے کہیں بلند ہے کہ درمیان میں آپکے لئے واسطہ رکھا جائے۔ تبھی آپکو داعی الی اللہ کہا۔ اللہ کی طرف بلانے اور اس کی عبادت کی طرف بلانے میں بیّن اور واضح فرق ہے۔

(۳) قرآن جہاں بھی آپکو دعوت کا حکم دیتا ہے یا اس کا تذکرہ کرتا ہے وہاں درمیان میں اضافتیں اور واسطے موجود ہیں۔ مثلاً

اُدْعُ إِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ ۔ بلا اپنے رب کی راہ پر (النحل)

وَإِنَّكَ لَتَدْعُوْهُمْ إِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۔ اور تو تو بلاتا ہے انہیں سیدھی راہ پر (المؤمنون)

جب وہ موقع آیا جہاں آپ ﷺ کو اس نام سے سرفراز کرنا اور داعی کے لقب سے ملقب کرنا تھا۔ وہاں تمام اضافتیں اٹھا دیں جو مغائرت پر دلالت کرتی ہیں۔ وہ تمام واسطے ختم کر دیے جو بعد اور دوری کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ایسا ہے گویا سارے حجابات مرتفع ہو گئے۔ اور اللہ کی ذات اقدس آپ ﷺ کے لئے بے حجاب ہو گئی۔ یہاں تک کہ اپنا کوئی صفاتی نام بھی ذکر نہ فرمایا۔ داعی الی الرب کہا نہ داعی الی سبیل الرب فرمایا۔ داعی الی صراط اللہ کا نام دیا نہ داعی الی صراط مستقیم کا لقب عطا کیا۔

(۴) یہاں ایک اور بات بھی توجہ کے قابل ہے۔ اللہ نے فرمایا

اے نبی ہم نے آپ کو بھیجا لوگوں کو اللہ کی طرف بلانے والا بنا کر۔ اس طرز میں ذات کی مغائرت معلوم ہوتی ہے جیسے زید کہے یہ زید کا غلام ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے قائل اور مضاف الیہ زید الگ الگ ہیں۔ رفتار کلام تقاضا کرتی ہے داعیا الی اللہ کے بجائے داعیا الینا (ہماری طرف بلانے والا) کہا جاتا۔ نہ کہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ مخلوق کی ذات اور وجود جدا جدا ہیں لیکن اللہ کے وجود اور ذات میں کوئی فرق نہیں جو وجود ہے وہی ذات ہے جو ذات ہے وہی وجود ہے۔ الینا کہنے سے وہم ہوتا کہ آپ کو حقیقت ذات کا علم ہے حالانکہ یہ مخلوق کیلئے ممکن نہیں۔ اسم ذات کو ذکر کرنے سے دو فائدے ہوئے۔ ذات پر دلالت اور اس کی وضاحت کہ اللہ کی معرفت اس کے آثار کی معرفت ہے حقیقت ذات کی معرفت نہیں۔

یہ ہے **مقام محمد ﷺ** ۔ یہ وہ رتبہ ہے جو تمام انبیاء میں سے صرف آپ کو ملا۔ ہر نبی شہید ہے۔ ہر نبی مبشر ہے۔ ہر نبی منذر ہے۔ ہر پیغمبر ہادی اور اللہ کی بندگی کی دعوت دینے والا ہے لیکن اللہ کی طرف بلانے کا اہل محمد ﷺ کے سوا کوئی نہیں۔

اللہ کی طرف بلانے والا اس کے دین کی دعوت بھی دیتا ہے۔ اس کے راستے کی ہدایت بھی کرتا ہے۔ اور اس کی بندگی کی طرف بھی بلاتا ہے۔ یہ سارے مقامات مقام محمد کی گرد ہیں۔ آپ کا مقام ان تمام مقامات سے برتر ہے۔ وہ داعی الی اللہ کا مقام ہے۔

یہ رتبہ خاتم النبیین ﷺ کے مناسب ہے۔ یہ شان عبد مطلق عبداللہ ﷺ ہی کی ہو سکتی ہے۔ یہ مقام خبر دیتا ہے کہ کسی انسان میں اللہ کی جتنی معرفت سما سکتی ہے اتنی آپ ﷺ کو حاصل ہے ممکن نہیں داعی کسی چیز کی دعوت دے اور وہ اسے مدعو سے زیادہ نہ جانتا ہو۔ داعی کے لئے خود معرفت سب سے پہلے ضروری ہے۔

(۱۰) اقرب اور اخوف

یہ لفظ کمال قرب اور انتہائے خوف کی دلیل بھی ہے۔ حضور ﷺ نہ صرف یہ کہ اللہ کے بہت قریب ہیں بلکہ آپ ہی سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ معرفت ادراک ذات کا نام ہے۔ اس سے مزاج شناسی حاصل ہوتی ہے۔ اللہ کی معرفت دراصل اس کے جلال و

جبروت اور عظمت و کبریائی کا ادراک ہے۔ یہ ادراک جتنا زیادہ ہوگا اور اللہ کے جلال و جبروت کا جتنا پرتو دل پر پڑے گا قرب میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوگا اور خوف بھی اتنا ہی بڑھے گا۔ حضور علیہ الصلاۃ والسلام چونکہ اللہ کی معرفت میں منتہائے کمال پر ہیں اس لئے قرب اور خوف میں بھی کوئی آپ ﷺ سے زیادہ نہیں۔ اسی لئے آپ نے فرمایا۔

انا اتقکم باللہ۔ میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرتا ہوں

(۱۱) کمال محبت

حضور ﷺ اللہ کے محبوب ہیں اور اللہ آپ کا محبوب ہے۔ اللہ نے اپنے حبیب کو وہ کچھ عطا فرمایا جو کسی دوسرے کو نہیں دیا۔ وہ کمال عطا فرمائے جو کسی اور کے حصے میں نہیں آئے۔ ہر کمال اور ہر شان دوسرے سے اعلیٰ، بلند اور فزوں تر ہے۔ یہ ساری باتیں اس کی دلیل ہیں کہ مخلوق میں محمد ﷺ ہی اللہ کو سب سے پیارے ہیں۔ حضور ﷺ کو سب سے زیادہ اللہ کی معرفت اور قرب حاصل ہے۔ محبت قرب کا لازمہ اور اس کا حاصل ہے۔ اللہ کی محبت آپ ﷺ کے دل کی گہرائیوں میں اتنی بس چکی ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے احسان ماننے کے باوجود خلت اور محبت کے لئے اللہ کو منتخب فرمایا۔ اللہ سے بندے کی محبت بندے کی طرف سے نہیں ہوتی۔ اپنے بے پایاں فضل و احسان سے اللہ خود بندے کو اپنی طرف جذب کرتا ہے۔ ممکن کہاں واجب الوجود کے قریب ہو سکتا ہے۔ اپنی معرفت اور قربت جو اللہ نے آپ ﷺ کو عطا کی یہ اس کی علامت ہے کہ اللہ کے ہاں بھی آپ ﷺ ہی سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لئے خلیل تو آپ ﷺ بھی ہیں اور ابراہیم علیہ السلام بھی لیکن حبیب آپ کے سوا کوئی نہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم

(۱۲) دیدار الٰہی

اللہ کی حقیقت پانا اور کنہ ذات کا ادراک کرنا ممکن کے لئے ممکن ہوتا تو آپ ﷺ ہی اس کے مستحق تھے۔ البتہ یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ آپ نے اللہ کی کسی خاص تجلی کا دیدار کیا ہے۔ یہ دیدار روحانی نہیں بیداری کی حالت میں ہوا۔ حضرت ابن عباس اور سلف صالحین کی ایک جماعت کا یہی مذہب ہے۔ اس کے بغیر معرفت تام نہیں ہو سکتی۔ جس نے آم دیکھا نہ کھایا اُسے

ہزاروں آدمی آم کی تفصیلات بتائیں وہ آم کی معرفت میں اس شخص کے برابر نہیں ہو سکتا جس نے آم دیکھا اور کھایا ہے۔ جنتی اللہ کے دیدار کے وقت سجدے کی جو درخواست کریں گے اس میں یہی رمز ہے کہ وہ معرفت دنیا کی معرفت سے جدا اور اتم ہوگی۔

(۱۳) حق بیان کرنے والا

آپ ﷺ کی دعوت کے بیان میں قرآن الفاظ دعوت کا ذکر نہیں کرتا۔ البتہ دیگر آیات سے اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ شاید اس دعوت میں آپ ﷺ کا مقام خود ہی اس کا بیان ہے۔ اللہ کی طرف بلانا اس کی معرفت کی دعوت ہے۔ غیر کا اعتراف ترک کرنا اس کی پہلی بنیاد ہے۔ یہ نفی ہے۔ اس کا حاصل اللہ کی وحدانیت ہے۔ یہ اثبات ہے۔ آپ کی دعوت نفی اور اثبات پر مشتمل ہے۔ کلمہ طیبہ کا پہلا جز اسی کا عنوان ہے۔ دوسرا جز بیان کرتا ہے اس کے داعی محمد ﷺ ہیں۔

کفار تو دین کی جزئیات اور فروعات کے مخاطب نہ تھے۔ ان کے سامنے اصول اسلام رکھے۔ اور مؤمنوں کو پورا دین سمجھایا۔ راستے کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ فرمایا۔ یہی بیان حق ہے۔ اور یہی آپ ﷺ کے موصل ہونے کا مطلب ہے۔ ناصر الدین فرماتے ہیں

وذکر تفاصیل مایدعوا الیہ	جس طرف بلا رہے ہیں اس کی تفصیلات بتانا، پاکیزہ
بتعریفھم لربھم بصفات	صفات کے ساتھ رب کی خوبیاں بیان کرنا، جو اس کی
المقدسۃ وتنزیھہ عما لایلیق	شان جلال کے مناسب نہیں ان سے پاک کرنا اور بندگی
بجلالہ وذکر انواع العبودیۃ	کی تمام انواع ذکر کرنا اس داعی کا تقاضا ہے۔ (احزاب۔ ۴۶)

(۱۴) دلیل ختم نبوت

آپ ﷺ کے علاوہ سب پیغمبروں کی دعوت اپنی قوم اور زمانے کے لئے تھی۔ داعی الی اللہ ہونا عموم دعوت کا تقاضا کرتا ہے۔ بلا شرکت غیرے یہ آپ کا منصب اور مقام ہے۔ اگلوں پچھلوں میں مصطفیٰ کے علاوہ کوئی داعی الی اللہ نہیں۔

جب یہ مقام آپ ﷺ ہی کے لئے مخصوص ہے تو لازم آیا کہ آپ ﷺ سب کیلئے داعی ہوں۔ قرآن جہاں بھی آپکی دعوت، داعی یا ہادی ہونے کا ذکر کرتا ہے وہاں مفعول کا ذکر نہیں کرتا۔

روح المعانی میں ہے

ای من بعثت الیھم من الامۃ قاطبۃ	مفعول ذکر نہ کرنا عموم دعوت کی دلیل ہے۔ پوری
فحذف المفعول دلالۃ علی التعمیم	امت کو جن کی طرف آپ کو بھیجا دعوت دیں (النحل۔ ۱۲۵)

آپ ﷺ کی دعوت عام، تمام زمانوں اور تمام انسانوں کے لئے ہے۔ انبیاء بھی آپ ﷺ کے حلقہ دعوت میں داخل ہیں۔ یہی خاتمیت مرتبی ہے۔ جس سے اوپر کسی نبی کا رتبہ نہیں۔ اور اس کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں۔ انبیاء داعی الی اللہ تھے لیکن عبادت کی جہت سے۔ تفسیر حقی میں ہے

فیہ اشارۃ الی ان نبینا علیہ الصلاۃ و	اس میں اشارہ ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم
السلام اختص برتبۃ دعوۃ الخلق الی	کا رتبہ مخلوق کو اللہ کی طرف بلانے کا ہے۔ آپ
اللہ من بین سائر الانبیاء والمرسلین	اس میں تمام انبیاء و مرسلین سے ممتاز ہیں۔ باقی
فانھم کانوا مامورین بدعوۃ الخلق	نبی مخلوق کو جنت کی طرف بلانے کے مامور تھے
الی الجنۃ	(الاحزاب۔ ۴۶)

آپ ﷺ کا مقام بلا حجاب و بلا واسطہ اللہ کی طرف بلانے کا مقام ہے۔ مخلوق میں اس بے حجابی کا تحمل نہیں۔ اس کے حال پر اللہ نے مہربانی کی۔ آپ ﷺ کو مامور فرمایا کہ اسے رب کے راستے (سبیل اور صراط) کی دعوت دیں۔ یہ مخلوق پر شفقت تھی۔ آپ نے اس مقام عالیشان سے تنزل فرمایا اور عبادت کی جہت سے انہیں اللہ کی طرف بلایا۔

آپ ﷺ نبی الانبیاء، خاتم النبیین اور داعی الی اللہ ہیں۔ تو لازماً انبیاء بھی آپ کے مدعو ہوں گے۔ انہیں اللہ کی طرف بلانے کا مطلب وہی وسیلہ ہے کہ انہیں مناصب دعوت آپ کے توسط سے عطا ہوئے۔ جیسا کے نبی الانبیاء کی بحث میں گزرا۔

(۱۵) حجیت حدیث

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ آپ ﷺ کا قول و فعل حجت و سند ہے۔ حدیث اسی کا نام ہے۔ اس کی ایک وجہ تو ابتداء میں گزر چکی ہے۔ دوسری وجہ داعی کی حیثیت ہے۔ دعوت صرف آواز لگانے کا نام نہیں۔

کیا داعی صرف قاصد اور سفیر ہوتا ہے جو پیغام مدعو کے حوالے کرکے بری الذمہ ہو جائے۔ اور پیغام کا خانہ ساز مفہوم و مراد متعین کرنا مدعو کی ذمہ داری ہو۔ جس کا کرشمہ ساز ذہن جو مراد متعین کرنا چاہے کرلے؟

نہیں۔ داعی صرف قاصد نہیں۔ پیغام کی وضاحت و تشریح داعی کا فرض ہے۔ مفہوم کا تعین داعی کا منصب ہے۔ اس کی مراد بیان کرنا داعی کی ذمہ داری ہے۔ عقل سلیم اسی بات کا تقاضا کرتی ہے۔ اگر داعی کا بیان حجت و سند نہ ہو تو اس کی داعیانہ حیثیت مذاق سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس صورت میں مطلوب حاصل نہیں ہوگا۔ فساد پیدا ہو جائے گا اور پیغام کی شکل ہی بگڑ جائے گی۔ قرآن آپ کا پیغام آپ کی دعوت ہے اور آپ کا قول و فعل اس کی شرح و بیان ہے جو حدیث و سنت سے موسوم اور یقیناً حجت و سند ہے۔

(۱۶) طرز دعوت

یہی اسم طرز دعوت کی وضاحت بھی کرتا ہے۔ داعی کو ہر رنگ اور ہر مزاج کے افراد سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مدعو کو ترغیب کی چاشنی اور طلب کی حلاوت سے بلانا داعی کا کام ہے۔ اسے چاہئے ترغیب و تحریص کے ممکن طریقے بروئے کار لائے۔ سخن شیریں اور مضبوط ہو۔ گفتار تلخی سے مبرّا اور تلخی سے منزہ ہو۔ مدلل کلام ہو۔ دردمندی کے احساس اور خیر خواہی کے جذبے سے گفتگو ہو۔ بصیرت اور حکمت سے مدعو کے در دل پہ محبت آمیز دستک دے۔ افراد سے مرعوب اور حالات سے عاجز ہو کر دعوت کے خیرہ کن موتی نہ لٹائے۔ عامیانہ گفتگو اور سوقیانہ انداز اختیار نہ کرے۔ مدعو کے مزاج و فکر کو پیش نگاہ رکھے۔ اس کے مقام عقل پر اتر کر دعوت دے۔ اس کی عزت نفس کو مجروح نہ کرے۔ سب و شتم سے گریز کرے۔ اس کی تالیف قلب کا اہتمام کرے۔ مُروّج اسالیب کلام میں سے احسن کو اختیار کرے۔ متانت و وقار سے مدعو کا موقف سنے اور اعتراض کا جواب دے۔ معاندین و مکابرین سے اعراض کرے۔ لوہا گرم کر کے چوٹ لگائے۔ حُسنِ کلام کے ساتھ حُسنِ عمل کا نمونہ بھی پیش کرے۔ عفو و درگزر سے کام لے۔ اپنی ذات کے لئے کسی سے انتقام نہ لے۔ یہ بجائے خود مستقل موضوع ہے۔ خدا نے چاہا تو اسالیب دعوت کے عنوان

سے اس پر کلام ہوگا۔ اللہ نے طرز دعوت خود سکھایا مثلاً فرمایا۔

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ	بلا اپنے رب کی طرف پکی باتیں سمجھا کر اور
وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ	نصیحت سنا کر بھلی طرح الزام دے ان کو جس
بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ	طرح بہتر ہو (النحل۔۱۲۵)

تفسیر رازی اور عثمانی میں اس پر جامع مانع پر اثر گفتگو کی گئی ہے۔

(۱۷) کمال علم

یہ لفظ علم میں بھی آپ کے کمال اور فوقیت پر بھی دلالت کرتا ہے۔ اس حوالے سے بات پہلے ہو چکی ہے۔

(۱۸) اللہ کا نمائندہ

داعی الی اللہ کے ساتھ بِاِذْنِہٖ کا لفظ زیادہ کیا۔ اس سے معلوم ہوا آپ نے یہ فریضہ اپنی رائے اور سوچ سے انجام نہیں دیا۔ جیسے ایک حساس اور دردمند دل انسان اپنی قوم کو جتلائے آزار دیکھتا ہے تو اس کیلئے کچھ کر گزرنے کی تڑپ اور تمنا پیدا ہوتی ہے۔ وہ تڑپ اس کی سوچ کا محور بن جاتی ہے۔ دُرونِ ذہن ایک تحریک کا تانا بانا تیار ہوتا ہے اور ارادہ عمل کا جامہ پہن لیتا ہے۔ آپ کی دعوت اندرونی ذاتی تحریک و تاثر کا نتیجہ نہیں تھی۔ اس کیلئے اللہ کی طرف سے آپ کو مقرر کیا گیا اور ہر قدم پر راہنمائی کی گئی۔ مفسر حقی فرماتے ہیں

قال بعض الکبار باذنه ای بامره	کچھ بزرگوں نے فرمایا اللہ کے اذن یعنی اس
لا بطبعك ورایك وذلك فان	کے حکم سے بلائیں نہ کہ اپنی طبیعت اور رائے
حکم الطبع مرفوع عن الکمل	سے۔ سو بیشک طبیعت کی تابعداری کاملین کی
فلا یدعون قولا و عملا الا بالفناء	شان نہیں۔ پس یہ اللہ کی ذات میں فنا ہو کر
فی ذات اللہ عزوجل (الاحزاب۔۴۶)	قول و عمل سے اللہ کی طرف بلاتے ہیں۔

شاہد، مبشر اور نذیر کا تعلق لوگوں کے اعمال سے ہے۔ داعی کا تعلق لوگوں کے قلب اور ان کی ذات سے ہے۔ دعوت دلوں کو پلٹنے اور ایک نیا انسان بنانے کا نام ہے۔ جس بات کی طرف یہ داعی

بلائے گا وہ پرانی اور انوکھی ہے۔ پرانی اس لحاظ سے ہے کہ پچھلے پیغمبروں سے آرہی ہے۔ البتہ اس میں اور ان میں ایک نوعی فرق ہے کہ یہ دعوت اکمل واتم ہے۔

سید قطب فرماتے ہیں

باذنه فما هو بمبتدع ولا بمتطوع ولا بقائل من عنده شيئا انما هو اذن الله له وامره لا يتعداه (فی ظلال القرآن۔ احزاب۔۴۶)	اس کے حکم سے پس نہ وہ مبتدع ہے نہ مرضی کرنے والا۔ نہ یہ کہتا ہے کہ اس کے پاس کچھ ہے بات یہی ہے کہ اللہ نے اسے اجازت دی اور امر کیا۔ وہ اس میں حد سے تجاوز نہیں کرتا۔

نئی اور انوکھی اس پہلو سے ہے کہ معاشرے کے چلن کے خلاف ہے۔ ظاہر ہے جاری رسم و رواج کی طرف بلانا تو تحصیل حاصل ہے۔ باذنه کہہ کر بتایا گیا آپ ﷺ کا دعوت دینا معاشرے اور قوم کے اعتقاد و عمل اور نظام سے بغاوت و برأت کے مترادف ہوگا۔ اس راہ میں مشکلیں آئیں گی۔ مصائب کے تند و تیز طوفان برپا ہوں گے۔ یہ مشکل راستہ آپ ﷺ اللہ کے حکم سے ہی طے کر سکیں گے۔ اس کی کٹھنائیاں اللہ کے اذن سے آسان ہوں گی۔ اذن حکم کے معنی میں ہے یا اس سے تیسیر مراد ہے۔

استعير لفظ الاذن للتيسير۔ اذن کا لفظ آسانی کیلئے مستعار لیا گیا ہے۔ (عمیان الاور۔ احزاب۔۴۶)
کیونکہ اجازت تو ار سلناك سے ہی مفہوم ہو رہی ہے۔ (البحر المحیط)

قرنوں کی روایتیں جو عقیدوں میں ڈھل کر لازمہ حیات بن چکی تھیں۔ صدیوں کی ریتیں جو معاشرے کی بنیادوں میں گڑ چکی تھیں۔ انکے بجائے ایک خدا کی بات کرنا ان باطل روایات کا انکار تھا۔ اس کے دین کی دعوت ان بنیادوں پر ضرب تھی۔ یہ دعوت ہر باطل نظام کو تہہ و بالا کرنے والی تھی۔ مبنی بر غلط معاشروں کیلئے صور اسرافیل سے کم نہ تھی۔ جس نے پرکھوں سے ملی ہوئی روایتیں اور ان پر بنے ہوئے عقائد و نظریات کے مینار یک جنبش لب مسمار کر دیے۔ ایسے معاشرے میں یہ ایسا کام نہیں تھا جس پر گلوں کے ہار پرو کر گلے میں ڈالے جاتے۔ راہوں میں گل پاشی ہوتی اور مخملیں فرش بچھائے جاتے۔ یہ محلات میں رہ کر، مسندوں پر بیٹھ کر، گاؤ تکیوں

سے ٹیک لگا کر کرنے والا کام نہ تھا۔ یہ بنجر زمینوں کو شاداب بنانے، سنگلاخ زمینوں سے پانی نکالنے اور ریگستانوں کو گلستان بنانے والی بات تھی۔ یہ پہاڑ کھود کر جوئے شیر نکالنے سے مشکل تھا۔ یہ اس میدان میں قدم رکھنا تھا جہاں کی صعوبتیں سوچ کر ہی جگر خون اور پتہ پانی ہو جاتا ہے۔ اس کی پاداش میں وہی کچھ پیش آنا تھا جو آپ ﷺ کو پیش آیا۔

مخالفت، بدزبانی، بے اعتنائی، تہمتیں، تحقیر، استہزاء، تمسخر، ظلم، جبر، مار پیٹ، پتھروں کی بارش، مقاطعہ، ہجرت، جنگیں، زخم، شہادتیں، ساتھیوں کی جدائی اور شازشیں غرض آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہیں ہوا۔ اگر اللہ کی مدد، اس کا حکم اور اس کی طرف سے سہولت و آسانی نہ ہوتی تو ممکن نہ تھا کہ آپ ﷺ یہ کام انجام دے سکتے۔

(۱۹) دعوت کے ذرائع

دعوت صرف زبان سے ہوتی ہے۔ یا اس کیلئے کوئی اور ذریعہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے؟ آنے والی آیت سے معلوم ہوتا ہے اصل تو زبان ہی ہے بوقت ضرورت تحریر اور ہاتھ (قتال) بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ قیصر و کسریٰ اور دیگر شاہوں کو آپ نے خط کے ذریعے دعوت دی۔ عمل بھی مجازاً ذریعہ دعوت ہوتا ہے۔ اللہ نے فرمایا

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ	اور اس سے بہتر کس کی بات ہو سکتی ہے جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک کام کیا اور کہا کہ میں بات ماننے والوں میں سے ہوں۔ (فصلت۔۳۳)

یہاں قول کو غلبے کی وجہ سے ذریعہ دعوت قرار دیا گیا۔ کیونکہ اکثر دعوت زبان سے ہی ہوتی ہے۔

والظاهر ان المراد الدعاء باللسان و قيل به وباليد كان يد عوالى الاسلام ويجاهد وقال زيد بن على دعا الى الله بالسيف (آلوسی۔ فصلت۔۳۳)	اور ظاہری مراد دعوت بذریعہ زبان ہے۔ اور کہا گیا کہ اس کے علاوہ ہاتھ کے ساتھ بھی داعی اسلام کی طرف بلاتا اور جہاد کرتا ہے۔ زید بن علی نے کہا اس نے تلوار کے ساتھ اللہ کی طرف بلایا

تلوار کا مطلب ہے رکاوٹ بننے والے کو بذریعہ قتال راستے سے ہٹا دیا جائے۔ ابن عاشور یہاں

فرماتے ہیں۔ سبھی مومن مشرکوں کو اللہ کی طرف بلانے والے ہیں لیکن

سید الداعین الی اللہ ھو محمد ۔ داعیوں کے سردار محمد ﷺ ہیں۔

امام رازی رحمۃ اللہ نے یہاں انبیاء اور علماء کی دعوت پر ایک بہترین اور نفیس بحث کی اور آخر میں فرمایا۔ داعی میں چار خوبیاں جمع ہوتی ہیں۔ زبان سے اقرار کرتا ہے۔ ظاہری اعمال بجالاتا ہے۔ صحیح العقیدہ ہوتا ہے اور دعوت میں مشغول و مصروف رہتا ہے۔

ولا شك ان الموصوف بهذه الخصال الاربعة اشرف الناس وافضلهم و كمال الدرجة في هذه المراتب الاربعة ليس الا بمحمد صلى الله عليه وسلم	اور کوئی شک نہیں ان چار خصلتوں سے موصوف لوگوں میں اشرف، ان میں افضل اور ان چار مرتبوں میں درجہ کمال حاصل کرنے والے صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ (فصلت۔۳۳)

سراج منیر

داعی الی اللہ کے بعد اللہ نے آپ کو سراج منیر کا لقب دیا۔ روشن اور چمکتے چراغ کیساتھ آپ کو تشبیہ دی اور فرمایا

یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا وَّدَاعِیًا اِلَی اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِیْرًا	اے نبی ہم نے تجھ کو بھیجا بتانے والا اور خوشخبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور بلانے والا اللہ کی طرف اسکے حکم سے اور چمکتا ہوا چراغ۔ (الاحزاب ۴۵۔۴۶)

سراج کیا ہے؟

سراج مسلسل تیز روشنی والے چراغ کو کہتے ہیں جو ٹمٹماہٹ اور جھلملاہٹ سے پاک ہو۔ یعنی سراج وہ چراغ ہے جو مسلسل لگاتار جل رہا ہو اس کی نورانیت میں کوئی کمی نہ ہو اور تسلسل میں کوئی انقطاع نہ ہو۔ منیر کا مصدر انارۃ ہے جو خود روشن ہو اور دوسروں کو روشن کردے۔ صرف چراغ کہنے سے یہ وہم پیدا ہوتا کہ چراغ کا تیل ختم ہو جائے یا فتیلہ جل جائے تو بجھ جاتا ہے۔ منیر کہہ کر اس وہم کا ازالہ فرمایا اور واضح کردیا یہ چراغ بجھنے والا نہیں ہمہ وقت روشن اور درخشاں ہے۔

ووصفه بالانارة لان من السراج مالا يضيء اذا قل سليطه ودقت فتيلته۔ (البحر المحيط۔ الاحزاب۔۴۶)	اور چراغ کو روشن کرنے سے موصوف کیا کیونکہ چراغ وہ ہے جب اسکا تیل ختم ہو جائے اور فتیلہ کم ہو جائے تو وہ روشنی نہیں کرتا

(۱) ختم نبوت کی دلیل :

داعی الی اللہ کا لقب جیسے آپ ﷺ کی خصوصیت ہے ویسے ہی روشن چراغ کا خطاب بھی آپ ﷺ کا امتیاز ہے۔ آپ ﷺ کے علاوہ کسی نبی کو سراج منیر نہیں کہا گیا۔ کیونکہ باقی نبیوں کے چراغ بجھنے والے تھے آپ ﷺ کا چراغ ہمیشہ جلتا رہے گا۔ اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب آپ ﷺ کے بعد

کوئی نبی نہ ہو۔ آپ کو سراج منیر کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں۔ زندگی کا سفر اب اسی چراغ کی روشنی میں طے کرنا ہوگا۔

(۲) انوارات کا ظہور:

آپ شروع سے روشن چراغ ہیں جیسا کہ خاتم النبیین سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس نور کا ظہور اس وقت ہوا جب عالم شہادت میں آپ ﷺ کو منصب نبوت عطا ہوا اور آپ ﷺ نے لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا شروع کیا اس لئے آپ ﷺ کی یہ خوبی داعی الی اللہ کے بعد ذکر فرمائی

لانه کونه سراجاً یتصور مع التبلیغ و بعد التبلیغ لانه قبل التبلیغ لایظهر للناس هداه	کیونکہ چراغ ہونا بوقت تبلیغ اور بعد از تبلیغ ہی متصور ہے اور تبلیغ سے پہلے آپ کی راہنمائی لوگوں کیلئے ظاہر نہیں ہوئی (النفیس ۔۳۶)

(۳) ھادی:

چراغ اس وقت جلایا جاتا ہے جب اندھیرا ہو۔ اندھیرے میں راستہ معلوم نہیں ہوتا لوگ بھٹک جاتے ہیں۔ چراغ راہنمائی کرتا ہے۔ ظاہر ہے آپ حقیقت میں چراغ نہیں بلکہ آپ ﷺ کے انوارات کو چراغ کے نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ آپ ﷺ کو چراغ کہنے کا مطلب ہے آپ ﷺ صراط مستقیم کی راہنمائی کرنے والے اور حق کو واضح کرنے والے ہیں۔ آپ نے کفر اور شرک کے اندھیروں میں اجالا کر کے بھٹکی ہوئی انسانیت کو راہ ہدایت دکھایا۔

ارسلناك كالسراج المنير في الهداية الواضحة التي لا لبس فيها والتي لا تترك للباطل شبهة الافضحتها (ابن عاشور ۳۶)	ہم نے آپ کو واضح ہدایت میں روشن چراغ کی مانند بنا کے بھیجا وہ ہدایت جس میں کوئی اشتباہ نہیں جس نے باطل کیلئے شبہ کی رسوائی کے سوا کچھ نہ چھوڑا۔

امام رازی فرماتے ہیں

فقوله سراجا ای هادیاً مبیناً كالسراج يرى الطريق و يبين الامر	سراج سے مراد ہے آپ چراغ کی مانند ہادی اور مبین ہیں جو راستہ دکھاتا اور بات کو کھول دیتا ہے (الرازی ۔۳۶)

(٤) ذریعہء معرفت ، امام اور متبوع

چراغ ہونا یہ بھی بتاتا ہے کہ آپ لوگوں کیلئے اللہ کی معرفت کا ذریعہ ہیں۔ کیونکہ چراغ کا یہی مقصد ہوتا ہے کہ اسے روشن کر کے منزل کی پہچان حاصل کی جائے۔ چراغ کو سامنے رکھ کر اس کی روشنی میں سفر طے کیا جاتا ہے۔ انسانیت کی منزل اللہ کی معرفت اور پہچان ہی ہے۔ مخلوق نے اگر آپ ﷺ کو واسطہ نہ بنایا تو کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتی بلکہ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہے گی۔ یہ چراغ روشن ہے اور تا ابد روشن رہے گا۔ اللہ نے اسے خود روشن فرمایا تاکہ اس کے ذریعے لوگ اُسے شناخت کریں اور اس کے احکام کو جان لیں۔ لوگوں کا کام ہے اسے امام بنا کر اس کے پیچھے چلیں اور اس کی اطاعت کریں۔ اس کی اتباع کیے بغیر اللہ کی معرفت اور منزل مراد کا حصول ممکن نہیں۔

(۵) صحابہؓ کا مقام اور علماء کی شان:

اس وصف سے آپ ﷺ کے صحابہ کی شان اور امت کے علماء کا مقام بھی پتہ چلتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے آپ ﷺ اپنے اوصاف آگے منتقل فرمائیں گے اور آپ کی امت کو بھی وہی مناصب حاصل ہوں گے جو انبیاء کے ہیں۔

چراغ جب روشن ہو تو اس کا ماحول بھی روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے صرف سراج (یعنی چراغ) کا لفظ استعمال کرنا ہی کافی تھا۔ ان الانارة من لوازم السراج۔ اسی پر اکتفاء کرنے کے بجائے منیر کا لفظ بھی ساتھ بڑھایا۔

منیر باب افعال سے ہے جس کا مصدر انارۃ ہے۔ باب افعال کا ہمزہ کبھی صاحب ماخذ بنانے کے لئے آتا ہے اور کبھی متعدی بنانے کے لئے۔ اس بنا پر منیر کا ترجمہ ہوا خود روشن اور دوسروں کو روشن کرنے والا۔ (لغات القرآن)

آپ ﷺ خود تو روشن ہیں ہی اس روشنی کو دوسروں تک منتقل کر کے انہیں بھی روشن کرتے ہیں۔ یہاں آپ ﷺ کے اوصاف نبوت کو چمکتے دمکتے چراغ سے تشبیہ دی گئی۔ یہ اوصاف آپ ﷺ میں کمال درجے کے ہیں۔ انہی اوصاف کی بنا پر حضور ﷺ روشن ہیں اور یہی اوصاف دوسروں

کو عنایت فرما کر انہیں روشن فرماتے ہیں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی یہ خوبیاں آگے امت تک منتقل ہوئیں۔ آپ بھی شاہد آپ کی امت بھی۔ آپ بھی داعی اور آپ کی امت بھی۔

جس امتی نے ان میں جتنا حصہ حاصل کیا اس کا مرتبہ اور مقام اتنا زیادہ ہوگا۔ سب سے زیادہ صحابہ نے انہیں حاصل فرمایا کیونکہ یہ اس وقت اس چراغ کے پروانے بنے جب یہ بنفسِ نفیس عالم شہادت میں جگمگا رہا تھا۔ کسی واسطے کے بغیر انہوں نے اس سے اکتساب فیض کیا۔ منصب شہادت اور مقام دعوت کے لئے سب سے پہلے جن کا چناؤ ہوا وہ صحابہ ہی ہیں۔ پھر ان کے واسطے سے علماء کرام نے ان اوصاف میں کمال پیدا کیا۔ انذار جو رسول اللہ ﷺ کی شان ہے وہ اللہ نے علماء کے لئے بیان فرمائی

وَلِيُنذِرُوا قَوْمَهُمْ اور تا کہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو

اپنی گواہی کے ساتھ ہی علماء کی گواہی کو بھی شامل فرمایا۔ علماء آپ کے ارشاد کے مطابق علم نبوت میں آپ ﷺ کے وارث کہلائے کیونکہ یہ اوصاف علم سے تعلق رکھتے ہیں اور پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ امتی پر فیضان نبوت علم کی صورت میں ہوتا ہے۔ چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں

علوم نبوت جو حضور ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ سے امت نے حاصل کیے اس میں تو صحابہ کے ساتھ ساری امت شریک ہے کچھ صحابہ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اصل سننے والا بھول جاتا ہے اور جس کو علم پہنچایا جاتا ہے وہ زیادہ یاد رکھتا ہے امتیاز صحابہ یہ ہے کہ وہ براہ راست انوار نبوت کے خوشہ چین تھے دوسروں کو جو روشنی ملی وہ صحابہ کے توسط سے ملی۔ (تفسیر مظہری۔ الاحزاب)

(٦) جامع الصفات

جب آپکا ورود مسعود ہوا اس وقت پوری دنیا کفر شرک اور ظلم وزیادتی کے اندھیروں میں گرفتار تھی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور عالم شہادت میں منصب نبوت آپکو عطا ہوا تو کائنات نور حق سے جگمگا اٹھی۔ علامہ ناصر الدین ان صفات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

وذالك يقتضى ان الخلق فى ظلمة	چراغ ہونا تقاضا کرتا ہے کہ مخلوق بھاری اندھیرے

عظيمة لانور يهتدى به فى ظلماتها	میں تھی۔ کوئی نور نہ تھا کہ اندھیروں میں اس سے
ولاعلم يستدل به فى جهالاتها	ہدایت پاتی۔ علم نہ تھا کہ اس سے اپنی جہالتوں پر
حتى جاء الله بهذا النبى الكريم فاضاء	استدلال کرتی۔ یہاں تک کہ اللہ نے اس نبی کریم
الله به تلك الظلمات وعلم به من	کو بھیجا پس آپ کے ساتھ اللہ نے ان اندھیروں کو
الجهالات وهدى به ضلالا الى	روشن کر دیا آپ کے ذریعہ جہالتوں میں تعلیم دی اور
الصراط المستقيم فاصبح اهل	گمراہوں کی صراط مستقیم کی طرف راہنمائی فرمائی۔ پس
الاستقامة قد وضح لهم الطريق	وہ استقامت والے بن گئے۔ ان کے لئے راستہ
فمشوا خلف هذا الامام وعرفوا به	واضح ہو گیا وہ اس امام کے پیچھے چلے اور انہوں نے
الخير والشر واهل السعادة من	خیر و شر کو اور سعادت مندوں کو بدبختوں میں سے
اهل الشقاوة واستناروا به لمعرفة	پہچان لیا۔ آپ سے اللہ کی معرفت کا نور حاصل کیا
معبودهم وعرفوه باوصافه الحميدة	اور اسکے محمود اوصاف، درست افعال اور راست
وافعاله السديدة واحكامه الرشيدة	احکام کیساتھ اللہ کو پہچان لیا (السعدی۔ الاحزاب۔ ٣٦)

پچھلے الفاظ میں آپ ﷺ کی جن خوبیوں کا تذکرہ ہوا ہے اس صفت نے ان سب کو سمیٹ لیا ہے۔ نور سراج شاہد بھی ہے اور داعی بھی۔ بشارت بھی ہے اور انذار بھی۔

وهذا الوصف شامل لجميع الاوصاف	اور یہ وصف ان تمام خوبیوں کو شامل ہے جن کا ابھی
التى وصف بها انفا فهو كالفذلكة	ذکر کیا گیا ہے پس یہ صفت خلاصہ اور تتمے کے طور
والتذييل۔	پر ذکر کی گئی۔ (ابن عاشور۔ الاحزاب۔ ٣٦)

(٧) فرقان اور زاهق الباطل

چراغ سے اندھیروں میں روشنی ہوتی ہے۔ روشنی سے نور بصارت بڑھ جاتا ہے۔ حقائق نظر آتے ہیں۔ اشتباہ ختم ہو جاتا ہے۔ شک کے زہریلے ناگوں کا زہر ختم ہو جاتا ہے۔ اندھیرے میں جسے سانپ سمجھا وہ رسی نکلی۔ جسے کوئی بلا سمجھا وہ درخت کا تنا ظاہر ہوا۔ باطل یوں ہوا ہو جاتا ہے جیسے روشنی سے اندھیرا اڑنچھو ہو جاتا ہے۔ اندھیرا کیا ہے؟ روشنی نہ ہونے کا نام ہے۔ باطل کی حقیقت

بھی بھی بے حق نہ ہونے کا نام باطل ہے روشنی کے سامنے اندھیرا نہیں ٹھہر سکتا اسی طرح حق کے سامنے باطل نہیں ٹک سکتا۔ آپ ﷺ کے وجود مسعود سے شکوک کی بنیادیں گر گئیں۔ صحیح غلط، اچھے برے اور حق و باطل میں تمیز ہوئی۔ آپ ﷺ نے شرک و عدوان کے اندھیرے نور توحید سے روشن کر دیئے۔ آپکے نور نبوت سے اللہ نے نور بصیرت میں اضافہ فرمایا۔ چیزوں کی حقیقت ظاہر ہوئی جس کائنات کو خدا سمجھ لیا تھا وہ خادم معلوم ہوئی۔

ابو حیان البحر المحیط میں فرماتے ہیں

جلی من ظلمات الشرك واهتدى به الضالون كما يجلي ظلام الليل بالسراج المنير ويهتدى به. اذا مدّالله بنور نبوته نور البصائر كما يمد بنور السراج نور الابصار	شرک کے اندھیرے کافور کر دیئے اور گمراہوں کو اس سے ہدایت ملی جس طرح روشن چراغ سے رات کی تاریکی دور ہوتی ہے اور لوگ راہ پکڑتے ہیں آپ کی نبوت کے نور سے اللہ نے بصیرتوں میں اضافہ کر دیا جیسے چراغ کے نور سے نگاہوں کا نور بڑھ جاتا ہے۔ (الاحزاب۔۴۶)

مفسر حقی فرماتے ہیں

انه عليه السلام يضئ جميع الجهات الكونية الى جميع العوالم كما ان السراج يضئ من كل جانب وايضا يضئ لامته كلهم كالسراج لجميع الجهات الامن عمى مثل ابى جهل ومن تبعه على صفته فانه لا يستضئ بنوره ولا يراه حقيقة (الاحزاب۔۴۶)	حضور علیہ الصلاۃ والسلام نے تمام جہانوں کی تمام اطراف کو اسی طرح روشن فرمایا جیسے چراغ چہار جانب کو روشن کرتا ہے۔ اور اسی طرح چراغ کی مانند تمام جہتوں میں پوری امت کے لئے روشنی فرمائی مگر جس نے ابو جہل اور اس صفت میں اسکے پیروکار کی مانند خود کو اندھا کر لیا سو بیشک انہوں نے آپکے نور سے روشنی حاصل نہ کی اور حقیقت کو نہ دیکھا

چراغ کی روشنی سے شیشے کی چمک اور کوئلے کی سیاہی دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۸) سورج کے بجائے چراغ سے تشبیہ دینے کی وجہ

آپکی ہمہ گیر دعوت و نبوت کے ظاہری تقاضا یہ تھا کہ آپکو سورج سے تشبیہ دی جاتی۔ اس کے بجائے

آپکے ساتھ سورج کو بھی چراغ سے تشبیہ دی اور فرمایا

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا۔ اور سورج کو چراغ بنایا۔ (نوح)

آپکو چراغ کہا تو صفت منیر بیان کی۔ سورج کو چراغ کہا تو صفت وہاج ذکر فرمائی۔

امام راغب المفردات میں فرماتے ہیں

الوهج حصول الضوء والحر من النار جو روشنی اور حرارت آگ سے حاصل ہو وہ وھج ہے۔ یعنی بہت تیز اور جلا دینے والی روشنی۔ سورج نار ہے۔ محمد نور ہیں۔ سورج جلانے والا ہے۔ محمد جلانے والے ہیں۔ مطلب یہ ہوا تنویر اور ضیاء پاشی میں آپ سورج کے مشابہ ہیں لیکن روشنی کی نوعیت الگ الگ ہے۔ جیسے زید کو کہا جائے جواد رحیم اور عمر کو کہا جائے جواد رؤف زید اور عمر کی سخاوت ایک پہلو سے ہم مثل ہونے کے باوجود نوعیت میں الگ الگ ہے۔ اسمیں مفسرین نے درج ذیل نکات بیان فرمائے۔

(ا) چراغ سے تشبیہ دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے روشنی لیکر مزید چراغ جلائے جا سکتے ہیں لیکن سورج سے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ ابن عاشور کہتے ہیں۔

وعبر به (اى السراج) دون الشمس لانه يقتبس منه ولا ينقص (احزاب۔۴۶)	اور سورج کے بجائے چراغ سے تعبیر کیا کہ چراغ سے نور لیا جاتا ہے اور اس میں کمی نہیں ہوتی

چنانچہ صحابہ اور علماء امت نے آپ ﷺ سے شریعت کے علوم، طریقت کے فوائد، معرفت کے انوار اور حقیقت کے اسرار حاصل کیے آپ ﷺ میں یہ سب بکمالہ موجود ہیں کم نہیں ہوئے۔ (حقی۔۴۶)

(ب) سورج ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہو سکتا۔ چراغ ایک سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتا ہے اللہ نے آپکو مکہ میں روشن فرمایا اور پھر مدینہ طیبہ میں منتقل فرمایا۔

(ج) سورج طلوع ہوتا ہے پھر غروب ہو جاتا ہے۔ غروب کے ساتھ ہی اندھیرا چھا جاتا ہے۔ آپکو ہر دم روشن چراغ کہہ کر بتا دیا یہ نور بجھنے والا نہیں۔ اللہ فرماتا ہے

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ـ	چاہتے ہیں بجھا دیں اللہ کی روشنی اپنے منہ سے اور اللہ کو پوری کرنی ہے اپنی روشنی۔ اگرچہ برا مانیں منکر (الصف)

اگر سراج کی صفت منیر ذکر نہ ہوتی تو یہ ایک طرح کا نقص کلام ہوتا۔ کہنے والے کو موقع ملتا چراغ تو بجھ جاتا ہے لہذا اللہ کا نور بھی ختم ہو جائے گا۔ اس اضافے سے اس وہم کا ازالہ ہو گیا۔

(و) سورج میں آگ کی حدت اور حرارت کی شدت اسکے قریب جانے میں رکاوٹ ہے۔ اس پر نگاہ نہیں ٹھہر سکتی۔ آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں۔ آپ ﷺ آگ کا الاؤ نہیں نور کا چراغ ہیں۔ آپ ﷺ سے استفادے میں کوئی رکاوٹ نہیں۔ آپ ﷺ کا قرب تازہ حیات کی نوید ہے۔ آپ ﷺ کی طرف نظر کرنے سے نگاہوں کو ترقی ملتی ہے۔ آپکے قرب سے بصیرتوں کے در کھلتے ہیں۔ (حقی۔ الاحزاب۔ ۴۶)

(ہ) اسمیں آپکی شریعت کی نورانیت، آپکے دین کی جاذبیت اور آپکی تعلیمات کی بلندی کا اشارہ ہے۔ محمد نورانی چراغ ہیں۔ آپ کا دین اور شریعت اسی نور کی لپٹیں اور شعاعیں ہیں۔ آپکی شریعت آگ کی طرح بھڑکتی ہوئی نہیں نور کی مانند ٹھنڈی اور پر سکون ہے۔ اسمیں جذباتیت نہیں طمانیت ہے۔ آپکی شریعت نور پر مشتمل ہے جو اندھیروں کو چھانٹتی اور بصیرتوں کے در کشادہ کرتی ہے۔ یہ قلب و نظر کی روشنی اور اندھیروں میں نجات کا واحد رستہ ہے۔

استعارة للنور الذی تضمنہ شرعہ استعارۂ نور میں آپکی شریعت بھی داخل ہے (التحریر۔ احزاب ۴۶)

(ز) اللہ نے آپکو بھی اور سورج کو بھی چراغ سے تشبیہ دی۔ سورج چراغ آسمان ہے پیغمبر چراغ جہاں ہے۔ وہ چراغ دنیا ہے آپ ﷺ چراغ دین و دنیا ہیں۔ وہ چراغ منازل فلک ہے آپ ﷺ چراغ محافل ملک ہیں۔ وہ چراغ آب و گل ہے آپ ﷺ چراغ جان و دل ہیں۔ وہ چراغ خواب شب سے بیدار کرتا ہے اس چراغ کے ظہور سے جہاں خواب عدم سے بیدار ہوا۔

(ح) چراغ اہل خانہ کیلئے امن و راحت کا اور چوروں کے لئے شرمندگی و سزا کا سبب ہوتا ہے۔ آپ ﷺ دوستوں کا وسیلہ اور منکروں کے لئے حسرت و ندامت ہیں (حقی)

(ط) یہ آپکی تواضع، عبدیت اور فنائے کامل کا عنوان بھی ہے۔ آگ کی سرشت میں تندی اور تیزی ہے۔ نور کی فطرت میں مٹھاس، ٹھہراؤ اور عجیب سا سکون ہے جو چاند اور سورج کی حالت پر نظر کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ سورج آگ ہے اور چاند کو اللہ نے نورانی بنایا۔ آگ کی ذات میں سرکشی اور انانیت کا دعواں ہے چنانچہ ابلیس نے کہا تھا۔

انا خیر منہ خلقتنی من نار و	میں اس سے بہتر ہوں مجھ کو تو آگ
خلقتہ من طین	سے بنایا اور اسکو مٹی سے

حضرت تھانوی فرماتے ہیں

احقر کے نزدیک چراغ سے تشبیہ دینے میں یہ نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک تو چراغ تک رسائی آسان ہے۔ پھر چراغ سے ہر وقت نور حاصل کرنا ممکن ہے۔ پھر سہل الحصول ہے۔ پھر اس سے نور حاصل کرنے میں اکتساب اور قصد کو بھی دخل ہے۔ پھر صحیح البدن اور صحیح المزاج آدمی کو اس سے ناگواری کسی وقت نہیں پھر اس میں شان انس ہونے کی بھی ہے۔ اور ان سب صفات کو انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کی صفات سے زیادہ مناسبت ہے۔ (بیان القرآن۔ الاحزاب)

یہ چراغ اللہ نے خود روشن کیا۔ کسی بھی واسطے کے بغیر اسے براہ راست منور فرمایا۔ سراج منیر آپ کی فنائے نفس اور عروج و کمال کا عنوان بھی ہے۔ یہ مقام مقام وحدت ہے۔ اس مقام تک کس کی رسائی ہے؟ اس بارے میں علامہ حقی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

انہ علیہ السلام عرج بہ من العالم	حضور علیہ الصلاۃ والسلام اس نور کیساتھ عالم سفلی سے عالم
السفلی الی العالم العلوی ومن الملک	علوی، ملک سے ملکوت اور ملکوت سے مقام جبروت و عظموت
الی الملکوت ومن الملکوت الی	کی طرف بلند ہوئے۔ آپ کا دل عالم بالا سے متعلق ہو گیا
الجبروت والعظموت بجذبة (ادن	قاب قوسین او ادنیٰ کے مقام پر اللہ نے فرمایا میرے
منی) الی مقام (قاب قوسین) وقرب	قریب آؤ۔ یہاں تک کہ آپکے دل کا چراغ کسی بھی فرشتے
(او ادنی) الی ان نور سراج قلبہ بنور	یا نبی کے واسطے کے بغیر اللہ کے نور سے روشن ہوا۔ یہیں
اللہ بلا واسطة ملک او نبی و من ھنا	آپ نے فرمایا میرا اللہ کے ساتھ ایک خاص وقت ہے
قال لی مع اللہ وقت لا یسعنی فیہ	جسمیں میرے ساتھ کسی مقرب فرشتے کی گنجائش ہے نہ نبی
ملک مقرب ولا نبی مرسل لانہ کان	مرسل کی۔ کیونکہ آپ وحدت کے مقام پر ہیں پس اس
فی مقام الوحدة فلا یصل الیہ احد الا	مقام تک وہی پہنچتا ہے جو اپنی ذات کی طرف سے دونوں

على قدمي الفناء عن نفسه والبقاء بربه فناء بالكلية و بقاء بالكلية بحيث لا تبقى نار نور الالهية من حطب وجوده قدر ما يصعد منه دخان نفسي نفسي ومابلغ كمال هذه الرتبة الانبيا عليه السلام فانه من بين سائر الانبياء يقول امتي امتي (الاحزاب-۴۹)

قدموں پر فنا ہو جائے اور اپنے رب کے ساتھ باقی رہ جائے فنا نفس بھی پورے طور سے ہو اور رب کے ساتھ بقا بھی۔ اس حیثیت سے کہ انکے وجود کے ایندھن میں نور الھیہ کی آگ اتنی بھی باقی نہ رہے کہ اس سے نفسی نفسی کا دھواں بلند ہو سکے اس مرتبے تک ہمارے نبی ﷺ کے سوا کوئی نہ پہنچ سکا سو آپ تمام انبیاء کے درمیان (نفسی نفسی کے بجائے) فرمائیں گے امتی امتی

آسان دین والا نبی

مہربان اور شفیق پروردگار کی بارگاہ سے آقائے دو جہاں ﷺ کو بہت سے شرف وکمال عطا ہوئے۔ آسان دین عطا ہونا انہی میں سے ایک شرف اور فضیلت ہے۔ اللہ کو اپنے اس محبوب کیساتھ انتہائی محبت ہے۔ نرم اور آسان دین سے نوازنا اس محبت کی دلیل ہے۔ لوگوں کی تنگی اور مشقت آپ ﷺ پر بھاری پڑتی ہے۔ آپ ﷺ انکے ایمان کے حریص ہیں۔ مومنوں پر مہربان ہیں۔ ان کی جانوں سے زیادہ ان پر شفیق ہیں۔ یہ صفات آپکا خلق ہیں۔ اللہ نے اپنے محبوب میں جو صفات رکھیں انہی کے مناسب شریعت آپکو عطا فرمائی۔ ایسی شریعت جو نرمی اور آسانی والی ہے۔ جس میں کوئی حرج، کوئی ضیق اور کوئی تنگی نہیں۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

ثم ان ذلك يومى الى ان شرعه جاء مناسبا لخلقه فانتفى منه الحرج والعسر

آپکو رؤف ورحیم کہنے میں پھر اس بات کا اشارہ ہے کہ آپکی شریعت آپکی صفات کے مناسب آئی پس حرج اور تنگی اس سے دور ہو گئے (التوبہ-۱۲۸)

اللہ کی اطاعت اور دین میں آسانی

بندوں پر اللہ کی اطاعت اور اس کی تابعداری عقلاً اور شرعاً واجب ہے۔

ان التكليف تشريف من الله للعبد فلما خصكم بهذا التشريف فقد خصكم باعظم التشريفات واختار كم لخدمته والاشتغال بطاعته واى رتبه اعلىٰ من هذا واى سعادة فوق

احکام کا پابند کرنا اللہ کی طرف سے بندوں کو عطا فرمودہ شرف ہے۔ اس شرف کیلئے بندوں کو خاص کرنا تمام فضائل سے بڑھ کر فضیلت ہے اس نے تمہیں اپنی خدمت کے لئے چنا اور اپنی اطاعت کا شغل عطا فرمایا اس سے بڑھ کر

هذا (رازی۔ الحج۔ ۷۸) کونسا رتبہ ہے اور اس سے اوپر کونسی سعادۃ ہے

طاعات اور عبادات کی عملی صورتوں کیلئے بندوں کے پاس اللہ کی خبر کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ اللہ مختار مطلق اور صاحب امر ہے۔ جو چاہے حکم دے۔ وہ سخت ہو یا نرم ہو۔ عسیر ہو یا یسیر ہو۔ اسمیں تنگی ہو یا کشادگی ہو۔ لیکن وہ مخلوق پر مہربان، شفیق اور کریم ہے۔ اس لیے ہم پر احسان فرمایا۔ ہمارے ضعف اور کمزوری پر نظر کی۔ ہمیں نبی وہ عطا فرمایا جو ہم پر مہربان اور شفیق ہے اور ہمارے حالات کی رعایت فرماتے ہوئے دین وہ دیا جو آسان، وسیع اور نرم ہے۔ گزری ہوئی امتوں کو جو شریعتیں ملیں وہ سخت احکام پر مشتمل تھیں۔ کچھ انکی اپنی روش نے احکام میں سختی کو کھینچا۔ ورنہ اللہ کا فرمان ہے۔

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اللہ کسی نفس کو اسکی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا

ابن عاشور اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں

وهذا دليل على عدم وقوع التكليف بما فوق الطاقة فى اديان الله تعالىٰ لعموم نفسا فى سياق النفى لان الله تعالىٰ ماشرع التكليف الا للعمل و استقامة احوال الخلق فلا يكلفهم ما لا يطيقون فعله و ماورد من ذالك فهو من سياق العقوبات هذا حكم عام فى الشرائع كلها۔ (البقرۃ۔ ۲۸۶)

نفسا نکرہ تحت نفی ہے۔ اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ نے تمام دینوں میں کسی کو طاقت سے زیادہ حکم کا پابند نہیں کیا کیونکہ اللہ نے احکام کی پابندی عمل اور مخلوق کے حالات کی درستگی کیلئے مقرر کی۔ پس جو کام وہ نہیں کر سکتے اسکا پابند نہیں کیا۔ اور جو کچھ اس کے بارے میں وارد ہوا وہ سزاؤں کے پیرائے میں ہے تمام شریعتوں میں یہی عام حکم ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا احکام میں سختی کے باوجود کوئی شریعت کسی ایسے حکم پر مشتمل نہ تھی جو بشری طاقت سے بڑھ کر ہو۔

حضور ﷺ کے دین کا امتیاز

آپکی شریعت کا دستور بھی یہی ہے۔ لیکن آپکے دین کی اس سے بڑھ کر ایک اور امتیازی خصوصیت

ہے۔ بشری طاقت کے اندر ہی آپکے لئے احکامات کو بے حد نرم اور سہل کر دیا گیا۔ سابقہ شریعتوں کی سختیاں آپکے لئے ختم کر دی گئیں۔ گذشتہ ملتوں کے بوجھ آپکے لئے اُتار دیے گے۔ پہلی امتوں کے طوق آپکے لئے کھول دیے گے۔ سخت احکام کی جن زنجیروں میں وہ جکڑے ہوئے تھے انہیں کھول کر نرم احکام کی مسندوں پر آپکو بٹھا دیا گیا۔ یہ آپکا اعزاز اور غایت درجہ آپکی تکریم ہے۔ ابن عاشور فرماتے ہیں۔

و امتازت شريعة الاسلام باليسر والرفق۔

اور اسلام آسانی اور نرمی کیساتھ تمام شریعتوں میں ممتاز ہے۔ (بقرہ۔ ۲۸۶)

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں

ودين الاسلام لم يخل عن تلك الاصول وان خالفها فى التفاريع تضييقا وتوسيعا وامتازت هذه الشريعة بتعليل الاحكام وسدا للذرائع والامر بالنظر فى الادلة وبرفع الحرج وبالسماحة و بشدة الاتصال بالفطرة

اور دین اسلام ادیان سابقہ کے ان اصولوں سے خالی نہیں اگرچہ تنگی اور وسعت کی تفریعات میں ان کے خلاف ہے اور اس شریعت کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں احکام کی علتیں بیان کی گئیں ہیں اور گناہوں کے ذرائع کو مسدود کر دیا گیا اور دلائل میں نظر کرنے کا حکم دیا گیا حرج کو اٹھا دیا گیا۔ آسانی کی گئی اور فطرت کے ساتھ اتصال میں شدت برتی گئی۔ (الشوریٰ۔ ۱۳)

حرج اور یُسر کیا ہے؟

رحیم وکریم اور مہربان اللہ نے ہمارے لئے دین میں آسانیاں فرمائیں۔ انتہائی لطف وکرم، بے پناہ شفقت ورحمت اور بے کنار الفت ومحبت کے ساتھ ہم پر اس کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ اللہ تم پر آسانی چاہتا ہے اور تم پر تنگی نہیں چاہتا (بقرہ)

اللہ اکبر ہمارے مالک کو ہمارا کتنا خیال ہے۔ اس جملے میں کتنی مٹھاس، کتنی چاہت اور ہماری لئے کتنی خیر خواہی ہے۔

تفسیر مفاتیح الغیب میں ہے۔

الیسر فی اللغة معناہ السھولة

یسر کا لغوی معنی آسانی ہے۔

تفسیر السعدی میں ہے۔

یرید اللہ ان ییسر علیکم الطرق الموصلة الی رضوانه اعظم تیسیر و یسھلھا اشد تسھیل ولھذا کان جمیع ما امر اللہ به عبادہ فی غایة السھولة فی اصله واذا حصلت بعض العوارض الموجبة لثقله سھله تسھیلا اخرا ما باسقاطه او تخفیفه با نواع التخفیفات (البقرہ۔۱۸۵)

اللہ تم پر وہ راستے بےحد آسان کرنا چاہتا ہے جو اس کی خوشنودی تک پہنچانے والے ہیں۔ انہیں غایت درجے آسان کرتا ہے۔ اسی لئے ہر وہ چیز جس کا اللہ نے بندوں کو حکم کیا ہے دراصل اس میں بہت آسانی ہے۔ ہاں جب کچھ عوارض پیش آ جائیں جو اس حکم میں ثقل کے موجب ہوں تو انہیں دوسری طرح آسان بنا دیا۔ یا تو اسے ساقط کر دیا یا اس میں کئی طرح کی تخفیفات کر دیں

دوسری جگہ فرمایا۔

مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ

اللہ نہیں چاہتا کہ تم پر کوئی تنگی نہ کرے۔

حرج تنگی کو کہتے ہیں اور عسر دشواری کو۔ دین اسلام میں نہ تنگی ہے نہ دشواری بلکہ کشادگی اور آسانی ہے۔ تفسیر البقاعی میں حرج کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا۔

ای ضیق عظما منه بضعفکم فسھل علیکم ماکان عسرہ علی من کان قبلکم و اکراما لکم لا جل نبیکم صلی اللہ علیه وسلم فلم یا مرکم الا بما یسھل علیکم لیقل عاصیکم

حرج یعنی تنگی کو اللہ تمہاری کمزوری کے سبب جانتا ہے۔ پس تم پر وہ سب آسان کر دیا جو تم سے پہلوں پر دشوار تھا اور تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے تمہارا اکرام کیا گیا۔ پس تمہیں وہی حکم دیا جو تم پر آسان ہے تا کہ تم میں گناہ گار کم ہوں۔

مزید فرمایا

مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ۔ تم پر دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی (الحج۔۷۸)

اس بارے میں ابن عاشور فرماتے ہیں

لان ذالك یسھل العمل به مع حصول مقصد الشریعة من العمل فیسعد اھله بسھولة امتثاله

عمل سے شریعت کا مقصد حاصل ہونے کے ساتھ عدم حرج سے عمل آسان بھی ہو جاتا ہے پس تابعداری میں سہولت کے سبب اس کا کرنے والا خوش بخت ہے۔ (الحج۔۷۸)

تخفیف : اور فرمایا

يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا

اللہ چاہتا ہے کہ تم سے بوجھ ہلکا کرے اور انسان کمزور بنا ہے۔

ابن عاشور فرماتے ہیں۔ اس میں یاددہانی ہے کہ

ان اللہ لا یزال مراعیا رفقه بھذہ الامة وارادته بھا الیسر دون العسر اشارہ الی ان ھذا الدین یبین حفظ المصالح ودرء المفاسد فی ایسر کیفیة وارفقھا (النساء۔۲۸)

بیشک اللہ اس امت کے ساتھ ہمیشہ اپنی نرمی کی رعایت کرتا رہے گا اور اس کا اس امت کے ساتھ دشواری کی بجائے آسانی کا ارادہ رکھنا اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ یہ دین زیادہ آسان اور نرم انداز میں مصلحتوں کی حفاظت اور مفاسد کے ازالے کو بیان کرتا ہے

ایمان والوں کو اللہ نے یہ دعا سکھلائی۔

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ

اے ہمارے رب اور نہ رکھ ہم پر بوجھ بھاری جیسا رکھا تھا ہم سے اگلے لوگوں پر۔ اے ہمارے رب اور نہ اٹھوا ہم سے وہ بوجھ جس کی ہم کو طاقت نہیں۔ (البقرہ۔۲۸۶)

مفسر عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں

ای لا تکلفنا من الا عمال الشاقة وان اطقنا ھا کما شرعته للامم الماضیة قبلنا من الاغلال والاصار التی کانت

یعنی ہمیں دشواری اعمال کا پابند نہ کر اگرچہ ہم ان کی طاقت بھی رکھتے ہوں۔ ان اعمال کی طرح جنہیں تو نے ہم سے پہلے گزری امتوں پر مقرر

علیھم التی بعث نبیك محمدا صلی الله علیه وسلم نبی الرحمة بوضعه فی شرعه الذی ارسلته به من الدین الحنیف السهل السمح (البقرة۔۲۸۶)	کیا۔ مثلاً طوق اور بوجھ جو ان پر تھے۔ جنہیں اتارنے کیلئے تو نے اپنے رحمت والے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا۔ انہیں وہ شریعت عطا فرمائی جو یکسو، آسان، نرم دین میں سے ہے۔

یہ دین کی سہولت و آسانی پر اصولی کلام تھا۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے پرانے ادیان کی کچھ دشواریاں اور شریعت اسلام کی کچھ آسانیاں بطور مثال بیان کردی جائیں تا کہ یہ اس مضمون کا تتمہ ہو جائے۔ قاری پر بات واضح ہو جائے اور وہ عقل کی نگاہوں سے رسول ﷺ کے سبب خود پر ہونے والے اللہ کے احسان کا مشاہدہ کرلے

آسانی کی چند جزئیات

(۱) امم سابقہ کے دین کی حفاظت خود ان کی ذمہ داری تھی۔ نتیجہ یہ نکلا قوموں کی قومیں جادۂ حق سے منحرف ہو گئیں۔ آپ ﷺ جو دین لائے اس کی حفاظت خود اللہ نے اپنے ذمہ لی۔ ہمیں اس ذمہ داری سے بری فرما دیا۔

(۲) دین محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے قومیں احبار و رہبان کے ہاتھوں میں کھلونا بن گئیں اور دین کے نام پر وہ انہیں سخت احکام میں ڈالتے رہے۔ اس امت میں دین کی اساس محفوظ رہنے کی وجہ سے ایسا ممکن نہیں ہے۔

(۳) ان قوموں کو احکامات دفعۃً ملے۔ ہمیں اپنے اوامر سے تدریجاً آگہی بخشی۔

(۴) ہمارے لئے دین کو کامل فرمایا اور ہر چیز کے متعلق اصولی اور جزوی ہدایات دیں تا کہ عقل و شیطان کو بہکاوے میں آ کر گمراہ نہ ہو سکیں۔ گذشتہ امتوں کے دین بھی اگرچہ کامل تھے لیکن وہ کمال مخصوص زمانہ تک تھا اور اس کی حفاظت کا وعدہ بھی نہ تھا۔ اس دین کا کمال قیامت تک کیلئے ہے۔ کمال کی ایک فرع اور تیسیر کا ایک پہلو اجتہاد بھی ہے۔ جس وہ محروم تھیں۔

(۵) اپنے کلام کا پڑھنا، سمجھنا یاد کرنا آسان فرما دیا۔ گذشتہ کتابوں کا کوئی حافظ نہیں

(۶) اہل کتاب نے دین میں غلو اور زیادتی سے کام لیا۔ غلو تنگی اور دشواری کو لاتا ہے۔ انہوں نے

عقائد و اعمال میں غلو کیا مثلاً پیغمبروں کو اللہ کا بیٹا کہا۔ رہبانیت کو اختیار کیا وغیرہ۔ ہمارے لئے ہر فرد کا حق اور ہر حکم کی حد مقرر فرما کر غلو کا سد باب فرما دیا۔ امیر مامور، آقا غلام، والدین اولاد، میاں بیوی، بڑا چھوٹا، احباب اقارب، پڑوسی، فقراء مساکین، یتامیٰ، استاد شاگرد، مسلم کافر، حربی ذمی ہر ایک کے حقوق فرائض مقرر کئے اور ہر ایک کا درجہ متعین کر دیا یہاں تک کہ جانوروں اور پرندوں تک کے حقوق بتائے

(۷) کلیسا اور صوامع کے علاوہ اہل کتاب کہیں عبادت نہ کر سکتے۔ ہمارے لئے ہر پاک زمین کو جائے عبادت قرار دے دیا۔

(۸) بنی اسرائیلیوں سے کوئی گناہ ہوتا تو گنہگار کے دروازے پر لکھا جاتا۔ یوں اس کی پردہ دری ہوتی۔ ہمارے لئے یہ آسانی ہوئی کہ دنیا میں بھی غفران کا معاملہ فرمایا اور آخرت میں بھی ستاری فرمائے گا۔ تفسیر الدر المنثور میں ہے

کانت بنو اسرائیل اذا اصاب احد هم الخطیئة وجد ها مکتوبة علی بابه وکفا رتها فان کفرها کانت له خزیا فی الدنیا وان لم یکفر ها کانت له خزیا فی الاخرة	بنی اسرائیل میں جب کوئی گناہ کرتا تو گناہ اور اس کا کفارہ دروازے پر لکھا ہوا پاتا۔ اگر کفارہ دیتا تو دنیا کی رسوائی ہوتی اور کفارہ نہ دیا تو آخرت کی رسوائی ہوگی۔ (البقرہ۔۱۰۵)

(۹) کفارے کے طور پر انہیں کبھی اس عضو کو کاٹنے کا حکم بھی دیا جاتا جس سے گناہ سرزد ہوا۔ ہمارے لئے عزم قلب کے ساتھ زبانی توبہ کو کافی قرار دیا۔ بنی اسرائیل نے شرک کیا تو توبہ کی یہ صورت تجویز کی گئی کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو۔ ہمیں فرمایا۔

مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا	جس نے کوئی برا کام کیا یا اپنی جان پر ظلم کیا پھر اللہ سے مغفرت مانگی تو اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔

(۱۰) بدن یا کپڑے کے جس حصے پر نجاست لگ جاتی اسے کاٹنے کا حکم تھا۔ ناپاک چیز مثلاً لاش، حرام یا مردہ جانور کو چھونے سے پاک آدمی بھی ناپاک ہو جاتا۔ غسل کے باوجود ایک سے سات دن ناپاک رہتا۔ ناپاک آدمی کو چھونے والا بھی ناپاک ہوتا۔ حائضہ، مستحاضہ اور جریان کے مریض

کپڑوں سمیت ناپاک ہوتے اور انہیں چھونے والے بھی۔ مٹی کے ناپاک برتنوں کو پاک کرنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ہمارے لئے یہ آسانی فرمائی کہ حکمی نجاستوں کو متعدی نہ فرمایا۔ اور ناپاک کو پاک کرنے کیلئے تین بار دھونا کافی قرار دیا۔

(۱۱) پہلی امتوں میں قربانی قبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ آسمان سے آگ اتر کر اس کو جلا دیتی تھی۔ وہ قربانی قابل استعمال نہ رہتی اور جس کی قربانی قبول نہ ہوتی اسے رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا۔ بنی اسرائیل کیلئے کچھ قربانیوں میں جانور ذبح کے بعد جلانے ضروری تھے۔ کچھ ذبیحے کھانے کی اجازت تھی لیکن دو دن سے زیادہ ذخیرہ نہ کر سکتے۔ ہمارے لئے اس میں بھی آسانی کا معاملہ فرمایا۔

(۱۲) غنیمتیں ان کے لئے حلال نہ تھیں بلکہ انہیں بھی جلانے کا حکم تھا۔ ہمارے لئے اس میں بھی آسانی فرمائی۔ اور غنائم کو ہمارے لئے حلال فرمایا۔

(۱۳) اگر کوئی شخص کسی کو قتل کر دیتا یا دوسرے کسی عضو کو نقصان پہنچاتا تو ان کے لئے دو ہی صورتیں تھیں۔ قاتل اور جانی سے قصاص لیا جائے یا اسے معاف کر دیا جائے۔ ہمارے لئے آسانی کرتے ہوئے تیسری صورت دیت کی مقرر فرمائی اور فرمایا۔

ذٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ یہ آسانی ہوئی تمہارے رب کی طرف سے اور مہربانی

تفسیر قرطبی میں ہے

لان اهل التوراة كان لهم القتل ولم يكن	کیونکہ اسرائیلیوں کے لئے قتل کے بدلے قتل
لهم غير ذالك اهل الانجيل كان لهم	ہی متعین تھا اور عیسائیوں کے لئے معافی ہی
العفو ولم يكن لهم قود ولا دية	متعین تھی نہ بدلہ نہ دیت (البقرۃ۔۱۷۸)

(۱۴) ہفتے کے دن کی تعظیم کا خاص حکم تھا۔ اس دن عبادت کے سوا کوئی کام کرنا ممنوع تھا۔ ہمارے لئے جمعہ کا دن مقرر فرمایا۔ اور صرف اذان جمعہ سے نماز جمعہ تک خرید فروخت ترک کرنے کی پابندی عائد کی۔

(۱۵) ظلم نفس کی پاداش میں کئی قوموں پر یا تو پتھراؤ ہوا، یا زبردست چنگھاڑ نے پکڑا، یا ان کو زمین

میں دھنسا دیا گیا، یا غرق کر دیا گیا۔ ہفتے کی تقدیس کا لحاظ نہ کرنے پر بنی اسرائیل کے چہرے بگاڑ دیئے گئے۔ ہمارے ساتھ آسانی کرتے ہوئے ایسے تمام عذابوں سے ہمیں مامون فرمایا۔

(۱۶) کئی حلال چیزیں یہودیوں کی زیادتی کے سبب ان پر حرام ہوئیں۔ ابن عاشور کہتے ہیں

ان تحريم ما حرم عليهم انما كان	بیشک پاکیزہ چیزیں ان پر بطور سزا حرام
عقابا لهم وان تلك المحرمات	ہوئیں اور ان حرام کردہ چیزوں میں یقیناً
ليس منها من المفاسد ما يقتضي	وہ مفاسد نہ تھے جو انہیں استعمال کی حرمت
تحريم تناولها (النساء۔۱۶۰)	کو نافذ کرتے۔

اس کے برعکس حضور ﷺ نے ہمارے ان چیزوں کو حلال ٹھہرایا جو طیب تھیں لیکن پہلی شریعتوں میں بطور سزا انہیں حرام قرار دیا گیا تھا۔ اور کئی چیزوں کو ان کی خباثت کی وجہ سے حرام ٹھہرایا۔

واما التحريم الذي على هذه الامة فانه	اور رہا اس امت پر حرام کرنا سو یہ تحریم ان کو خباثتوں
تحريم تنزيه لهم عن الخبائث التي تضر	سے بچانے کیلئے ہے۔ جو ان کے دین اور دنیا کو
هم في دينهم و دنياهم	نقصان دیتی ہیں (اسعدی۔النساء۔۱۶۰)

۱۷) اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے عیسائیوں نے رہبانیت ایجاد کی۔ اس میں انہوں نے حد اعتدال سے تجاوز کیا۔ من مارنے کے چکر میں انسانی طبیعت و جبلت کا لحاظ نہ کیا۔ نفس کے فطری حقوق ادا نہ کیے۔ جس کا نتیجہ نا قابل برداشت بوجھ اور نا قابل نباہ عہد کی صورت میں نکلا۔ ترک دنیا کا نتیجہ ترک حقوق کی صورت میں سامنے آیا۔ ہمیں برطابق فطرت عقائد و اعمال عطا کیے گئے۔ ہمیں آرائش زینت کا امر کیا اور ترک دنیا سے روکا۔ ہمارے لئے ہر فرد بلکہ ہمارے جسم کے حقوق بیان فرمائے اور ہمیں ان کی ادائیگی کا پابند کیا۔

(۱۸) اہل کتاب پر دین میں سختیاں کی گئیں۔ ان پر طوق اور بوجھ لاد دیے گئے۔ پختہ وعدے اور میثاق لئے گئے۔ حضور ﷺ کی خاطر آپکی امت پر آسانیاں کی گئیں۔ ان پر 50 نمازیں فرض تھیں۔ ہم پر پانچ فرض کی گئیں۔ انہیں اپنے مال کا چوتھا حصہ دینے کا حکم تھا۔ ہمارے لئے چالیسواں حصہ مقرر کیا گیا۔ ہمارے لئے سال میں صرف ایک مہینے کے روزے فرض کئے

گئے۔ وہ بھی صبح سے شام تک۔ ان کے لئے پابندی تھی رات سونے سے پہلے کچھ کھا لیا تو کھا لیا ورنہ سونے کے بعد سے اگلے دن افطار تک کچھ کھانے کی اجازت نہیں۔

(۱۹) آسان اعمال میں بھی طرح طرح کی آسانیاں پیدا فرمائیں۔ نماز میں قیام سے عاجز ہو تو بیٹھ جاؤ۔ سفر میں دشواری ہو تو روزہ قضا کر لو۔ بالکل ہی عاجز ہو تو فدیہ دے دو۔ کفارہ لازم آیا تو اس کی بھی تین صورتیں پیش فرما دیں۔ نصاب سے کم پر زکوٰۃ فرض نہ کی۔ نصاب پر بھی سال بھر کی مہلت دیدی۔ حج زندگی میں ایک بار فرض کیا اور اس کیلئے بھی استطاعت کی قید لگا دی۔ ہر نماز کیلئے بجائے وضو کے غسل کا حکم نہ دیا۔ وضو میں بھی چار اعضاء دھونے فرض قرار دیے۔ بیماری، سفر یا پانی کی عدم دستیابی کی صورت میں تیمم کو غسل اور وضو کے قائم مقام بنا دیا۔ ابن عاشور نے کیا خوب فرمایا

ولو اراد اللہ الحرج لکلفھم طلب	اگر اللہ حرج کا ارادہ کرتا تو قیمتاً پانی حاصل کرنے
الماء ولو بالثمن او ترک الصلوۃ الی	کا پابند بنا دیتا یا مکلف کر دیتا کہ پانی ملنے تک نماز
ان یوجد الماء ثم یقضون الجمیع	چھوڑ دو پھر سب کی اکٹھی قضا کرنا (المائدہ۔ ۷)

(۱۹) صرف رخصتیں ہی نہ دیں ان پر عمل کرنے کو بھی پسند فرمایا۔ یہاں تک رخصت عطا فرمائی کہ حالت اکراہ و جبر میں کلمہ کفر کہنے کی خود اجازت دی اور مواخذہ سے بری فرمایا۔ بشرطیکہ دل ایمان پر مطمئن ہو۔

(۲۰) اضطراری حالت میں محرمات کو نہ صرف حلال کیا بلکہ ان کا استعمال لازم کر دیا۔

(۲۱) ہر گناہ کیلئے توبہ کا دروازہ کھلا رکھا۔ قلبی ندامت اور آئندہ نہ کرنے کے عزم کو توبہ کیلئے کافی قرار دیا۔ کچھ میں قضا فوائت یا کفارات کی شرط لگائی۔ تفسیر بغوی میں ہے۔

ان المومن لا یبتلی بشیء من الذنوب	بیشک مومن جس گناہ میں مبتلا ہو جائے اللہ نے
الا جعل اللہ لہ منہ مخرجا بعضھا برد	اس کیلئے اس سے نکلنے کا راستہ بنا دیا کچھ میں توبہ
المظالم والقصاص وبعضھا بانواع	کے ساتھ کچھ میں رد مظالم اور قصاص کے ساتھ اور
الکفارات فلیس فی دین الاسلام ذنب	کچھ میں کئی طرح کے کفارات کے ساتھ۔ پس

الا یجد العبد سبیلا الی الخلاص من	دین اسلام میں کوئی گناہ ایسا نہیں کہ بندے کو
العقاب فیہ	اس کی سزا سے خلاصی کا راستہ نہ ملے۔ (الحج۔ ۷۸)

(۲۲) بعض جرائم کیلئے حدود مقرر فرمائیں اور ذرا ذرا شبہات پر انہیں ساقط بھی فرما دیا۔ جس فعل کی سخت سزا مقرر کی اس کا ثبوت بھی اتنا مشکل بنا دیا۔

(۲۳) آسانی پیدا کرنے کیلئے کہیں کہیں امر یا نہی کی علت بھی بیان فرما دی۔ مثلاً فرمایا
يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ آپ سے حیض کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ قُلْ آپ کہیے۔ هُوَ اَذًى وہ بیماری ہے۔ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ پس ایام حیض میں عورتوں سے دور رہو۔ حد ہے اس آسانی کی۔ هُوَ اَذًى کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو آمر ہے۔ اس کا کام تو حکم دینا ہے علت بیان کرنا نہیں۔ یوں بھی کہا جا سکتا تھا۔ قل اعتزلوا النساء فی المحیض آپ کہیں حالت حیض میں عورتوں سے دور رہو۔ اور کلام بھی ٹھیک ہوتا۔ کیونکہ سائلین نے ماہیت کا نہیں حکم کا سوال کیا تھا۔ لیکن بات وہی ہے کہ وہ ہمارے لئے تنگی نہیں آسانی چاہتا ہے۔

(۲۴) حائضہ عورت کے لئے آسانی کی اور ان ایام کی نمازوں کو معاف کر دیا

(۲۵) ہمارے جذبات کی رعایت فرمائی۔ مصیبت پر دکھ اور اس کی شدت سے آنکھوں کا بہنا فطری امر ہے۔ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ الخ میں ہمارے جذبات کو تسلی دی۔ اظہار غم کی ممانعت یا رونے کی مخالفت بھی نہیں فرمائی۔ غصہ انسان کی سرشت میں ہے اس سے منع نہیں فرمایا۔ ایک جگہ غصہ جاری کرنے سے روکا اور دوسری جگہ اجرا کا محل بھی بتا دیا۔ جہاد کرو تا کہ

يُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ نکالے ان (مومنوں) کے دل کا غصہ

اس سے یہ بھی معلوم ہوا غصہ جاری کرنے کا موقع وہ ہے جہاں اللہ کی نافرمانی ہوتی ہو

(۲۶) عقائد، عبادات اور اخلاق کی طرح معاملات، معاشرات، سیاسیات، معاشیات اور عائلی ملکی اور بین الاقوامی قوانین میں بھی ہر طرح کی آسانی فرمائی۔ دھوکہ، اذیت، ظلم، منافقت اور استحصال کی جڑ کاٹ دی۔ ہر طرح کی طبقاتی تفریق کو پاٹ دیا۔ بندگی کو برتری کا معیار قرار دیا کہیں کسی موقع پر ہمیں صرف ہماری عقل کے حوالے نہ کیا۔ زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ایک جا

ملا جامع مانع بنیادی نظام خود بتایا۔ تبیین رسول اللہ ﷺ کے ذمے لگائی اور حالات کے بدلنے سے استنباط کا حق دین کے ماہرین مجتہدین کو دیا۔

اس بارے میں تفصیلات کئی کتابوں کا تقاضہ کرتی ہیں۔ عنوان کی مناسبت سے کچھ باتیں اس لئے لکھ دی ہیں تا کہ عنوان پر ایک سیر حاصل بحث ہو جائے۔

نوازشات کا سبب:

یہاں یہ خیال کرنا بھی ضروری ہے کہ ہم پر اتنی نوازشات کا سبب کیا ہے؟ کیا ہماری کوئی ذاتی خصوصیت ہے؟ کیا ہمارا اللہ سے کوئی ایسا خاص تعلق ہے جو پچھلی قوموں کا نہیں تھا؟ جواب یہ ہے کہ یہ عنایتیں بے سبب اور یہ نوازشیں بلا وجہ نہیں لیکن ان کی علت ہماری ذاتی خصوصیت ہے نہ کوئی خاص تعلق۔ ہم تو گزشتہ قوموں سے وقت اور قوت میں بہت کم ہیں۔ ان عنایتوں کا سبب اور ان نوازشوں کی وجہ صرف اور صرف ایک ہے اور وہ ہیں محمد رسول اللہ ﷺ۔ آسان کشادہ اور وسیع دین عطا کرنا آپ کا اعزاز آپ کی تکریم آپ کی خاطر داری اور آپ سے محبت کا اظہار ہے۔

رحمة للعالمین ﷺ

اللہ جو رحمن و رحیم ہے۔ بے پایاں رحمت کا مالک ہے کوئی اسکی ربوبیت سے مستثنیٰ نہیں اپنے پرائے، نیک و بد، خاص و عام، جلیل و حقیر، غنی و فقیر، انس و جن، حور و ملک، زمین و فلک، طیور و وحوش سب اسی کے خوان یغما سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ہر ایک میں اس رحمت کا عکس اور سب پر اسی مہربانی کا پر تو ہے۔ وہی تو ہے جس نے دلوں میں باہم الفت پیدا کی۔ ماں میں ممتا انڈیلی۔ باپ میں شفقت رکھی۔ حیوانوں کی محبت اور جانوروں کی وفاداری اسی رحمت کی کرشمہ سازی ہے۔ وہی ایک ہے جو ہر ایک سے رحمت و کرم کا برتاؤ کرتا ہے اور کسی پر ادھوری مہربانی نہیں کرتا۔

حتمی مرتبت رحمة للعالمین ﷺ پر کمال مہربانی فرمائی۔ آپ پر اللہ کی نوازشات موج بن فوقہ موج کا مصداق ہیں۔ تہہ بر تہہ آپ کے کثیر محاسن کیلئے ذخیرۂ الفاظ ناکافی ہو جاتا ہے۔ لغت تنگ دامنی کا شکوہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ لفظ کمال پستہ قد دکھائی دیتا ہے۔ قرآن سے آپ کے اوصاف کا جو تصور ملتا ہے گفت و نوشت اسے محدود کر دیتے ہیں۔ احساس کے لمس سے بس اسے محسوس ہی کیا جاسکتا ہے۔ خیالات کے سمندر میں ادراک کمال کی موجیں بپھر کر اٹھتی ہیں اور الفاظ کے ساحل سے ٹکرا کر پایاب ہو جاتی ہیں۔ بر کنار ساحل ادب کے مضبوط پشتے سدراہ بن کے کھڑے ہوتے ہیں کہیں اس منبع محاسن سے وہ لفظ منسوب نہ ہو جائیں جو اسکی شان سے فروتر ہوں۔ احساس کی ڈالی پر معانی کے ان گنت شگوفے پھوٹتے ہیں۔ بیان کی درماندگی آڑے آتی ہے۔ اور کھلنے کے لئے انہیں نطق و کلام کا مناسب لباس نہیں ملتا کہ کہیں یہ اظہار اس مجموعہ اوصاف کو سزاوار نہ ہو۔

حضور علیہ الصلاۃ والسلام کا رحمة للعالمین ہونا انہی کمالات میں سے ایک عالی شان کمال ہے۔ اللہ

نے آپ پر رحمت کے موتی لٹائے۔ آپکو سراپا مہر وکرم اور پیکر رافت ورحمت بنایا۔ آپ پر ازلی رحمتوں کی چھایا اور ابدی مہربانیوں کا سایہ رکھا۔ رحمت کا مظہر اتم اور عنایتوں نوازشوں کا مورد بنایا۔ آپکی فطرت میں رحم وکرم کی مہک رچائی اور سرشت کو جودوعطا کا بہاؤ دیا۔ آپکی ذات میں رحمت سورج میں روشنی اور شہد میں مٹھاس کی طرح گوندھی۔ دل کا گداز آپکے وجود اطہر میں بوئے گل وبرگ گل کی طرح بسا دیا۔

حسن فطرت اور بے بہا رحمت کے امتزاج نے آپکو وہ چشمہ صافی بنا دیا جس سے رشد وہدایت، لطف وکرم، فضل واحسان، داد ودہش، بندہ پروری اور ذرہ نوازی کے سوتے پھوٹتے اور عالمین کو سیراب کرتے ہیں۔ آپکی رحمتیں ابر بہار بن کے برس رہی ہیں۔ گلاب کی طرح کھل کر خوشبو کی مانند پھیل رہی ہیں۔ مہر گیتی افروز کی طرح چمک رہی ہیں تھمنا انکا نصیب نہیں۔ زوال انکا مقدر نہیں۔ غروب انکی قسمت نہیں۔

ذکر رحمت:

آپ پر لطف وکرم کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعَالَمِينَ	اور تجھ کو جو ہم نے بھیجا سو مہربانی کرنے کیلئے جہان کے لوگوں پر (الانبیاء۔۱۰۷)

چوبیس حرفوں پر مشتمل اس آیت میں رسول کا ذکر ہے۔ رسالت کا بیان ہے۔ بھیجنے والے کا تذکرہ ہے۔ جنکی طرف بھیجا گیا ہے انکا اظہار ہے۔ ان چاروں کے اوصاف بتائے گئے۔ عموم احوال کا فائدہ اس پر مستزاد ہے۔ جنکی طرف بھیجا انکا احاطہ کرتی ہے۔ اسمیں حصر کی خصوصیت ہے۔ تعظیم کیلئے رحمت کو نکرہ ذکر کیا گیا۔

اذلا مقتضی لا یثار التنکیر فی هذا المقام غیر ارادة التعظیم	کیونکہ اس جگہ تنکیر کو ترجیح دینے کا مقصد تعظیم کے سوا کچھ نہیں (ابن عاشور۔۱۰۷)

پس یہ آیت محمد ﷺ کی بعثت اور تمام شریعتوں پر اسکی عمومی اور دوامی خوبی کے لحاظ سے ایک جامع وصف پر مشتمل ہے۔ اور وہ آپکا رحمۃ للعالمین ہونا ہے۔

عالمین سے کچھ مفسرین نے مومنین مراد لئے۔ کچھ نے جن وانس اور کچھ نے فرشتوں کو بھی شمار کیا۔ علامہ آلوسیؒ عالمین کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

وقیل المراد بالعالمین جمیع الخلق فان العالم ماسوی الله تعالی وصفاته جل شانه	اور کہا گیا عالمین سے مراد تمام مخلوق ہے سو بے شک اللہ تعالی اور انکی صفات کے سوا ہر چیز عالم ہے

نحوی لحاظ سے یہاں رحمت مفعول لہٗ ہے۔ یا حال ہے۔ اسکا فاعل خود خدا ہے یا مصطفیٰ ہے۔ مصدر ذکر کرنا اور حال ہونا مبالغے کی دلیل ہے۔

اللباب میں ابن عادل فرماتے ہیں۔

یجوزان ینتصب رحمة مفعولا له ای لاجل الرحمة ویجوزان ینتصب علی الحال مبالغة فی ان جعله نفس الرحمة۔	جائز ہے کہ رحمت کا مفتوح ہونا مفعول لہ ہونے کیلئے ہو یعنی آپکو رحمت کرنے کیلئے بھیجا اور یہ بھی جائز ہے کہ نصب مبالغے کے طور پر حال کے لئے ہو آپکو سراپا رحمت بنا کر بھیجا (الانبیاء۔۱۰۷)

ہر چار صورتوں میں مندرجہ ذیل مفاہیم حاصل ہوتے ہیں

۱۔ رحمت للعالمین ﷺ سارے جہاں کے لئے اللہ کی رحمت کا سبب ہیں۔

۲۔ اللہ نے آپکو مبعوث فرمایا تا کہ آپ سارے جہاں پر رحم فرمائیں۔

۳۔ کاف سے حال ہو تو مفہوم ہے آپکو سراسر رحمت بنا کر بھیجا۔

۴۔ نون سے حال تو مفہوم ہے آپکو بھیجنا ہماری رحمت ہے۔

زیادہ تر مفسرین نے کاف سے حال مراد لیا ہے۔ اور آپکی شان بھی مناسب بھی یہی ہے۔ اس صورت میں بقیہ مفاہیم اسی کے ارد گرد گھومتے اور اسی میں دائر رہتے ہیں۔ کیونکہ حقیقی فاعل تو اللہ ہی ہے۔ اصل رحمت اسی کی ہے۔ آپکو سراپا رحمت بنانا اور بھیجنا مال کار اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے۔ مجسمہ رحمت ہونا خود سبب رحمت ہونے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے آپ رحمت کا پیکر اور اللہ کی مہربانی کا سبب ہیں۔

رحمت کیا ہے؟

عالمین کے لئے سراپا رحم ہونے میں آپکی شانیں کیا ہیں۔ اس پر گفتگو سے پہلے رحمت کی وضاحت ضروری ہے۔

رحمت فضل واحسان، جود وعطا، شفقت ومحبت، نفع رسانی اور بندہ پروری کا وہ آمیختہ ہے جس کی نمو دل کے گداز سے ہوتی ہے۔ ابن عاشور کہتے ہیں

واسم الرحمة موضوع فی اللغة   رحمت اسم ہے جو عربی لغت میں دل کے گداز
العربیة لرقة الخاطر و العطافه   اور نفس کے میلان کیلئے وضع کیا گیا (تسیہ)

گداز قلبی کا نتیجہ ہمدردی، خدا ترسی، لطف واحسان، خیر وبھلائی پہنچانے اور ضرر ونقصان دور کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

بعض علما کے نزدیک رحمت صرف بھلا کرنے اور نقصان سے بچانے کا نام ہے کیونکہ انسان

قد یدفع الشر عمن لا یرق علیه و   کبھی ایسے شخص سے شر کو دور کرتا اور ایسے کو خیر پہنچاتا
یوصل الخیر الی من لا یرق علیه   ہے جسکے لئے اسکے دل میں نرمی نہیں ہوتی

(البحر المحیط۔ تسمیہ)

امام رازی فرماتے ہیں۔

ان الرحمة عبارة عن التخلیص من انواع الافات   رحمت مختلف آفات سے بچانے اور ضرورت
وعن ایصال الخیرات الی اصحاب الحاجات   مندوں کو خیر پہنچانے کا نام ہے (فاتحہ)

جب یہ بلا معاوضہ ہو تو اسی کا نام نعمت واحسان ہے۔ اپنے بندوں پر اللہ کی تمام تر رحمت انعام و احسان ہی ہے۔ کیونکہ اسکی ذات عالی رقت قلبی سے پاک ہے۔

اسی کو امام ماوردی نے فرمایا۔

والرحمة هی النعمة علی المحتاج   محتاج پر رحمت ہی نعمت ہے (تفسیر ماوردی۔ فاتحہ)

اس بحث کا خلاصہ ابوالکلام کے الفاظ میں یوں ہے۔

عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقت اور نرمی کو کہتے ہیں جس سے کسی دوسری ہستی

کے لئے احسان وشفقت کا ارادہ جوش میں آجائے۔ پس رحمت میں محبت، شفقت، فضل، احسان سب کا مفہوم داخل ہے۔ اور (رحمت) مجرد محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع اور حاوی ہے۔ (ترجمان القرآن۔ فاتحہ ۲)

اب اس رحمت کی بوقلمونی اور رنگارنگی ملاحظہ فرمائیں جو اللہ نے رحمت دو عالم ﷺ کو عطا فرمائی۔

۱۔ وسیع الرحمت:

حضور علیہ الصلاۃ والسلام انتہائی وسیع رحمت کے مالک ہیں۔ آپکی رحمت تمام زمانوں کو محیط اور عالمین کا احاطہ کرتی ہے۔ اس کے سائے مومن وکافر، انس وجن حیاتات وجمادات سے بڑھ کر اعراض وصفات تک پھیلے ہوئے ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ عالمین کے لئے رحمت ہیں اور اللہ کی ذات و صفات کے علاوہ ہر شئے عالمین میں داخل ہے۔ آپ ﷺ ذاتی طور پر وسیع الرحمت ہونے کیساتھ عالمین پر اللہ کی وسیع رحمتوں کا سبب بھی ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ مقصود کائنات ہیں۔ اس جہان کی تخلیق ہی آپ کی خاطر ہوئی۔ ہر لحظہ مخلوق پر اللہ کی رحمتوں کا جو مینہ برس رہا ہے۔ ہر آن اسکی عنایات کا جو سلسلہ جاری ہے۔ آپکی ذات فخر موجودات ان تمام مہربانیوں کا واسطہ اور وسیلہ ہے۔ آپکی مہربانی بے بہا اور رحمت بے پناہ ہے۔ وفور رحمت کا تذکرہ کرتے ہوئے علامہ شبیر احمد عثمانی یوں فرماتے ہیں۔

رحمۃ للعالمین کا حلقہ فیض، اسقدر وسیع ہے کہ جو محروم القسمت مستفید ہونا نہ چاہے اسکو بھی کسی نہ کسی درجے میں بے اختیار رحمت کا حصہ پہنچ جاتا ہے۔ (تفسیر عثمانی۔ ۱۰۷)

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں۔

هو عام فی حق من امن   مومن اور غیر مومن دونوں کے حق میں
ومن لم یومن   رحمت عام ہے۔ (بغوی۔ الانبیاء۔ ۱۰۷)

مفسر اسماعیل حقی فرماتے ہیں

قال بعض الکبار وما ارسلناک الا   کچھ بزرگوں نے ارشاد فرمایا ہے۔ اور اے محمد
رحمة مطلقه تامة کاملة عامة شاملة   آپ کو عالمین کے لئے ایسی رحمت بنا کر بھیجا جو

جامعة محيطة بجميع المقيدات من الرحمة الغيبية والشهادة العلمية والعينية والوجودية والشهودية والسابقة واللاحقة وغير ذالك للعالمين	مطلق ہے تام ہے کامل ہے عام ہے شامل ہے جامع ہے۔ نیز غیبی رحمت علمی عینی وجود شہودی سابق ولاحق شہادت اور انکے علاوہ تمام مقیدات کا احاطہ کرنے والی ہے (الانبیاء۔۱۰۷)

آپ ﷺ کی رحمت عام بھی ہے خاص بھی ہے۔ اس آیت میں عموم رحمت کا تذکرہ ہے۔ اور بالمومنین رؤف رحیم میں خصوصی رحمت کا بیان ہے۔ عام رحمت سب کے لئے ہے اور خاص رحمت مومنوں کے لئے ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں آپ ﷺ دین و دنیا میں رحمت ہیں اور کیوں نہ ہوں آپ کی رحمت نے ہر گوشے کو مہکایا اور ہر ذرے کو منور کیا اور تمام عالم پر براہ راست یا بلا واسطہ اپنا اثر ڈالا۔ آپ کی رحمت میں وسعت کیوں نہ ہو کہ جس نے آپ کو رحمت کا سراپا دیا اس کی مہربانیوں کا کوئی کنارا نہیں۔ حدیث میں آتا ہے

ان لله مائة رحمة وانه انزل منها رحمة واحدة الى الارض فقسمها بين خلقه فيها يتعاطفون وبها يتراحمون واخر تسعا وتسعين لنفسه يرحم بها عباده يوم القيمة	بے شک اللہ کی سو رحمتیں ہیں ان میں سے ایک زمین پر اتاری اور مخلوق میں تقسیم کی ہے۔ یہی ان کے باہمی میلان ورحم کا سبب ہے۔ اور ننانوے رحمتیں اپنی ذات کیلئے ذخیرہ کیں روز قیامت جن کے ساتھ بندوں پر رحم فرمائے گا۔ (الصابوری۔ تیسیر)

اس ذات پر قربان جاؤں جس نے میرے حضور ﷺ کو ان سو رحمتوں کا جامع بنا دیا۔ آج عالم دنیا کی ایک رحمت کا سبب آپ ہیں تو کل عالم آخرت میں ننانوے رحمتوں کا واسطہ بھی آپکی مبارک ذات ہوگی۔ اس سے برتر شرف اور کیا ہو سکتا ہے کہ مخلوق کو جو کچھ مل رہا ہے وہ اس رحمت للعالمین کا صدقہ ہے۔

۲۔ عظیم الرحمت:

یہ وسعت رحمت عظمت رحمت کی دلیل بھی ہے آپکی رحمت حقیر یا گھسی پٹی نہیں۔ آپکی عطائیں وقتی اور عارضی نہیں۔ رحمتوں کی یہ برسات ادھوری اور ناقص نہیں۔ یہ رحمتیں جلیل ہیں اور عطائیں

دائمی ہیں۔ مہربانیاں مسلسل ہیں۔ کرم کا یہ مینہ کھل کر برس رہا ہے۔ اور تا ابد برستا رہے گا۔ عظمت شان وشوکت کو کہتے ہیں جو اوروں سے زیادہ ہو۔ عربی میں اسے عظیم القوم کہا جاتا ہے جو لوگوں کے معاملات کا مالک ہو۔ کوئی اسکے مقابلے کا ہو اور نہ کسی کو اس کے حکم سے سرتابی کی مجال ہو۔ اسے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا آپکی رحمت بلند رتبہ اور ذیشان ہے اور اسکی عظمت اس کے آثار سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ رحمت کی غایت انعام واحسان ہے۔ اس سے بلا تامل پتہ چلتا ہے۔ مخلوق خدا پر آپ ﷺ کے وہ احسانات ہیں جن تک پہنچنا تو در کنار کوئی ان کے گرد بھی نہیں پا سکتا۔ ہر احسان کامل اور ایک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔ جس جذبے سے ان کی نمو ہے اس کے وفور کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے اللہ نے آپ کے سوا کسی نبی کو علی الاطلاق رحمت نہیں کہا۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

ولهذا خص الله محمدا صلى الله عليه وسلم في هذه السورة بوصف الرحمة ولم يصف به غيره من الانبياء	اور اسی لئے اس سورت میں اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت سے موصوف کیا۔ اور آپکے سوا کسی نبی کو رحمت نہیں کہا (الانبیاء۔۱۰۷)

۳۔ اول المخلوقات:

عموم رحمت کی بنا اس تفسیر پر ہے جو علامہ آلوسی کے حوالے سے گذشتہ صفحات میں ذکر کی گئی۔ اس تفسیر پر عموم رحمت اس بات کی دلیل بھی ہے کہ مقصود کائنات محمد ﷺ کی تخلیق تمام مخلوق سے پہلے ہوئی۔ ازل میں جب خدا کی ذات وصفات کے سوا کوئی نہ تھا نہ عرش نہ کرسی نہ لوح وقلم تو اللہ نے سب سے پہلے آپکو تخلیق فرمایا۔ لیکن اس تخلیق کا کم وکیف بیان کرنا ممکن نہیں کیونکہ صورت گری سے پہلے مادہ تخلیق کیا جاتا ہے۔ وہ آبی وخاکی ہو یا نوری وناری ہو۔ انتہائی لطافت کی بنا پر اسے نور سمجھ لیا جائے تب بھی یوں نہیں کہا جا سکتا کہ آپ سے پہلے آپکا نور تخلیق ہوا۔ اگر اس کی تخلیق مقدم ہو تو لازم آئے گا آپ ﷺ خلق میں موخر اور مادہ تخلیق مقدم ہے۔ حالانکہ تاخیر تخلیق کی صورت میں آپ ان افراد کے لئے رحمت نہیں ہو سکتے جو مقدم ہیں یا ان کے لئے علی الاطلاق رحمت نہیں ہو سکتے اس لئے اس تخلیق کے مادے، ہیئت، مقام، شکل صورت کے بارے میں کچھ بھی بیان کرنا

ممکن نہیں اسی کو مولانا قاسم نانوتویؒ نے یوں بیان فرمایا۔

سب سے پہلے مشیت کے انوار سے نقش روئے محمد بنایا گیا
پھر اسی نقش سے مانگ کر روشنی بزم کون و مکاں کو سجایا گیا

اس صورت میں عالمین کے لئے رحمت ہونے کا مطلب علامہ آلوسی نے یوں بیان کیا ہے۔

وکونه صلی الله علیه وسلم رحمة للجمیع باعتبار انه علیه الصلاة و السلام واسطة الفیض الالهی علی الممکنات علی حسب القوابل ولذا کان نوره ﷺ اول المخلوقات

اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا سب کے لئے رحمت ہونا اس اعتبار سے ہے کہ آپ تمام ممکنات کے لئے انکی قابلیت کے حساب سے اللہ کے فیض کا واسطہ ہیں۔ اور اسی لئے آپ کا نور تمام مخلوقات میں اول ہے (آلوسی۔ الانبیاء ۱۰۷)

اور اس فیض کا سب سے پہلا اثر ممکن کا وجود ہے۔ اس لئے یہ کہنا بجا ہے اگر آپ ﷺ نہ ہوتے تو کائنات کو وجود نہ ملتا۔ آپ ﷺ ہی عالمین کا قطب، محور اور مرکز ہیں۔ آپ ﷺ ہی موجودات کا خلاصہ وجود کا واسطہ اور مقصود ہیں۔ آپ کی ذات عالی کو درمیان سے گر ہٹا دیا جائے تو عدم محض اور نیستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔

۴۔ افضل المخلوقات:

عموم رحمت آپ ﷺ کے افضل ہونیکی دلیل بھی ہے۔ جب سب کو فیض الہی آپ ﷺ کے واسطے سے پہنچ رہا ہے۔ ہر کس و ناکس آپ کی رحمتوں سے بہرور ہو رہا ہے تو لازم آیا آپ ہی تمام مخلوقات سے افضل ہوں۔ اپنے انعامات کی تقسیم کے لئے اللہ نے آپ ﷺ کو واسطہ اور رحمتوں کے نزول کے لئے آپ کو سبب بنایا۔ یہ انتخاب اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ ہر مخلوق، تمام انبیاء، ملائکہ، عرش کرسی لوح و قلم، کعبہ اور جنت سے افضل ہیں۔

ومن کان رحمة للعالمین لزم ان یکون افضل من کل العالمین

اور جو عالمین کیلئے رحمت ہے تو لازم ہے کہ وہ تمام عالمین سے افضل ہو۔ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

۵۔ رحمت آپکی جبلت ہے:

پہلے بتایا جا چکا ہے رحمت ضمیر منصوب مخاطب سے حال ہے۔ پھر رحمت کو مصدر ذکر کیا جو رحمت میں مبالغے کو ظاہر کرتا ہے۔ آپ سراپا رحمت ہیں۔ آپ میں رحمت کے سوا کچھ نہیں۔ خلق، عادت اور فطرت ثانیہ میں تغیر ہو سکتا ہے۔ ذات، فطرت اور جبلت میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ آپ ﷺ سراسر رحمت، سراپا الفت و احسان اور مجسم رحم و کرم ہیں۔ یہ وہ صفت متمکن ہے جو کسی حال میں بھی آپ ﷺ سے جدا اور منفک نہیں ہو سکتی۔ ابن عاشور اس آیت کی تفسیر میں کیا خوب کہتے ہیں

ففیه ایماء لطیف الی ان الرسول اتحد بالرحمة وانحصر فیها ومن المعلوم ان عنوان الرسولیة ملازم له فی سائر احواله فصار وجوده رحمة وسائر اکوانه رحمة ووقوع الوصف مصدرا یفید المبالغة فی هذا الاتحاد بحیث تکون الرحمة صفة متمکنة من ارساله

اس حال میں ایک لطیف اشارہ ہے رسول رحمت سے متحد اور اسمیں محصور ہے۔ اور یہ پہلے سے معلوم ہے کہ رسول ہونے کا عنوان تمام حالات میں آپ کیلئے لازم ہے پس آپکا وجود سراپا رحمت ہو گیا اور آپکے تمام افعال رحمت ہوئے اور صفت رحمت کو مصدر ذکر کرنا اس اتحاد میں مبالغہ کو ظاہر کرتا ہے اس لحاظ سے کہ آپکے ارسال کی متمکن صفت رحمت ہے

دوسری جگہ اللہ نے فرمایا

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ

سو کچھ اللہ کی رحمت ہی ہے جو آپ ان کو نرم دل مل گئے

اسے نقل کر کے ابن عاشور فرماتے ہیں

ای برحمة جبلك علیها وفطرك بها فكنت لهم لینا (الانبیاء۔ ۱۰۷)

یعنی رحمت کو آپ کی خلقت بنا دیا اور آپ کی فطرت اس کے ساتھ استوار کی جو آپ ان کیلئے نرم ہو گئے

فرعون جیسے باغی کے پاس موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا تو ہدایت یہ دی

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا

دونوں اس کے ساتھ نرمی سے بات کرنا

کافروں، منافقوں کے بارے میں آپ کو حکم دیا۔ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ۔ اور ان پر سختی کیجئے۔

علامہ شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں

حضرت کا خلق اور نرم خوئی یہاں تک بڑھی ہوئی تھی اللہ اوروں کو فرماتا ہے تحمل کرو اور آپ کو فرماتا ہے کہ سختی کرو (تفسیر عثمانی۔ تحریم۔ ۹)

٦۔ آپ کا ہر خلق رحمت ہے :

اسی سے معلوم ہوتا ہے آپ کو ہر خلق رحمت ہے۔ آپ کی ہر شان میں رحمت کا رنگ ہے بلکہ تمام الوان واکوان رحمت ہی ہیں۔ ابن عاشور محمد بن طاہر التیسی کے حوالے سے فرماتے ہیں

زین الله محمدا صلى الله عليه وسلم بزينة الرحمة فكان كونه رحمة و جميع شمائله رحمة وصفاته رحمة على الخلق ــــ ان محمدا صلى الله عليه وسلم فطر على خلق الرحمة في جميع احوال معاملته الامة.	اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمت کی شان سے مزین کیا۔ پس آپ کا وجود، آپ کے افعال اور آپ کی تمام عادات وصفات مخلوق پر رحمت ہیں۔۔۔۔۔ یقیناً اپنی امت کیساتھ معاملات کے تمام احوال میں آپ کو خلق رحمت پر پیدا کیا گیا۔ (الانبیاء۔ ۱۰۷)

خلق ایک مخفی جذبہ اور باطنی ہیئت ہے صادر شدہ افعال اس کی دلیل ہیں۔ بشرطیکہ وہ عادات کے زمرہ میں شامل ہوں۔ خواہ عمدہ ہوں خواہ ردی برے ہوں یا اچھے۔ انسان کے تمام اخلاق پر اس کی جبلت اور طبیعت اولی کی گہری چھاپ ہوتی ہے۔ سب اسی سے ناشی ہوتے ہیں اور یہ معلوم ہے کہ جبلت میں تبدیلی ممکن نہیں۔ یہ گلاب کو چنبیلی اور سیب کے بیج کو کھجور کی گٹھلی میں بدلنا ہے۔ ہاں ارادہ ومقاومت سے مخالف طبیعت عادت کو فطرت ثانیہ بنایا جا سکتا ہے لیکن جہاں موقع ملتا ہے جبلت فطرت ثانیہ کو دھکا دیتی ہے۔ یہ روز مرہ کا مشاہدہ ہے۔ گویا یہ جبلت پر کسا ہوا لبادہ ہے جس سے بناوٹ کی سیاہی جھلکتی ہے۔ اور اگر اخلاق موافق فطرت ہوں تو چہ خوب! جب رحمت ہی آپ ﷺ کی فطرت اور جبلت ہے تو آپ ﷺ کا ہر فعل اسی سے ناشی ہوگا ہر خلق میں اسی کا رنگ آئے گا۔ رحمت چونکہ خیر مطلق ہے لہذا اس سے صادر شدہ افعال بھی سراسر خیر ہوں گے۔ اس پر مزید کلام (ن۔ ۵) کے ضمن میں ہوگا۔ انشاءاللہ

رحمت کا تقاضا فضل واحسان ہے۔ عطا کرنا ہی احسان نہیں۔ منع کرنا اور روکنا بھی احسان ہوتا ہے۔ دونوں حق کیساتھ ہوں تو رحمت ہیں اور یقیناً آپ کی عطا اور منع حق کے ساتھ ہی ہے۔ آپ نے اللہ کیلئے دیا اور اللہ کیلئے ہی روکا۔ حدیث میں ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے زندگی بھر ذات کے لئے کسی سے انتقام نہ لیا۔ بددعا نہ کی بلکہ فرمایا۔

ايما رجل من امتى سببته سبة في غضبي او لعنته لعنة فانما انا رجل من ولد ادم اغضب كما يغضبون وانما بعثني رحمة للعالمين فاجعلها صلاة عليه يوم القيمه	میں بھی آدم کی اولاد میں سے ہوں انہی کی طرح مجھے بھی غصہ آجاتا ہے۔ اس حال میں اپنی امت کے کسی فرد کو برا کہا یا لعنت ملامت کی تو قیامت کے دن وہ اس کے لئے رحمت بنادی جائے گی۔ کیونکہ مجھے اللہ نے رحمت للعالمین بنا کر بھیجا ہے (ابن کثیر۔ الانبیاء۔ ۱۰۷)

یہ بات اپنی جگہ ہے کہ غصے کی حالت میں بھی حضور ﷺ کی مبارک زبان پر کلمات حق ہی جاری ہوتے ہیں۔ لہذا آپ ﷺ کی جنگ وصلح اور حدود وعقوبت بھی رحمت ہیں۔ بات یہ ہے کبھی تھوڑے فائدے سے روک کر بڑا فائدہ پہنچایا جاتا ہے۔ کبھی تھوڑا نقصان بڑے نقصان سے بچاتا ہے۔ اور کبھی ایک کا ضرر باقیوں کے نفع کا باعث ہوتا ہے۔ یہ سب رحمت ہے۔

۷۔ بقائے جهاں:

رحمت عالم ﷺ وجود کائنات کا سبب بھی ہیں اور بقائے جہاں کا ذریعہ بھی۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں۔

رسول ﷺ کا ان سب چیزوں کیلئے رحمت ہونا اس طرح ہے۔ کہ تمام کائنات کی حقیقی روح اللہ کا ذکر اور اس کی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس وقت زمین سے یہ روح نکل جائے گی اور زمین پر کوئی اللہ اللہ کہنے والا نہ رہے گا تو ان سب چیزوں کی موت یعنی قیامت آجائے گی۔ جب ذکر اللہ وعبادت کا ان سب چیزوں کی روح ہونا معلوم ہوگیا تو رسول اللہ ﷺ کا ان سب چیزوں کیلئے رحمت ہونا خود بخود ظاہر ہوگیا۔ کیونکہ اس دنیا میں قیامت تک ذکر اللہ اور عبادت آپ ہی کے دم قدم اور تعلیمات سے قائم ہے۔ (معارف القرآن۔ الانبیاء۔ ۱۰۷)

۸۔ اللہ کا انعام:

نعمت بخشش اور عطیہ ہے اور ہر وہ چیز جس سے دنیا اور آخرت کی زندگی خوشگوار ہو بلا معاوضہ ملے تو نعمت ہے۔ عالمین کیلئے اللہ کی سب سے بڑی رحمت کا نام محمد ﷺ ہے۔ آپ ﷺ بذات خود رحمت اور مخلوق پر اللہ کی نعمت ہیں۔ مخلوق پر اللہ کی ہر مہربانی اس کا انعام ہے۔ کیونکہ رحمت رقۃ القلب کا نام ہے۔ جس کا تقاضا فضل اور احسان ہے۔ دل کے گداز سے اللہ کی ذات پاک ہے کیونکہ یہ مخلوق کی صفت ہے لہذا صرف فضل واحسان باقی رہ گیا۔ اسی طرف خود آپ نے اشارہ فرمایا۔

انا رحمۃ مھداۃ ۔ میں سراسر رحمت ہوں جو تمہیں تحفے کے طور پر دی گئی (آلوسی۔ الانبیاء۔۱۰۷)

یعنی اللہ کی نعمت ہوں جو بلاغرض تمہاری خوشی کیلئے اتاری گئی۔ امام ماوردی کہتے ہیں

قال اللہ تعالی وما ارسلنک الا ۔ اللہ تعالی نے فرمایا اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر رحمۃللعالمین یعنی نعمۃ علیھم ۔ عالمین کے لئے رحمت یعنی ان پر نعمت بنا کر (فاتح)

۹۔ پیکر محبت و شفقت:

محمد ﷺ محبت کا بیکراں سمندر ہیں۔ جس کے ہر بُن مُو سے رحمت کی شاخیں پھوٹتی ہوں اور ہر زاویے سے رحمت کے رنگ جگمگاتے ہوں وہ کیسے مہر و وفا کے سانچے میں ڈھلا ہوا نہ ہوگا۔ آپ محبت کا پیکر ہیں۔ الفت کا پیغام ہیں۔ محبتیں بانٹنے والے ہیں۔ اپنی بے کنار رحمت کی وجہ سے ساری مخلوق کے ساتھ محبت رکھتے ہیں۔ معاف کرنا، بدلہ نہ لینا، دوسروں کے غم میں اللہ کے حضور رونا، حق سے اعراض پر منکرین کا درد رکھنا کہ اللہ خود آپ کو تسلیاں دے یہ سب محبت ہی کے رنگ ہیں۔ محبت رحمت کی ایک شاخ ہے۔ رحمت اصل ہے جس سے محبت کے ساتھ ساتھ شفقت کی نُما بھی پیدا ہوتی ہے۔ عیسائی جو اپنے دین کو دین محبت کہتے ہیں شاید نہیں جانتے صرف محبت کی اور نقص ہے۔ کیونکہ محض محبت عطا اور تعمیل امر کو چاہتی ہے۔ جبکہ رحمت رفع شر، ازالہ ضرر اور نقصان دور کرنے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ جیسے بیٹے کا ہاتھ انگارے کی طرف بڑھے تو محبت کا تقاضا ہے باپ خود اٹھا کر ہاتھ پر رکھ دے۔ اور رحمت کا تقاضا ہے ہاتھ میں ہو تو وہ بھی چھین لے۔

۱۰۔ دوسروں کی مشقت پر رنجیدگی و گرانی:

رحمت کے دو پہلو اور دو رخ پہلے معلوم ہو چکے ہیں۔ نقصان سے بچانا اور فائدہ پہنچانا۔ آپ ﷺ سراپا رحمت بن کر تشریف لائے تاکہ عالمین کو نقصان سے بچائیں اور فائدہ پہنچائیں۔ نقصان پر باڑ لگانا ایک درجے کی بھلائی ہے اور خیر کے دروازے بھی کھول دینا دوہری خیر خواہی ہے۔ دونوں رحمت کی شاخیں ہیں۔ ضرر، تکلیف اور نقصان سے بچانے کیلئے دردِ دل ضروری ہے۔ خیر، بھلائی اور نفع پہنچانے کیلئے اپنائیت ضروری ہے۔ جس کیلئے دل میں کڑھن اور باطن میں اپنائیت نہیں اس سے مجبوری کے سوا کبھی بھلائی نہیں کی جاسکتی۔ قرآن آپ کی یہ شان یوں بیان کرتا ہے۔

لَقَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ ۔ آیا ہے تمہارے پاس رسول تم کا۔ بھاری ہے اس پر جو عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم ۔ تکلیف تم پر پہنچی۔ حریص ہے تمہاری بھلائی پر۔ ایمان بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ۔ والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے (التوبہ۔۱۲۸)

اس آیت میں اللہ نے اپنے محبوب رسول کی درج ذیل صفات بیان کی ہیں۔

(۱) آپ ﷺ رسول ہیں۔ (۲) عظمت والے ہیں۔ (۳) بشر ہیں۔ (۴) عرب ہیں۔ (۵) عالی نسب ہیں۔ (۶) مخاطبین کی مشقت آپ کو رنجیدہ خاطر کرتی ہے۔ (۷) ان کے ایمان پر حریص ہیں۔ (۸) ایمان والوں پر شفیق ہیں۔ (۹) مومنوں پر مہربان ہیں۔

آخری چار صفات زیر بحث عنوان سے متعلق ہیں۔ جن میں سے ۸، ۹ پر علیحدہ گفتگو ہوگی۔

عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ ۔ بھاری ہے اس پر جو تکلیف تمہیں پہنچی۔

عنت مشقت کو کہتے ہیں۔ مفسر البقاعی فرماتے ہیں۔

والعنت لحاق الاذی الذی یضیق ۔ عنت نام ہے ایسی تکلیف و چیز چمٹنے کا جو سینہ کو تنگ الصدر بہ ولا یھتدی للمخرج منہ ۔ کردے اور اس سے نکلنے کی راہ نہ ملے (التوبہ۔۱۲۸)

تمہاری ایسی ضرر رساں اور اذیت ناک حالت رسول پر گراں ہے۔ اور اتنی بھاری ہے کہ اس سے آپ ﷺ کا سینہ مبارک گھٹ جاتا ہے۔ اخلاق کا کمال، شفقت کی انتہا اور مہربانی کا وفور کتنا

ہے۔ تکلیف غیر کی ہے اور قلق آپ ﷺ کو ہوتا ہے۔ تمہاری مشقت تمہارا ضرر ہے جو رسول رحمت کو برداشت نہیں اس عمیق رحمت کی تھاہ کون ماپ سکتا ہے جو خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم میر کا مصداق ہے۔ ہائے وہ مہربان رسول جو دوسروں کے غم میں بے حال ہوتا ہے۔ عالمی رسول کا یہ جذبہ رحمت بھی عالمگیر ہے۔ ذات پات کے غرور، حسب نسب کے فخر، اور قوم قبیلہ کی عصبی آلائشوں سے پاک ہے۔ آپ کی بے غرضی و بے نفسی کی دلیل ہے۔ بڑے سے بڑے جس نقصان کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ آخرت کا عذاب اور غضب ہے۔ اس سے زیادہ شفیق کون ہو سکتا ہے جو عالمین کو ابدی نقصان سے بچانے کی سعی کرے۔

یہاں مصدر صریح کے بجائے مَا مصدریہ لا کر فعل پر داخل کیا گیا جس سے متعین ہو گیا کہ وہ مشقت گراں ہے جو لاحق ہو چکی ہے۔ پیغمبر آئے۔ حق لائے۔ چاہیے تھا تم حق کی معیت اختیار کرتے۔ اس کے برعکس باطل کی رفاقت پسند کی۔ پیغمبر حق پر ثابت قدم رہے۔ اس کی پاسداری میں ایسے جاں گزا مرحلے آئے جب پیغمبر کو تم پر اقدام کرنا پڑا۔ یہ نفرت و عناد پر مبنی نہ تھا۔ مجبوری تھی۔ جس کی غایت اصلاح احوال تھی۔ پیغمبر کا دل آمادہ نہ تھا۔ لیکن حق کی پاسداری اور اللہ کی فرماں برداری مقدم تھی۔ تمہارے تمام تر اقدامات بغض و عناد پر مبنی تھے۔ ذمہ دار تم ہو۔ اگر تم باطل پر اڑنے کی بجائے حق پر ڈٹ جاتے تو یہ سب نہ ہوتا۔ اس کے باوجود طبعی رقت و رقت کی وجہ سے تمہاری مشقتیں پیغمبر کو آزردہ خاطر کرتی ہیں۔

۱۱۔ایمان کا حریص :

اس کے بجائے وہ تمہارے ایمان کا حریص ہے۔ وہ ضرر سے بچانا ہی نہیں چاہتا تمہارے ایمان کی طلب بھی رکھتا ہے۔ تمہیں فائدہ پہنچانا چاہتا ہے۔ حریص علیکم میں رحمت کے دوسرے پہلو ایصال الخیرات کا بیان ہے۔ ابن عاشور نے حرص کا یہ معنی بیان کیا۔

والحرص شدۃ الرغبۃ فی	کسی چیز کی شدید رغبت اور لالچ
الشئی والجشع الیہ	رکھنا حرص ہے۔ (التوبۃ۔ ۱۲۸)

وہ کس چیز کے حریص ہیں؟ مال و دولت اور دنیا کے؟ اپنی ذات کیلئے کوئی فائدہ چاہتے ہیں؟ نہیں

انہوں نے تو پہلے دن سے اعلان کر دیا۔

لَا اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا میں تم سے اس پر مزدوری کا سوال نہیں کرتا

یہ آیت آپ کی بے غرضی، بے نفسی اور امت کے ساتھ محبت و رحمت کی کتنی بڑی دلیل ہے۔ تمہیں نقصان سے بچانے کی خواہش۔ تمہیں فائدہ پہنچانے کی طلب۔ تمہاری خیر خواہی۔ تمہارا درد دل۔ اسی لئے رونا اسی لئے تڑپنا اسی لئے رات دن کی محنت۔ عمر کے تمام دن اور وقت کے تمام لمحے تمہارے لئے۔ اور اس پر مزدوری اجر بدلے اور صلے کا کوئی سوال نہیں۔ انہیں اپنی نہیں تمہاری ذات کی حرص ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

حریص علیکم ای علی	حریص علیکم کا مطلب ہے تمہاری ہدایت
ھدایتکم ووصول النفع	کی رغبت رکھتا ہے۔ اور تم کو دنیا اور آخرت
الدنیوی والاخروی الیکم	کا فائدہ دینا چاہتا ہے (التوبہ۔ ۱۲۸)

تمہارا ایمان تمہارا نفع ہے۔ سب سے بڑا فائدہ اللہ کی رضا و خوشنودی اور آخرت کا ثواب ہے۔ اور ایمان کا سبب یہ رحمت للعالمین ہیں۔ سبحان اللہ فائدہ اوروں کا اور پہنچانے کی حرص و طلب آپ کو ہے۔ اس رغبت کے بارے میں قرآن گویا ہوتا ہے۔

وَمَا اَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِيْنَ

اور اکثر لوگ نہیں ہیں یقین کرنے والے اگرچہ تو کتنا ہی چاہے

اِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ	اگر تو طمع کرے ان کو راہ پر لانے کی
فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ	تو اللہ راہ نہیں دیتا جس کو بچلاتا ہے۔

آپ ﷺ ہدایت کا سبب اور ایمان کا ذریعہ ہیں۔ امن و سلامتی کے پیغامبر اور راحت و سکون کے علم بردار ہیں۔ اہل جہاں کو ہدایت، ایمان، امن و راحت، انصاف اور مساوات آپ کی دہلیز سے ہی مل سکتی ہے۔ کیونکہ حق دار کو حق دینا، انصاف سے کام لینا، فضل و احسان کا برتاؤ کرنا رحمت کے نتائج ہیں۔ یہی مساوات ہے۔ اسی سے امن و سلامتی جنم لیتی ہے۔ جو راحت و سکون کی ضامن ہے۔

۱۲۔ منعم و محسن:

سراپا نعمت واحسان ﷺ اللہ کے انعامات کا ذریعہ بھی ہیں اور خود انعام واحسان کرنے والے بھی۔ اللہ نے آپ ﷺ کو جہان والوں پر رحمتوں اور عطاؤں کا واسطہ بنایا۔ آپ ﷺ کے ذریعے احسان کیے۔ کئی انعامات واحسانات میں آپ صرف واسطہ اور سبب ہیں مثلاً تمام تر تکوینی امور اور کئی تشریعی امور میں۔ کہیں آپ ﷺ کا واسطہ ہونا ظاہر ہے اور کہیں مخفی اور پوشیدہ۔ لاتعداد تشریعی احسانات کے خزانے آپ ﷺ کے دست مبارک پر رکھ کر آپ کو تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ ان میں آپ ﷺ واسطہ بھی ہیں اور مختار بھی۔ جن احسانات میں آپ ﷺ کو واسطہ بنایا اور جن میں اس کے ساتھ آپ کو اختیار بھی دیا بلحاظ اصل اللہ کی عطا ہیں۔ اور بطریق مجاز آپ ﷺ کے احسانات ہیں۔ انہیں ماننا شریعت کا حکم اور انکار احسان فراموشی اور طوطا چشمی ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔

وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا اور اگر گنو احسان اللہ کے نہ پورے کرسکو

اور ان سب نعمتوں کا سبب اور واسطہ محمد مصطفیٰ ہیں لہٰذا آپ کے واسطے سے ہونے والے احسانات اور آپ کے ذریعے دی جانے والی نعمتوں کا شمار ممکن ہی نہیں۔ مشتے نمونہ از خروارے کچھ پیش خدمت ہیں۔ آپ کے احسانات عام بھی ہیں خاص بھی۔ پہلے عمومی احسانات کا تذکرہ ملاحظہ کریں۔

عمومی احسانات:

۱۔ عطائے وجود رحمت ہے

آپکی خاطر یہ کارخانہ بنایا گیا۔ آپ ﷺ نہ ہوتے تو وجود حق پر دلالت کرنے والا یہ جہاں نہ ہوتا۔ بہاروں کے جاں فزا جھونکے اور خزاؤں کی زردرتیں نہ ہوتیں۔ سورج کا نور قمر کی چاندنی نہ ہوتی زمیں نہ ہوتی۔ آسمان نہ ہوتا۔ آسمان وزمین میں رنگا رنگ مخلوق اور قسم قسم کی نعمتیں نہ ہوتیں۔ یہ وجود اور اس کی تمام نعمتیں آپ ﷺ کا صدقہ ہیں۔

۲۔ تخلیق انسان رحمت ہے

تخلیق ملائکہ کمال قدرت کی دلیل ہے ان کی قوت وعظمت کا کمال خالق کے کمال قدرت کا نشان

ہے۔ تخلیق بشر جودورحمۃ کے کمال پر دلالت کرتی ہے۔ بخشش کا کمال یہ کہ تراب اور جلال رب الارباب میں کوئی مناسبت نہیں۔ اور کمال رحمت یہ کہ شہوت، غضب اور رزیل اخلاق کے ملغوبے میں نور معرفت رکھا۔ اس کی زبان پر ذکر توحید جاری کیا۔ اس کی آنکھوں کو اپنے دلائل دیکھنے کا راستہ بنایا اور اس کے کانوں کے اپنے کلام کی سماعت کا محل بنایا۔

۳۔ عطائے نبوت رحمت ہے

نبوت میں آپکا واسطہ ہونے پہلے بیان ہو چکا ہے اور نبوت کے رحمت ہونے کے متعلق امام ابن قیم کے حوالے سے صاحب روح المعانی نے فرمایا۔

> اگر نبوتیں نہ ہوتیں تو دنیا میں نفع مند علم، نیک عمل، معیشت کی اصلاح اور سلطنتوں کا قوام نہ ہوتا۔ جہاں میں ہر خیر نبوت سے ہے۔ اور ہر شر جو ہے یا ہوگا آثار نبوت کی پوشیدگی سے ہے۔ عالم جسم ہے اور نبوت روح ہے۔ بلا روح جسم کا قیام ممکن نہیں اس لئے جب نبوت کے سورج کو گہن لگا اور آثار نبوت میں سے زمین میں کچھ نہ رہا تو آسمان پھٹ جائے گا۔ ستارے بکھر جائیں گے۔ سورج بے نور ہو جائے گا۔ چاند تاریک ہوگا۔ پہاڑ جڑ سے اکھڑ جائیں گے۔ زمین زلزلوں کی زد میں ہوگی۔ اور اس پر بسنے والے سب ہلاک ہو جائیں گے۔ پس آثار نبوت کے بغیر جہان کا قائم رہنا ممکن نہیں (الانبیاء۔ ۱۰۷)

معلوم ہوا نبوت رحمت ہے جو آپ کی وساطت سے انبیاء کو عطا ہوئی۔ امام ابن قیم کی اس عبارت سے اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ جہان کی بقا بھی نبوت سے ہی وابستہ ہے۔

۴۔ ختم نبوت بھی رحمت ہے:

اسی سے واضح ہو جاتا ہے کہ ختم نبوت بھی اللہ کی رحمت اور اس کی مہربانی ہے۔ مزید لطف وکرم یہ کہ اس کیلئے اللہ نے رحمۃ للعالمین ﷺ کا انتخاب فرمایا۔ چونکہ اس کا سبب آپ ہیں اس لئے یہ آپ ﷺ کی رحمت اور مہربانی بھی ہے۔

یہ بات پہلے سے معلوم ہے کہ اللہ نے یہ جہان بلاوجہ نہیں بنایا۔ اس کی رونقوں کی ایک خاص وجہ اور ہمیں یہاں بھیجنے کی خاص غرض ہے۔ وہ یہ کہ ہم یہاں اللہ کی معرفت حاصل کریں اور اس کی

طرف سے بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کریں۔ یہ غرض سامنے ہو تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جہان ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں بنا۔ اس کی ایک علت یہ بھی ہے کہ یہ ساری بساط لپیٹ کر پھر کسی خاص وقت میں مخلوق سے حساب کتاب لیا جائے اور اعمال کے مطابق جزا سزا دی جائے۔

فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى میں اجراء نبوت کا اشارہ ہے۔ کیونکہ نبوت کے سوا اللہ کی ہدایت ہم تک پہنچنے کا دوسرا کوئی ذریعہ نہیں۔ پس اگر نبوت ختم نہ ہوتی تو دنیا کا خاتمہ ممکن نہ تھا۔ اور یہ جہان کو پیدا کرنے کی غرض اور حکمت کے خلاف ہے۔ کیونکہ نبوت جاری رہنے کا مطلب ہے ہمیں دنیا میں بھیجنے سے اللہ کی جو مراد ہے وہ پوری نہیں ہوئی۔ اس راہنمائی کی تکمیل و تتمیم ابھی باقی ہے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب تک یہ جہان اور اس جہان پر انسان باقی رہیں۔ سو جنہوں نے اللہ کی رسی تھامی انہیں اس کا پورا صلہ بھی نہ ملتا اور جنہوں نے چھوڑی انہیں اس کی کامل سزا نہ ملتی۔ یہ باتیں اختتام نبوت ہی سے حاصل ہو سکتی تھیں۔ لہذا ایک خاص وقت پر اللہ نے در نبوت بند فرما دیا۔ اور اس رحمت کے لئے آپ کو چنا۔ پس یہ دروازہ بند فرما کر بھی آپ نے مخلوق پر احسان فرمایا۔ کیونکہ آپ ﷺ ہی نے اللہ کی مراد کو مکمل فرمایا اور جس دن یہ مراد مکمل ہوئی اسی دن اللہ نے اکمال دین کی خوشخبری سنا کر منی هدی کے خاتمے کا اعلان فرما دیا جیسا کہ کمال دین کی بحث میں ان شاء اللہ معلوم ہوگا۔

۵۔ امتیاز حق و باطل رحمت ہے

آپ ﷺ نہ ہوتے حق روشن ہوتا نہ باطل کا پتہ چلتا۔ باطل دوئی پسند ہے اور حق لاشریک ہے۔ حق و باطل کا آمیزہ بھی باطل ہی ہوتا۔ آنکھوں پہ پردے، کانوں میں ڈاٹ ہوتے۔ ظلم اور استحصال پر مبنی معاشرے ہوتے۔ ہر فساد اور ہر شر روا ہوتا۔ مقصد اصلی کا کسی کو علم نہ ہوتا۔ حقائق اشیاء سے واقفیت نہ ہوتی۔ لوگ جانوروں کی طرح زندگی گزارتے۔ فوز و فلاح اور حقیقی اخروی کامیابی سے دور جا پڑتے۔

آپ کی برکت سے لوگوں کو نجات کا طریقہ اور صداقت کا راستہ ملا۔ انسانیت کو معراج ملی۔ آدمیت کا احترام ملا۔ ہر صاحب حق کو اسکا حق ملا۔ عقل کو اس کا جائز مقام عطا ہوا۔ اوہام و ظنون

کے بت توڑے گئے۔ مظاہر پرستی سے نجات ملی۔ علوم کی اشاعت ہوئی۔ فنون کے دروازے کھلے۔ تب کہیں جا کر آج کی سائنسی ترقی ممکن ہوئی۔

جنہوں نے قبول نہ کیا انکی قسمت۔ بارش ہر خشک و تر پر برستی ہے۔ زرخیز زمین فصلیں اگاتی ہے اور پتھر خشک ہو جاتے ہیں۔ سورج ہر کہ و مہ پر چمکتا ہے۔ آئینے کی چمک اور کوئلے کی سیاہی دونوں ہی اس سے نمایاں ہو جاتی ہیں۔ انکے نصیب کا ابر کرم کسی اور چھت پر برس گیا تو قصور انکا ہے۔ محمد کی رحمتوں کا سورج تو سب پر چمک رہا ہے۔

۶۔ کمال دین بھی رحمت ہے:

علی الاطلاق کامل دین ملا۔ مکمل توحید عطا ہوئی۔ گزشتہ رسولوں اور ان کے دین کی تصدیق ہوئی۔ اللہ ہمیں جو تعلیم دینا چاہتا تھا اس کی تکمیل ہوئی۔ اللہ کی مراد پوری ہوئی۔ ادنیٰ توجہ سے اس کا رحمت ہونا معلوم ہو سکتا ہے۔

۷۔ عذاب استیصال سے نجات رحمت ہے۔

انبیاء سابقین سزا و عقوبت کا مقدمہ تھے جیسا کہ فرمایا۔

وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا — اور ہم نہیں ڈالتے بلا جب تک نہ بھیجیں کوئی رسول

آپکو بھیج کر رحمت کا مقدمہ بنا دیا۔ اللہ نے ارادہ کیا کہ خاتمہ عقوبت کے بجائے رحمت پر ہو۔ پس وجود کی ابتدا بھی رحمت ہے اور انتہا بھی رحمت ہے۔ کافروں پر آپکی برکت سے موت یا قیامت تک کے لئے عذاب ٹال دیا گیا۔ تفسیر بغوی میں اس آیت کے تحت ہے

ومن لم يؤمن فهو رحمة له في الدنيا بتاخير العذاب عنهم ورفع المسخ والخسف والاستئصال عنهم — کافروں کے لئے دنیا میں تاخیر عذاب کیساتھ رحمت ہیں۔ شکلوں کے بگاڑ، زمین میں دھنسنے اور پوری قوم صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا عذاب ان سے اٹھا لیا گیا

یہ سب کیوں کیا گیا؟ تفسیر البقاعی میں ہے۔

اظهارا لشرفك واعلاء لقدرك — آپکے شرف کا اظہار اور آپ کے رتبے کی بلندی مقصود تھی۔

۸۔ مشروعیت جہاد رحمت ہے

اس کے بجائے انہیں عذاب دینے کے لئے جہاد مقرر کیا گیا۔ جہاد اس لئے بھی رحمت ہے کہ مذکورہ عذابوں کے قائم مقام ہے۔ اور اس میں مہلت ہے۔ اور اس لئے بھی رحمت ہے کہ چند افراد کے مرنے سے ہزاروں کے لئے ہدایت کے راستے کھلتے ہیں۔ جہنم رسید ہونے والے مزید گناہوں سے بچ جاتے ہیں۔ آپکی جنگ رحمت کا حصہ ہے۔ خود اپنی مبارک زبان سے آپ نے اس کی وضاحت فرمائی عین دوران جنگ فتح مکہ کے موقع پر سعد بن ابی وقاص نے نعرہ لگایا

الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الکعبۃ۔

آج کا دن جنگ کا دن ہے۔ کعبہ میں آج قتل وقتال حلال ہے

آپ ﷺ نے ان سے علم لیکر ان کے بیٹے کے سپرد کر دیا اور یہ بھی فرمایا۔

الیوم یوم المرحمۃ۔ آج کا دن رحمت کا دن ہے۔ (سیرۃ المصطفیٰ۔ ۱۱۶/۲)

۹۔ امن وسلامتی:

آپکی برکت سے اہل جہان کو امن اور سلامتی نصیب ہوئی یہ بھی رحمت ہے۔ سلامتی والے رب نے آپکو سلامتی کا پیکر اور اسکا ذریعہ بنایا۔ آپ نے لوگوں کی جان مال اور آبرو کو بنیادی حق قرار دیا اور انکی سلامتی کیلئے احکام بیان فرمائے۔ جہاد سلامتی کا ذریعہ اور انسانوں کی انسانوں سے غلامی کی نجات کا وسیلہ ہے۔ امن وشانتی رحمت کے تقاضے ہیں۔ آپکی برکت سے اہل جہان کو راحت ملی۔ اس کیلئے کسی دلیل کی بھی ضرورت نہیں۔

۱۰۔ شفاعت رحمت ہے:

کل حشر میں مقام محمود پر کھڑے ہو کر شفاعت کبریٰ فرمائیں گے۔ یہ اس رحمت کی وسعت، بھرپور عظمت اور فضل واحسان کے ظہور کا دن ہوگا۔

ومن اعظم ما یظہر فیہ ہذا الشرف	عموم رحمت کی عظمتوں میں سے ایک یہ شرف بھی
فی عموم الرحمۃ وقت الشفاعۃ	ہے جس کا اظہار شفاعت عظمیٰ کے وقت ہوگا جس
العظمی یوم یجمع الاولون والاخرون	دن اولین وآخرین جمع ہوں گے (الابتہال۔ ۱۰۷)

خصوصی احسانات:

اس امت پر آپ ﷺ کا فیضان رحمت گھٹا بن کے امڈا اور برسات بن کے برسا۔ پھول بن کے مہکا اور خوشبو بن کے پھیلا۔ موج بن کر ابھرا اور لہر بن کر پھیلا۔ ہوا بن کر اٹھا اور صبا بن کر اترا۔ سورج بن کر چمکا اور نور بن کر بکھرا۔ دل بن کے دھڑکا اور سایہ بن کے ڈھلکا۔ سرخوشی بن کر پہنچا اور نغمہ حیات بن کر پھیلا۔ رسول ﷺ کو جو فخر عطا ہوئے ان میں آپ کی امت کا حصہ بھی رکھا گیا۔

۱۔ آپ خاتم الانبیاء ہیں۔ امت خاتم الامم ہے۔

۲۔ آپ سراپا خیر ہیں امت کو بھی خیر امۃ کا اعزاز ملا۔

۳۔ آپ سید الوسط ہیں امت کو بھی وسط بنا دیا گیا۔

۴۔ آپ شاہد ہیں۔ امت کو بھی منصب شہادت ملا۔

۵۔ آپکی بات خدا کی بات ہے۔ اجماع امت کو بھی یہ مقام ملا۔

۶۔ آپ داعی الی اللہ ہیں آپکے بعد امت کو بھی مقام دعوت پر کھڑا کیا گیا۔

۷۔ آپکو داعی الی اللہ کہا اور امت کو فرمایا۔

وَمَنْ أَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّن دَعَا إِلَى اللَّهِ اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے اللہ کی طرف بلایا

۸۔ آپ ﷺ زبان مبارک سے أَنَا أَوَّلُ الْمُسْلِمِينَ کا اعلان کروایا۔ امت کا بھی یہ نصیب بنا۔

قَالَ إِنَّنِي مِنَ الْمُسْلِمِينَ۔ کہا میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

۹۔ آپ ﷺ کا شرف ذکر کیا

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر

آپ ﷺ کی برکت سے یہ فضیلت امت کو بھی ملی

هُوَ الَّذِي يُصَلِّي عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ وہی ہے جو رحمت بھیجتا ہے تم پر اور اس کے فرشتے

۱۰۔ آپ ﷺ کے لئے اعلان فرمایا

لِيَغْفِرَ لَكَ اللَّهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ

تا معاف کرے تجھ کو اللہ جو آگے ہو چکے تیرے گناہ اور جو پیچھے رہے۔

امت کو بھی محروم نہ کیا اور فرمایا

وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ بِأَنَّ لَهُمْ مِنَ اللَّهِ فَضْلًا كَبِيرًا

اور خوش خبری سنا دے ایمان والوں کو کہ ان کے لئے ہے خدا کی طرف سے بڑی بزرگی

۱۱۔ آپ ﷺ کیلئے اپنا ارادہ احسان ظاہر فرمایا۔

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكَ — اور پورا کر دے تجھ پر اپنا احسان

آپ ﷺ کی امت کو بھی فراموش نہ کیا اور فرمایا۔

وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ — اور پورا کرے اپنا احسان تم پر

۱۲۔ آپ ﷺ پر اپنے فضل واحسان کا تذکرہ فرمایا

وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ — اور آپ کو وہ کچھ سکھایا آپ نہیں جانتے تھے۔

اور امت کو کہا

وَيُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ — اور سکھاتا ہے تم کو جو تم نہیں جانتے تھے۔

۱۳۔ آپ ﷺ کو حکم دیا

لِتُنْذِرَ أُمَّ الْقُرَى وَمَنْ حَوْلَهَا۔

کہ تو ڈر سنا دے بڑے گاؤں کو اور آس پاس کے لوگوں کو

امت کو فرمایا

وَلِيُنْذِرُوا قَوْمَهُمْ — اور تا کہ خبر پہنچائیں اپنی قوم کو

۱۴۔ آپ ﷺ کو استقبال قبلہ کا حکم دیا اور فرمایا۔

فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ — اب اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں

خطاب کی یہی فضیلت آپ ﷺ کی امت کو بھی عطا فرمائی۔

فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ — پھیرو اپنے منہ اسی کی طرف

۱۵۔ آپ ﷺ کی امت کے لئے بشارات اتاریں۔ امت کو آپ ہی کی بدولت یہ بزرگی بھی ملی

بَشِّرِ الصَّابِرِينَ۔ بَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ۔ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ۔ وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ

مِنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ۔

۱۶۔ آپ کی برکت سے دین کامل اور آسان ملا۔

۱۷۔ اللہ نے خود کو آپ کی امت کا مولی اور دوست قرار دیا۔

اللَّهُ وَلِيُّ الَّذِينَ آمَنُوا۔ اللہ مددگار ہے ایمان والوں کا أَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا۔ کہ اللہ رفیق ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے۔

۱۸۔ آپ کی امت کو عزت والا کہا۔ وَلِلَّهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُولِهِ وَلِلْمُؤْمِنِينَ ۔ اور زور تو اللہ کا ہے اور اسکے رسول کا اور ایمان والوں کا

۱۹۔ انتہائی پیار بھرے لہجے میں خطاب کیا۔ مومنوں کے ایمان پر خود گواہ بنا اور فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ اے ایمان والو۔ اہل علم جانتے ہیں اسمیں کس درجہ لگاوٹ کی مٹھاس اور چاہت کی نرمی ہے۔

اہل تورات کو یاایہا المساکین کہہ کر مخاطب کیا اور بالآخر مسکنت ہی ان پر مسلط کر دی گئی۔ فرمایا

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ — اور ڈالی گئی اُن پر ذلت اور محتاجی

اور یہ چیز اس پر دلالت کرتی ہے کہ

انه تعالى لما خاطب هذه الامة بالايمان اولا فانه تعالى يعطيهم الامان من العقاب في النيران يوم القيمة (رازی۔بقرہ ۱۰۴)	اللہ تعالی نے جب اس امت کو ایمان کے ساتھ خطاب کیا تو قیامت کے دن جہنم کے عذاب سے امان بھی دے گا۔

اس پر الگ سے بات ہوگی

۲۰۔ کبائر سے اجتناب کرنے پر صغیرہ گناہوں کی از خود معافی کا اعزاز بخشا۔

۲۱۔ اس امت کی زبانی توبہ قبول کی گئی۔

۲۲۔ قربانی کی قبولیت اور عدم قبولیت کو چھپا کر آپ کی امت کو رسوائی سے بچایا۔

۲۳۔ قبلہ، جمعہ، رمضان، دین کے نام اور ملت ابراہیمی کے بارے میں امت محمد کی راہنمائی کی اور گزشتہ امتوں کے مقابلے میں انھیں ہدایت سے سرفراز فرمایا گیا۔

۴۴۔ آپ کی امت کو عقل وبصیرت کا کمال بخشا۔ انہیں قوت بصیرت کی وجہ سے براہ راست اپنی یاد کا حکم دیا اور فرمایا۔ فَاذْكُرُونِي۔ پس تم مجھے یاد کرو۔ بنی اسرائیل کو فرمایا۔ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ میری نعمت یاد کرو۔ اللہ اکبر محبوب کبریا کے طوق غلامی نے اس امت کو کتنی عظمت عطا فرمادی؟ آپ کے حلقہ ارادت میں یہ امت کتنی انمول ہوگئی؟ ثری کے حاشیہ نشین ہمدوش ثریا ہو گئے سنگریزے ہیروں کے مول بکنے لگے۔ براہ راست اس امت کو اللہ کے نامہ و پیام آنے لگے۔ سچ ہے پیارے کی ہر چیز پیاری ہوتی ہے۔ پھر اس نبی مکرم کی محبت جان و دل سے زیادہ کیوں نہ ہو۔ اور اس کے امتی اس کے لئے اپنا تن من دھن قربان کیوں نہ کریں؟ اس قربانی پہ کچھ نہ ملتا تب بھی روا تھا لیکن اس حقیر قربانی پر بھی وہ اجر اور ثواب رکھا گیا جو ہماری سوچ سے باہر ہے۔ اس کے علاوہ بھی رحمت اللعالمین ﷺ کے لاتعداد احسانات ہیں جن میں سے کچھ کا ذکر کیا جا چکا ہے اور کچھ کا تذکرہ آگے مستقل عنوانات کے تحت ہوگا۔ علاوہ بریں ان میں سے بھی چند باتوں کی تفصیل کی جائے گی۔

۱۲۔ دین رحمت:

حضور ﷺ کی رحمت للعالمینی رحمت اسلام کو بھی متضمن ہے۔ آپکی شریعت آپکے خلق سے مناسبت رکھتی ہے۔ رحمت رفق، تیسیر، نرمی اور سہولت پیدا کرتی ہے۔ اسی لئے آپ کو وہ دین دیا گیا جو نرم، کشادہ اور آسان ہے۔ سخت، تنگ اور دشوار نہیں۔ دین ہی امت کے مزاج کی اساس ہوتا ہے۔ اس لئے بحیثیت مجموعی آپکی امت سخت دل، تنگ نظر، متعصب اور صعوبت پسند نہیں۔ قرآن مجید کو کئی آیتوں میں رحمت کہا گیا یعنی اس پر عمل سے زندگی کی تنگی اور دشواری دور ہو جاتی ہے۔ زندگی میں نکھار اور سلیقہ پیدا ہوتا ہے۔ رحمت حسن نظم اور سلیقہ شعاری بھی دلالت کرتی ہے۔ آپکی رحمت کے ذیل میں قرآن کا تذکرہ کرتے ہوئے مفسر محمد الامین نے فرمایا۔

انه جاء بالرحمة للخلق فيما	بے شک آپ خلق کے لئے رحمت لائے
تضمنه هذا القرآن العظيم	اسکے ذیل میں یہ قرآن عظیم بھی ہے (الشنقیطی)

زیر نظر آیت اور آپکا مقدس فرمان انا رحمة مهداة دونوں اس طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ آپ رحمت کا ڈھلا ہوا سانچہ ہوں۔ شفقت کا خوش نظر قالب ہوں اور آپ ﷺ کا دین رحمت و شفقت سے لبریز ہونے کے بجائے ظلم و عدوان، وحشت و بربریت اور سختی و تنگی کا پیغام دیتا ہو۔ رسول رحمت کا دین دہشت گردی کی تعلیم کیسے دے سکتا ہے۔ آپکی رحمت یہ چاہتی ہے کسی سے زیادتی نہ ہو۔ جسکی عملی صورت یہ ہے کہ لب کھلنے سے پہلے ہی ہر حق دار کو اسکا حق دے دیا جائے۔ آپ اس دین کی دعوت کیسے دے سکتے ہیں جو اس کے الٹ تعلیم دیتا ہو۔ پس آپ وہ دین لائے جس نے ہر چیز کا پورا پورا حق بیان کیا۔ ہر چیز اپنی جگہ درست بیٹھ گئی۔ اس سے حسن اور خوبصورتی نے جنم لیا۔ مقررہ حق میں بال برابر کمی بیشی اس حسن کو غارت کرنے کے مترادف ہے۔ لہذا اسلام ہی وہ دین ہے جو رحم و کرم اور شفقت و محبت کی تعلیم دیتا ہے۔ عفو و درگذر اور ہمدردی و خدا ترسی کا درس دیتا ہے۔ اخوت و مساوات کا سبق سکھاتا ہے۔ ہر چیز کو اسکا جائز مقام عطا کرتا ہے۔ آپ کا دین حسین ترین دین ہے۔ اسمیں ہر طبقے کا حق بیان کیا گیا اور پھر آپ ﷺ نے اس پر عمل کر کے بھی دکھلایا۔ پست طبقوں مثلاً غلاموں، فقیروں، یتیموں اور عورتوں کے حقوق کی انتہائی نگہداشت فرمائی۔ ذمیوں کے ساتھ مہربانی کی۔ معمولی جزیے کے بدلے ان کی جان مال اور عزت کی حفاظت کی ذمہ داری اٹھائی۔ جانوروں تک سے حسن سلوک کیا۔ اسی کا حکم دیا۔ کھانے کے سوا جانوروں کو تکلیف دینا جرم ٹھہرایا۔ فائدہ مند جانوروں سے فائدہ اٹھانا مباح قرار دیا۔

ابن عاشور فرماتے ہیں۔

فان اريد اصناف ذوى العلم فمعنى	اگر عالمین سے ذوی العلم کی اصناف مراد ہوں
كون الشريعة المحمدية منحصرة	تو مطلب ہوگا محمد کی شریعت رحمت میں گھری
فى الرحمة انها اوسع الشرائع	ہوئی ہے یہ لوگوں پر مہربانی کے معاملے میں
رحمة بالناس فان الشرائع سالفة	تمام شریعتوں سے وسیع ہے۔ پچھلی شریعتیں
مملوء برحمة الاان الرحمة فيها	یقیناً رحمت سے لبریز تھیں مگر انکی رحمت عام نہ
غير عامة	تھی خاص تھی۔ (الانبیاء۔۱۰۷)

یا اپنے پیروں کاروں کے تمام حالات سے متعلق نہ تھیں یا انکے احکام کا بڑا حصہ شدت پر مشتمل تھا جیسے شریعت ابراہیم وعیسی اور شریعت موسیٰ علیہم السلام۔ یقیناً اللہ نے شریعت اسلام کو کامل رحمت کی خوبی سے موصوف کیا۔ ابن عاشور ہی مزید فرماتے ہیں

ففی قوله تعالی وسعت کل شیء اشارة الی ان المراد رحمة هی عامة فامتازت شریعة الاسلام بان الرحمة ملازمة للناس بهافی سائر احوالهم وانها حاصلة بها لجمیع الناس لالامة خاصة

اللہ کے قول وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ میں اشارہ ہے رحمت سے مراد عام رحمت ہے شریعت اسلام اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ رحمت لوگوں کے تمام احوال میں ان کے لئے لازم ہے اور یہ کسی گروہ کیساتھ مخصوص نہیں۔ تمام لوگوں کو حاصل ہے (الانبیاء۔۱۰۷)

اللہ کے ناموں والا نبی

رحمت کائنات، شفیق جہاں محمد ﷺ کو اللہ نے بہت سے نام عطا فرمائے۔ ہر نام آپ ﷺ کی کسی نہ کسی خوبی کا آئینہ ہے۔ ان اسماء میں آپ ﷺ کے اوصاف جلوہ گر ہیں۔ اس سلسلہ اسماء کو سمیٹا جائے تو محاسن کا جو گلدستہ بنتا ہے اس کا نام محمد ہے۔ ﷺ۔ محمد کی تمام خوبیاں احمد میں مرتکز ہیں۔ آپ ﷺ وہ واحد ہستی ہیں جنہیں اللہ نے اپنے ناموں میں سے دو نام عطا فرمائے۔

رءوف اور رحیم

امام رازی نے حضرت ابن عباس ؓ کی روایت نقل کی۔ وہ فرماتے ہیں۔

سماه الله تعالی باسمین من اسمائه

اللہ نے اپنے ناموں میں دو ناموں پر آپ کا نام رکھا۔ (التوبۃ۔۱۲۸)

اپنے متعلق اللہ نے فرمایا۔

إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ۔

بیشک اللہ لوگوں پر بہت شفیق نہایت مہربان ہے۔ (البقرہ۔۱۴۳)

آپ ﷺ کے متعلق ارشاد فرمایا۔

بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (آپ) مومنوں پر شفیق اور مہربان ہیں۔ (التوبۃ۔۱۲۸)

اللہ بھی رؤوف اور رحیم ہے آپ ﷺ بھی رؤوف اور رحیم ہیں۔ یہ فضیلت کسی دوسرے نبی کو عطا نہیں ہوئی۔ اسے سمجھنے سے پہلے مناسب ہے کہ رؤوف اور رحیم سے جان کاری حاصل کی جائے تاکہ آپ ﷺ کی شان نمایاں ہو کر سامنے آسکے۔

رافت و رحمت کیا ہے؟

رحیم رحمت سے ہے۔ رحمت کیا ہے؟ اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ اعادہ کے طور پر مفسر ابن عاشور کی ایک عبارت پیش خدمت ہے فرماتے ہیں۔

الرحمة رقة تقتضي الاحسان — رحمت ایسی نرم دلی ہے جس کا تقاضا احسان ہے (التوبة۔۱۲۸)

وہاں رحمت کا لفظ استعمال ہوا جس کا مطلب تھا ذو رحمۃ آپ رحمت والے ہیں۔ یہ آپ کا سراپا اور آپ کی سرشت ہے۔ یہاں اس کا اسم صفت رحیم لایا گیا۔ اس کا مطلب ہے آپ بالفعل دوسروں پر رحمت کرتے ہیں۔

نرم دلی کی وجہ سے دوسرے کی طرف ایک میلان اور جھکاؤ پیدا ہوتا ہے۔ طبیعت چاہتی ہے اس کے ساتھ مہربانی اور احسان کا برتاؤ کیا جائے۔ اس احسان کے دو رخ اور پہلو ہیں۔ ایک پہلو دوسرے کو ضرر سے بچانا اور نقصان کا ازالہ کرنے کی کوشش کرنا ہے۔ دوسرا پہلو اسے فائدہ دینا اور نفع پہنچانا ہے۔ پہلا رخ رافت ہے اور دوسرا رخ رحمت ہے۔

رافت کے بارے میں ابن عاشور فرماتے ہیں۔

الرافة رقة تنشأ عند حلول ضر بالمرء وف به — رافت نرمی ہے جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کو نقصان لاحق ہو جس پر مہربانی کی جا رہی ہے۔ (التوبة۔۱۲۸)

اس نرمی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کا نقصان دور کر دیا جائے۔ رؤوف رافت کا اسم فاعل ہے۔ یعنی وہ ہستی جو دوسروں کو نقصان سے بچاتی ہے اور ان سے ضرر کو دور کرتی ہے۔ رافت رحمت کا جزو ہے۔ انتہا درجے کی رحمت کو رافت کہتے ہیں۔

تفسیر ابن عاشور میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا۔

الرأفة مبالغة في رحمة خاصة وهي دفع المكروه وازالة الضر واما الرحمة فاسم جامع يدخل فيه ذلك المعنى ويدخل فيه الافضال والانعام — رافت خاص رحمت میں مبالغہ ہے یعنی ناگوار چیز کو دور کرنا اور ضرر کا ازالہ کرنا۔ رہی رحمت تو یہ ایک جامع اسم ہے جس میں رافت بھی شامل ہے اور اسی کے ساتھ فضل و احسان کرنا بھی داخل ہے (البقرة۔۱۴۳)

علامہ الوسی روح المعانی (التوبة۔۱۲۸) میں فرماتے ہیں

الرأفة التي هي عبارة عن شدة الرحمة — رافت وہ ہے جو رحمت کی شدت سے عبارت ہے

اس تفصیل سے معلوم ہوا حضور رحمت للعالمین ﷺ اہل ایمان کو فائدہ پہنچانے در پے ہی نہیں ان کے نقصان اور ضرر پر بھی کڑھتے اور اسے دور کرنے کی فکر میں گھلتے ہیں۔ صرف ابر نو بہاری نہیں ربیع کی بارش بھی ہیں۔

حضور ﷺ نے مومنین پر جو مہربانیاں فرمائیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں۔ جن نقصانات سے انہیں بچانے کی کوشش کی وہ بھی پوشیدہ نہیں۔ اس پر یہاں کلام کی ضرورت نہیں البتہ یہ واضح کرنا مناسب ہے کہ ان اسماء کی حقیقت اور رافت و شفقت میں فرق کیا ہے؟ تا کہ ان میں مقام مصطفیٰ کا اندازہ ہو سکے۔ رافت اور شفقت مترادف ہیں۔ اس لئے اردو میں رؤوف کا ترجمہ شفیق سے کیا جاتا ہے۔ بلکہ علامہ الوسی تو فرماتے ہیں

وصحح ان الرافة الشفقة۔ اور صحیح بات یہ ہے کہ رافت شفقت ہی ہے۔ (روح المعانی۔التوبة۔۱۲۸)

خاتم النبیین کے ضمن میں شفقت کی کچھ وضاحت ہو چکی ہے۔ رحمت رسالت کا تقاضا ہے اور رافت ختم نبوت کا۔

بلا محنت اوصاف

رحمت دو عالم ﷺ کو ان اسماء سے موسوم کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اوصاف آپ کی خلقت میں رکھ دیے گئے۔ ان کے حصول میں آپ ﷺ کی محنت، کسب اور کوشش کا کوئی دخل نہیں۔ اس لئے یوں نہیں کہا جا سکتا کہ آپ ﷺ میں ان اوصاف کی تدریجاً ترقی ہوئی اور رفتہ رفتہ کمال کو پہنچے۔ نہیں بلکہ ابتدا ہی سے بتمام و کمال آپ کو عطا کیے گئے

اس کی وضاحت یہ ہے کہ جن کاموں کا اللہ نے حکم دیا ان پر عمل کرنے والوں کی مدح فرمائی۔ ان اعمال و اخلاق کے اعتبار سے انہیں کئی نام دیے۔ مثلاً صبر کرنے والوں کو صابر کہا۔ سچوں کو صادق کہا۔ توکل کرنے والوں کو متوکل کہا۔ یہ صفاتی نام دنیا میں ادنیٰ مناسبت پر دے دیے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی تو بندے میں ان کی حقیقت بھی موجود نہیں ہوتی لیکن اللہ کا ضابطہ یہ

نہیں۔ وہاں صفاتی ناموں سے وہی سرفراز ہوتا ہے جس میں ان کی حقیقت پائی جاتی ہو۔ جہاں حقیقت موجود نہیں وہاں اسے پانے کی شرط رکھ دی جاتی ہے۔ جو وہ شرط پوری کرے گا اس پر وہ نام صادق آئے گا اور اذا فات الشرط فات المشروط کے قاعدے سے شرط گئی تو مشروط بھی گیا۔

مثال کے طور پر اسماعیل، ادریس، اور ذوالکفل علیہم السلام کا ذکر خیر کرتے ہوئے فرمایا

كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ۔ یہ تینوں صابرین میں سے تھے۔

اور مومنوں کے لئے فرمایا

وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ۔ اور خوشخبری سنا دیجئے ان صبر کرنے والوں کو کہ جب پہنچے ان کو کچھ مصیبت تو کہیں ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔ (البقرۃ)

انبیاء تو کسی شرط کے بغیر صابر ہیں اور امت میں سے وہ فرد صابر ہے جو مذکورہ عمل کرے۔ رحمت دو عالم ﷺ کے بارے میں اللہ نے ارشاد فرمایا۔

وَدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ۔ اللہ کے اذن سے اس کی طرف بلانے والے

اور امت کیلئے فرمایا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ۔ اور اس سے بہتر کس کی بات جس نے بلایا اللہ کی طرف یہاں اسم فاعل داعی استعمال نہ فرمایا۔ جس سے مستنبط ہوتا ہے جو لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا رہا وہ داعی ہے۔ جب بلانا ترک کر دیا تو اس صفت سے موصوف بھی نہیں ہوگا۔ ان مثالوں سے بخوبی معلوم ہوتا ہے امت کا وہ فرد صابر یا داعی ہے جس نے صبر کی شرط پوری کی یا دعوت کا کام کیا۔ اس میں اس کی محنت اور جد وجہد کا دخل ہے۔ ان کو حاصل کرنے میں بھی محنت کی ضرورت ہے اور برقرار رکھنے میں بھی محنت کی ضرورت ہے۔ اس کے برعکس انبیاء کیلئے کوئی شرط نہیں۔ وہ ہر وقت اور ہر حال میں صابر اور داعی ہیں۔ جب شرط کوئی نہیں تو محنت اور کوشش کا عمل دخل بھی نہیں۔ انبیاء کو یہ صفات اللہ نے محنت اور کسب کے بغیر عطا فرمائیں۔ ان کو یہ محاسن ابتداہی سے بدرجہ

کمال دیے گئے۔ کیونکہ اخلاقی صفات میں ارتقاء اسی وقت ہوتا ہے جب کسب ہو۔ اسی طرح رافت و رحمت بھی وہ صفات ہیں جو آپ کو بلا کسب بدرجہ کمال عطا کی گئیں۔

رافت و رحمت حد کمال تک

ان صفات سے آپ کو موصوف کرنا اس بات کی دلیل بھی ہے کہ رحمت دو عالم ﷺ میں یہ صفات کمال کے نقطہ انتہا تک ہیں۔ کمال کی وہ آخری حد جو کسی انسان کے لئے ممکن ہے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ ہر لفظ اور نام کی ایک حقیقت ہوتی ہے جس پر وہ دلالت کرتا ہے۔ خصوصاً صفاتی نام اسی وقت صادق آتے ہیں جب بندے میں ان کی حقیقت موجود ہو۔ جیسے رافت اور رحمت کی حقیقت غیر کو نقصان سے بچانے کی کوشش اور اس پر فضل و احسان کرنا ہے۔ چنگیز اور تیمور جیسے ظالم اور سفاک، خوں ریز اور بے رحم انسانوں کو شفیق اور مہربان نہیں کہہ سکتے۔ ممکن ہے کسی موقع پر کسی کے ساتھ انہوں ایسا معاملہ کیا ہو لیکن چند موقعوں کی وجہ سے ان صفات کو ان کی عادت اور خلق نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کی قابل ذکر حقیقت سے یہ ظالم خالی ہیں۔

اللہ انسان سے صرف اچھے عمل کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ احسن اور زیادہ اچھے عمل کا مطالبہ کرتا ہے۔ رافت و رحمت بھی عمل ہے۔ آپ کو یہ صفات عطا کرنا عطائے محض ہے جس میں آپکی محنت شامل نہیں۔ اللہ سے بعید ہے کہ مطالبہ تو احسن عمل کا کرے اور صفات وہ عطا فرمائے جن کی احسن حقیقت آپ میں موجود نہ ہو۔

پہلے ثابت ہو چکا ہے وہ بلا حقیقت کسی کو نام عطا نہیں کرتا۔ ان اسماء سے آپ ﷺ کو موسوم کرنے کا مطلب ہے ان کی بھرپور، کامل اور احسن حقیقت آپ میں پائی جاتی ہے۔ سارے ہی نبی رافت و رحمت کے حامل ہیں۔ ان کی رافت کے آثار اور رحمت کی علامات تو اللہ نے بتلائیں لیکن ان ناموں سے آپ کے علاوہ کسی کو موسوم نہیں کیا۔ کیونکہ ان صفات کے نقطہ انتہا پر صرف آپ ہی فائز ہیں۔ کسی ماں نے آپ سے زیادہ شفیق اور مہربان بیٹے کو جنم نہیں دیا۔ اللہ کی مخلوق میں محمد ﷺ سے زیادہ مہربان، شفیق، محسن اور منعم دوسرا کوئی نہیں۔ اس کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ کو رؤف اور رحیم کہہ کر اللہ نے خود آپ کی شفقتوں اور مہربانیوں کی گواہی دی۔

رافت و رحمت آپ ﷺ کا حال ہیں

آپ ﷺ کو رؤوف اور رحیم کہنا اس بات کی دلیل بھی ہے کہ رافت اور رحمت آپ ﷺ کا خلق اور عادت ہیں۔ یہ ایسی صفات نہیں جن کا کسی کسی موقعے پر ظہور ہوا ہو آپ ﷺ ہر وقت اور ہر حال میں شفیق اور مہربان ہیں

اس کی وضاحت یہ ہے کہ بندہ اخلاقی صفات سے اسی وقت موصوف ہو سکتا ہے جب ان کی معتدبہ حقیقت کا حامل ہو۔ اور اکثر ان صفات کے زیر اثر کام کرے۔ اسی کو خلق اور عادت کہتے ہیں۔ اور جہاں یہ اکثر نہیں سراسر حقیقت ہوں وہاں خلق سے بڑھ کر حال کا درجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ جہاں کسب اور محنت کا معاملہ ہو وہاں اس صفت کے زائل اور نفس سے مغلوب ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ جہاں خود خدا مربی ہو اور بلا کسب کمال عطا فرمائے وہاں ایک لمحے کے لئے بھی اس کا امکان نہیں کہ نبی نفس سے مغلوب ہو جائے۔ تمام انبیاء ہر اس خلق کے درجہ کمال پر فائز ہوتے ہیں جو جید اور عمدہ ہو۔ یہ اخلاق ان کا حال ہوتے ہیں۔ لہذا کسی نبی کے متعلق یہ کہنا کہ کسی موقع پر وہ نفس سے مغلوب ہو گئے یا بے صبری کی وجہ سے قبل از وقت اپنا مستقر چھوڑ دیا بہت بڑی جسارت، سطحی پن اور سطحی علم کی نشانی ہے۔

ایک اور بات بھی قابل وضاحت ہے کہ ایسی صفات کے لحاظ سے کسی کسی نبی کو نام دیے گئے ہر نبی کو نہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ مثلاً نوح کو عَبْدًا شَكُورًا ابراہیم کو حَلِیمٌ أَوَّاهٌ مُّنِیبٌ، ابراہیم اور ادریس دونوں کو صِدِّیقًا، اسماعیل ادریس ذوالکفل کو صابرین، اسماعیل کو صَادِقَ الْوَعْدِ، موسیٰ کو مُخْلَصًا اور کَرِیم، نوح اور لوط کو صالح، سلیمن اور ایوب کو اوّاب کہا

اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اخلاق میں کچھ نبی زیادہ امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نمایاں حیثیت کی وجہ سے انہیں ان ناموں سے پکارا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوسروں میں یہ صفات نہیں پائی جاتیں۔ رحمت دو عالم ﷺ کو اس لئے رؤوف اور رحیم کہا کہ ان دو صفات میں آپ ﷺ تمام انبیاء سے ممتاز ہیں۔ یہاں سے حضور علیہ الصلاۃ والسلام کی ایک اور فضیلت بھی کھل کر سامنے آتی ہے

مقام مصطفی ﷺ

وہ یہ کہ حضور ﷺ کو صرف انہی دو صفات میں امتیاز حاصل نہیں۔ آپ تمام عمدہ اخلاق میں تمام نبیوں سے ممتاز ہیں۔ کیونکہ رافت و رحمت بجا طور پر تمام محامد اور محاسن کی اساس ہیں۔ عمدہ اخلاق کا سرچشمہ ہیں۔ شفیق اور مہربان شخص شکر گذار بھی ہوگا۔ صابر اور صادق بھی ہوگا۔ عفیف اور پاک دامن بھی ہوگا۔ صالح اور طیب بھی ہوگا۔ مخلص اور خیر خواہ بھی ہوگا۔ محسن اور منعم بھی ہوگا۔ محبت کرنے والا اور درد دل رکھنے والا بھی ہوگا۔ حدود کا نگہ دار اور حقوق کا پاسبان بھی ہوگا۔ سخی اور کریم بھی ہوگا۔ جواد اور حلیم بھی ہوگا۔ جس کے پاس جواہرات کی کان ہو وہ ہیروں کی کٹوری کو کیا خاطر میں لائے گا؟ اور جس کے قبضے میں سمندر ہو اسے دریا پر فوقیت اور برتری کیوں نہیں ہوگی؟

اس کا ایک اور پہلو بھی قابل ملاحظہ ہے۔ قرآن میں پیغمبروں کی بہت سی صفات ذکر کی گئیں۔ اکثر صفات ان میں سے ایسی ہیں جنکا تاثر اور جن کی انفعالیت ان کی ذات پر قائم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر صابر شاکر حلیم منیب اواب وغیرہ۔ صابر کا صبر، شاکر کا شکر، حلیم کا حلم اور منیب کی انابت اپنی ذات کیلئے ہے۔ کچھ صفات ایسی ہیں جن کا مفعول غیر ہے اور فعل کا تاثر غیر پر ہوتا ہے۔ جیسے اواہ لوگوں کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرنے والا اور ان کے لئے دعائیں کرنے والا۔ رافت اور رحمت دونوں ایسی ہی صفات ہیں جن کا تاثر غیر پر ہوتا ہے۔ دوسروں کا غم کھانے والا۔ لوگوں کو نقصان اور تکلیف سے بچانے والا۔ ان کو فائدہ پہنچانے والا۔ یہ صفات پیغمبروں کی ذکر کی گئی تمام صفات پر مقدم ہیں۔ وہ ساری صفتیں انہی کی فرع اور شاخ ہیں

ایک شبہے کا ازالہ

شاید کسی کو شبہ ہو اللہ کا نام سمیع اور بصیر بھی ہے وہی نام اللہ نے ہر انسان کو دیا اور فرمایا

فَجَعَلْنَٰهُ سَمِيعًۢا بَصِيرًا۔ پس بنا دیا ہم نے اسے سننے دیکھنے والا۔

تو حضور ﷺ کی کیا خصوصیت رہی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ وصف بمنزلہ ذات کے ہے۔ سماعت و بصارت کا انسان کی سیرت اور اخلاق سے کوئی تعلق نہیں۔ جب کہ یہ نام آپ کے کردار کی دلکشی، سیرت کی عظمت اور اخلاق کی بلندی کا مظہر ہیں۔ پھر یہ اوصاف انسانوں میں سے کسی مخصوص فرد

کیلئے نہیں۔ تمام ہی انسان یہاں تک کے جانور بھی اس میں شریک ہیں۔ جب کہ ان دو ناموں سے اللہ نے صرف حضور ﷺ ہی کو مخصوص فرمایا ہے۔

رافت کو مقدم کرنے کی وجہ

آپ ﷺ کو رؤوف پہلے اور رحیم بعد میں کہا گیا۔ اس کی حکمت مفسرین کرام میں سے علامہ آلوسی نے یہ بیان فرمائی۔

وقد يقال تقديم الرافة باعتبار ان اثارها دفع المضار وتاخير الرحمة باعتبار ان اثارها جلب المنافع و الاول اهم من الثاني۔

اور کہا گیا رافت اس لئے مقدم ہے کہ اس کا اثر تکلیف دور کرنا ہے۔ اور رحمت اس لحاظ سے موخر ہے کہ اس کی نشانی فائدہ کمانا ہے۔ اور پہلی بات دوسری سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ (روح المعانی۔ التوبہ۔ ۱۲۸)

حضور ﷺ اس برتر مقام کے باوجود اللہ کی مخلوق ہیں۔ اس لئے آپ کی صفات بھی مخلوق ہیں۔ جو اگر چہ مخلوق کی نسبت سے تام، اکمل اور اعلیٰ ہیں لیکن اللہ کی نسبت سے ناقص اور ادنیٰ ہیں۔ کیونکہ اللہ کی صفات کی کوئی حد و انتہاء نہیں۔ اس لئے آپ کی صفات کو مومنین کے ساتھ مخصوص فرمایا۔ اللہ کی رافت و رحمت تمام لوگوں کیلئے ہے۔ آپ کی شفقت اور رحمت اہل ایمان کیلئے ہے۔ اس لئے علامہ اسماعیل حقی نے فرمایا۔

ان النبي صلى الله عليه وسلم لما كان مخلوقا كانت رافته و رحمته مخلوقة فصارت مخصوصة بالمومنين لضعف الخلقة ۔ وان الله تعالى لما كان خالقا كانت رافته و رحمته قديمة فكانت عامة للناس لقوة خالقيته (التوبہ۔ ۱۲۸)

بے شک جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق ہیں تو آپ کی رافت اور رحمت بھی مخلوق ہیں۔ پس خلقی کمزوری کی وجہ سے وہ مومنین کیلئے مخصوص ہوگئی۔ اور اللہ جب خالق ہے تو اس کی رافت اور رحمت بھی ازلی ابدی ہے۔ پس خالق ہونے کی وجہ سے تمام لوگوں کیلئے عام ہے

رحمت کو عام اور خاص کرنے کی وجہ

ایک جگہ اللہ نے آپ ﷺ کی رحمت کا عموم ذکر فرمایا۔

وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۔ ہم نے عالمین کے لئے آپ کو رحمت بنا کر بھیجا

اس جگہ سورۃ التوبۃ میں وہ ترتیب اختیار کی جس سے رافت اور رحمت مومنین کیلئے ہی مخصوص ہوگئی۔ جیسا کہ امام رازیؒ نے فرمایا۔ اس لئے بعض مفسرین نے عالمین کی تفسیر مومنین سے فرمائی۔ تو کیا آپ ﷺ کی رحمت عام نہیں؟ اور آپ صرف اہل ایمان کیلئے ہی رحیم ہیں۔ اس کے جواب میں بعض مفسرین فرماتے ہیں۔

عام رحمت سب کیلئے ہے۔ مومنین کے ساتھ جو رحمت مخصوص ہے وہ خاص طرح کی رحمت ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ معین الدینؒ نے فرمایا

واما الرحمة المضمومة الى الرافة فخاصة بالمومنين

مومنین کیلئے وہ رحمت مخصوص ہے جس میں رافت بھی شامل ہے۔ (النیشاپوری، التوبہ۔ ۱۲۸)

اس کی وضاحت دو مثالوں سے ہوگی۔

سورج منبع نور ہے۔ اس سے چاند بھی منور ہوتا ہے۔ زمین بھی فیض یاب ہوتی ہے۔ اس سے کہیں زیادہ روشنی چاروں طرف خلا میں پھیلتی ہے۔ کیونکہ یہ ایک کرہ ہے جو ہر طرف سے روشن اور زمین سے لاکھوں گنا بڑا ہے۔ زمین اس کی تمام روشنی نہیں سمیٹ سکتی۔ اگر اس کو فاعل بالارادہ فرض کیا جائے تو بالفعل وہ زمین کو ہی منور کرتا ہے منبع نور، کرہ اور بڑا ہونے کی وجہ سے دوسری چیزیں اس سے خود بخود روشن ہوتی چلی جاتی ہیں۔

ایک شخص کوئی چیز مثلاً الماری میں سے کوئی کتاب دیکھتا ہے۔ جس کتاب کو دیکھنے کا ارادہ ہے صرف وہی نظر نہیں آتی بلکہ اس کے دائیں بائیں کی دیگر بہت سی کتابیں بھی نظر آتی ہیں۔ مطلوبہ کتاب اگر چہ ایک ہی ہے لیکن نور نظر باقیوں کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔

رحمت عالم ﷺ مخزن رافت اور منبع رحمت ہیں۔ ہر کہ و مہ، ہر کس و ناکس بقدر ظرف اس سے فیض حاصل کرتا ہے۔ لیکن بالفعل رافت و رحمت صرف مومنین کیلئے ہے۔

سید الوسط ﷺ

حضور ﷺ کی امت کو اللہ نے امت وسط کہا۔ سبحان اللہ! یہ کیا فضیلت ہے جو آپ کی وجہ سے اللہ نے ہمیں عطا فرمائی۔ اور کیا اونچی شان ہے جو آپ کی بدولت ہمارا نصیبہ بنی۔ حضور ﷺ کی قدر و منزلت اور مقام اللہ کے ہاں کیا ہے؟ یہی فضیلت اس کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کو تو جو کچھ ملا ملا۔ آپ کے غلاموں کو بھی اللہ نے وہ کچھ عطا فرمایا جو پچھلی امتوں کے حاشیہ و ادراک میں بھی نہیں۔

محمد ﷺ کی امت تمام امتوں میں انتخاب۔ تمام امتوں میں بہترین۔ داعی الی اللہ۔ شہید اقوام۔ مرکز امم۔ ہمارا کیا منہ تھا جو اس کے دربار رحمت سے ہمیں شمہ رحمت بھی عطا ہو جاتا۔ یہ تو اسی کریم کا کرم اور حضور پرنور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صدقہ ہے۔ میرے حبیب محمد مصطفیٰ ﷺ کتنی رفعت و بلندی والے ہیں جنکی خاطر داری میں اللہ نے ان کے غلاموں کی شان بھی بڑھا دی۔ تمام امتوں میں ایک مرکزی مقام عطا فرمایا۔ اس مرکزیت کو بیان کرنے کے لئے اللہ رب العزت نے ایک عجیب اور منفرد لفظ استعمال کیا۔ وہ لفظ وسط ہے۔ ارشاد فرمایا

وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا اور اسی طرح ہم نے تمہیں معتدل امت بنایا۔

جس پیرائے میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں اس سیاق کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ تحویل قبلہ کا مرحلہ درپیش ہے۔ جس کی اہمیت پہلے ذکر کی جا چکی ہے۔ کسی بھی جہت میں ذاتی طور پر کوئی فضیلت نہیں مگر یہ کہ اللہ کسی سمت کو فضیلت عطا فرمادے۔ چنانچہ اپنے فضل و کرم سے جہت کعبہ کو اس نے فضیلت عطا فرمائی۔ اصل فضیلت جہت کی نہیں بلکہ خود کعبہ کی ہے۔ جہات اربعہ میں سے کسی جہت کو قبلہ بنایا جاتا تو اس سے ایسی صف بندی ہوتی جیسی فوج کی ہوتی ہے۔ بالکل سیدھی۔ ایک کے بعد ایک۔ کیونکہ یہ سمتیں ہر جگہ ایک ہی رخ پر ہیں۔ اس کے برعکس کعبہ کو قبلہ

بنانے سے دائرہ بنتا ہے جس کا مرکز کعبہ ہے پھر یہی جگہ زمین کا عین وسط اور مرکز بھی ہے۔ اسی سے زمین کو اطراف میں پھیلایا گیا۔ جس طرح مرکز زمین کو اس نے مرکز عبادت بنا دیا اسی طرح امتوں میں تمہیں بھی مرکز امم بنا دیا۔ کذالک کا مفہوم بیان کرتے ہوئے امام رازی فرماتے ہیں۔

فھذہ الجھات بعد استوائھا فی کونھا ملکا للہ و ملکا لہ خص بعضھا بمزید التشریف والتکریم بان جعلہ قبلۃ فضلا منہ واحسانا فکذالک کلھم مشترکون فی العبودیۃ الا انہ خص ھذہ الامۃ بمزید الفضل والعبادۃ فضلا منہ واحسانا لا وجوبا	پس بننے کے بعد یہ سمتیں اللہ کی سلطنت اور ملکیت میں داخل ہیں۔ جہت کعبہ کو اس نے مزید شرف اور کرامت سے نوازا اس طرح کہ اپنے فضل واحسان سے اسے قبلہ بنایا۔ اسی طرح سب امتیں بھی عبودیت میں مشترک ہیں مگر اس امت کو مزید فضیلت وعبادت سے نوازا۔ یہ اس کا فضل واحسان ہے اس پر واجب نہیں۔ (البقرۃ۔۱۴۳)

جعلنا کم میں جمع کی ضمیر (نا) عظمت پر دلالت کر رہی ہے۔ ضمیر مخاطب (کم) سے براہ راست خطاب کا فائدہ ہو رہا ہے۔ عظیم ترین حقیقی شہنشاہ ہمیں براہ راست مخاطب کر کے ہمارے فضل و شرف کا اعلان کر رہا ہے۔ اور شرف بھی ایسا جو بالفعل اس امت کو حاصل ہو چکا ہے۔ یہ نہیں کہ مستقبل میں حاصل ہوگا۔ روح المعانی میں ہے۔

بان جعلنا کم یقتضی لحقق العدالۃ بالفعل واستعمال الماضی بمعنی المضارع خلاف الظاھر	اس طرح کہ جعلنا کم بالفعل تحقق عدالت کا تقاضا کرتا ہے۔ اور ماضی کو مضارع کے معنی میں استعمال کرنا خلاف ظاہر ہے۔ (الوسی۔ البقرۃ۔۱۴۳)

سرسری نظر میں قاریٔ قرآن کو وسط ہونے میں کوئی خاص شرف معلوم نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ عدل کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے۔ یہ امت چونکہ گواہ ہے اس لئے عادل ہے۔ فضیلت اگر معلوم بھی ہو تو شہادت کی معلوم ہوتی ہے۔ مگر شہادت سے قطع نظر بجائے خود یہ بہت بڑا شرف ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے قرآنی معارف کے سمندر میں اترنے کی ضرورت ہے۔ فکر کی بلندی اور تدبر کی گہرائی سے ہی اس کمال کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جب تک وسط کے بارے میں جان کاری نہ ہو

جب تک اس سیپ میں پوشیدہ موتیوں کی نقاب کشائی نہیں ہو سکتی۔

وسط کا معنی

دو کناروں کے عین درمیان کو وسط کہتے ہیں۔ تفسیر بیضاوی میں ہے

هو فى الاصل اسم للمكان الذى تستوى اليه المساحة من الجوانب

وسط اصل میں اس جگہ کا نام ہے کہ ہر طرف سے جسکی مساحت برابر ہو۔ (البقرہ۔۱۴۳)

وسط کا لفظ ایک تو سین کے زبر کے ساتھ آتا ہے جو یہی ہے جس کی بات ہو رہی ہے۔ دوسرا سین کے سکون کے ساتھ آتا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ وسط تو عین درمیان کو کہتے ہیں اور وسط دو کناروں کے درمیان کسی بھی جگہ کو۔ نظم الدرر میں محمد بن عمر البقاعی فرماتے ہیں

والوسط بالتحريك اسم لعين ما بين طرفى الشىء كمركز الدائرة ـ وبالسكون اسم مبهم لداخل الدائرة مثلا

وسط دو کناروں کے بالکل درمیان کو کہتے ہیں جیسے دائرہ کا مرکز۔ اور وسط مبہم ہے دائرے کے درمیان کسی بھی جگہ کو وسط کہتے ہیں۔ (البقرہ۔۱۴۳)

وسط کے استعمالات

وسط کا لفظ بنیادی طور پر جمادات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تفسیر کبیر میں ہے۔

ان لفظ الوسط يستعمل فى الجمادات

یقیناً وسط کا لفظ جمادات کے لئے مستعمل ہے۔

عمدہ اور جید اخلاق چونکہ دو مذموم اخلاق کے درمیان ہوتے ہیں۔ لہذا رفتہ رفتہ اچھے اخلاق کے لئے بھی استعمال ہونے لگا۔

ثم استعير للخصال المحمودة لوقوعها بين طرفى افراط وتفريط كالجود بين الاسراف والبخل والشجاعة بين التهور والجبن (بیضاوی)

پھر پسندیدہ عادتوں کے لئے مستعار لیا گیا۔ کیونکہ وہ افراط و تفریط کے دو کناروں کے درمیان ہوتی ہیں جیسے سخاوت اسراف اور بخل کے درمیان اور شجاعت بے باکی اور بزدلی کے درمیان ہوتی ہے۔

پھر اس شخص پر اس کا اطلاق ہونے لگا جو ان عمدہ صفات سے موصوف ہو۔ صاحب اخلاق کو وسط کہنے لگے۔

ثم اطلق على المتصف بها اطلاق الحال على المحل

پھر ان صفات کے متصف پر بولا گیا۔ جو حال کا محل پر اطلاق ہے (الوسی۔ بقرۃ۔۱۴۳)

درمیانی صفات ہی بہترین ہوتی ہیں اور ان کا حامل معتدل ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے وسط میانہ رو کو کہتے ہیں

الوسط بالتحريك المعتدل

وسط کا معنی ہے اعتدال والا (مصباح المنیر)

جو شخص ان اعلیٰ اخلاق سے متصف اور عمدہ خصلتوں سے مزین ہو وہ یقیناً معاشرے کا ذی عزت، بلند رتبہ اور صاحب فضیلت شخص ہوگا۔ اس لحاظ سے ہر ذی عزت شخص بلکہ ہر اعلیٰ اور بہترین شے کو وسط کہا جانے لگا۔

ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

واما الوسط فانه فى كلام العرب الخيار

اور رہا وسط تو کلام عرب میں بہترین کو کہتے ہیں۔

عماد الدین ابن کثیر کا ارشاد ہے۔

كما يقال قريش اوسط العرب نسبا ودارا اى خيرها

جیسے کہا جاتا ہے قریش نسب اور گھر کے لحاظ سے اوسط یعنی بہترین ہیں۔

لسان العرب میں ہے۔

أن اوسط الشىء أفضله وخياره كوسط المرعى خير من طرفيه وكوسط الدابة للركوب خير من طرفيها لتمكن الراكب

بے شک کسی چیز کا درمیان ہی افضل اور بہتر ہوتا ہے۔ جیسے چراگاہ کا درمیان اطراف سے بہتر اور سواری کے لئے جانور کا درمیان کناروں سے بہتر ہوتا ہے تاکہ سوار قرار پکڑ لے

وسط کی بہترین مثال دائرے کا مرکز ہے جس کی ہر طرف سے پیمائش برابر ہوتی ہے۔ ہر طرف سے پیمائش مساوی ہونے سے ایک اور مفہوم ماخوذ ہوتا ہے وہ برابری یعنی عدل کا ہے۔

وسط اور عدل

عدل کا لغوی معنی ہیں برابر کرنا۔ اور یہ جور کی ضد ہے۔ ابن عاشور میں ہے۔

العدل ضد الجور وھو فی اللغۃ التسویۃ (النساء ۵۸)

عدل جور کی ضد ہے اور عدل لغت میں برابری کو کہتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں

اور ابن عربی نے فرمایا کہ لفظ عدل کے اصل معنی برابر کرنے کے ہیں۔ پھر مختلف نسبتوں سے اس کا مفہوم مختلف ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن۔ النحل۔ ۹۰)

مفردات راغب کتاب العین میں ہے

فان العدل ھو المساواۃ فی المکافاۃ ان خیرا فخیر وان شرا فشر

پس عدل بدلے میں برابری کا نام ہے۔ خیر کا بدلہ خیر اور شر کا بدلہ شر

مختلف نسبتوں سے اس کے مختلف مفاہیم بنتے ہیں مثلاً قیمت، عوض، بدلہ، فدیہ، انصاف، مثیل، نظیر وغیرہ اور ہر ایک میں برابری کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ عدل اگرچہ مصدر ہے مگر یہ عادل کے معنی بھی دیتا ہے۔ اللہ کے نام العدل کا ذکر کرنے کے بعد ابن اثیر فرماتے ہیں

وھو فی الاصل مصدر سمی بہ فوضع موضع العادل (النھایہ)

اور اصل میں یہ مصدر ہے۔ جس سے اسے موسوم کیا گیا۔ اور اسے عادل کی جگہ رکھا گیا۔

عادل کا معنی ہے برابری کرنے والا۔ جو کسی ایک جانب میلان اور جھکاؤ نہ رکھتا ہو۔ جانب داری سے پاک ہو۔ معاملات و معاشرات اور اقتصاد میں میانہ رو ہو۔ وصف عدالت سے موصوف ہو۔ علم الاخلاق کی رو سے عدالت کیا ہے؟ شیخ محمد اعلیٰ تھانوی کشاف اصطلاحات الفنون میں فرماتے ہیں۔

ھی التوسط بین الافراط و التفریط وھی مرکبۃ من الحکمۃ و العفۃ و الشجاعۃ

عدالت افراط و تفریط کے درمیان توسط کا نام ہے جو حکمت عفت اور شجاعت سے مرکب ہے۔

اور از روئے شرع

ھی ملکۃ فی النفس تمنعھا من اقتراف الکبائر و الاصرار علی الصغائر وعن — عدالت نفس کا ایک ملکہ ہے جو کبیرہ گناہوں کے ساتھ اتصال، صغیرہ گناہوں پر اصرار اور گھٹیا

الرذائل المباحۃ (۔۳۔۲۷۹) — مباحات سے روکتا ہے۔

پس عادل وہ ہوا جو توسط اور اعتدال والا ہو۔ اعتدال کہتے ہیں

توسط حال بین حالین فی کم او کیف

دو حالتوں میں سے درمیانی حالت کمیت میں ہو یا کیفیت میں (لسان العرب)

اسی سے معتدل ہے جو معنوی، حسی انسانی اور غیر انسانی صفات کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں

والعدل ھو المعتدل الذی لا یمیل الی احد الطرفین (بقرۃ۔ ۱۴۳)

اور عادل اعتدال والا ہے جو دو کناروں میں سے کسی ایک طرف میلان نہیں رکھتا

صاحب عدل شخص منتخب، قابل اعتماد، ثقہ اور قابل شہادت ہوتا ہے اس لئے آپ نے اس کی تفسیر عدل سے فرمائی۔

روی الترمذی عن ابی سعید الخدری عن النبی ﷺ فی قولہ تعالیٰ و کذالک جعلناکم امۃ وسطا قال عدلا

ترمذی نے ابو سعید خدری ﷺ سے روایت کی نبی ﷺ نے امت وسطا کی تفسیر میں فرمایا عدل والی (قرطبی)

ایک سوال

وسط کا معنی اگر عدل ہی تھا تو وسط کا لفظ لانے کی ضرورت کیا تھی؟

قران کا ہر لفظ منتخب اور چنا ہوا ہے۔ قران میں جو لفظ جس جگہ، جیسے استعمال ہوا وہ وہاں اسی طرح آنا چاہئے تھا۔ کسی انسان کے پاس ایسا لفظ نہیں جو اس سے بہتر ہو اور اسے وہاں رکھا جا سکے۔ یہ ممکن ہی نہیں۔ قران میں ایک نقطہ بھی ایسا نہیں جس پر انگلی رکھی جا سکے۔ شک اور ریب وہاں راہ پا سکے۔ بالخصوص وہ الفاظ جو کہ آپ اور آپ ﷺ کی امت کی شان میں وارد ہوئے ان کا تو رنگ ہی اور ہے۔ حق یہ ہے کہ وسط کے استعمال میں خاص حکمت ہے۔ اس سے امت محمد کی کئی شانیں ظاہر ہوتی ہیں۔ مرکزیت کا مفہوم اس کے سوا کسی اور لفظ سے ظاہر نہیں ہوتا۔ وسط عین برابری کو کہتے ہیں اور عدل برابر کرنے کے معنوں میں آتا ہے اگرچہ فی الواقع برابری نہ پائی جائے۔ اس

لئے کبھی قبیح اور برے معانی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ جیسے فرمایا

ثُمَّ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ وہ اوروں کو اپنے رب کے برابر کرتے ہیں

یعنی شرک کرتے ہیں اس وجہ سے عادل مشرک کو بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح کا ایک لفظ قصد ہے

القصد هو الوسط بين الطرفين قصد دو کناروں کے درمیان کو کہتے ہیں

یہ کبھی اچھی اور بری دو چیزوں کے لئے بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ سورۃ فاطر میں فرمایا

فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهِ وَمِنْهُم مُّقْتَصِدٌ وَمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرَاتِ

کوئی ان میں اپنی جان کا برا کرتا ہے اور کوئی ان میں بیچ کی چال پر ہے۔ اور کوئی ان میں خوبیاں لیکر آگے بڑھ گیا ہے۔

اس طرح کے اور بھی کئی الفاظ ہیں لیکن ہر ایک میں کوئی نہ کوئی علت ہے۔ مدح اور تعریف کے مقام پر ایسے الفاظ کا استعمال مناسب نہ تھا جن میں قبیح معانی کا احتمال موجود ہو۔ البقاعی نے واضح کیا ہے کہ و س ط کے تمام مادوں میں عمدگی اور جودت کے معانی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے ابن عاشور نے یہاں مذکورہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا

فقوله ثم قرأ يدل على ان هذه الشهادة من جملة معنى الاية لا انها عين معنى الاية

پس ان کا قول ثم قرأ دلالت کرتا ہے کہ شہادت کی یہ تفسیر آیت کا من جملہ معنی ہے نہ کہ عین آیت کا اسی سے معلوم ہوتا ہے وسط کی عدل سے تفسیر بھی من جملہ ہے۔ وسط کا اصل مفہوم تو مرکزیت کا ہے عدل، خیار، جودت، صیانت، عزت، علو وغیرہ اس کے لوازم ہیں

فمن اجل ذالك صار معنى النفاسة والعزة والخيار والصيانة من لوازم معنى الوسط

اسی وجہ سے نفاست، عزت، خیار اور حفاظت وسط کے معنی کو لازم ہو گئے (ابن عاشور)

ويلزم العدل الجودة اور عدل کے لئے عمدگی لازم ہے (البقاعی)

شان مصطفی ﷺ

بظاہر اس میں شان بھی امت کی ہے اور خطاب بھی امت کو ہے۔ حقیقت ایسے نہیں۔ پہلے مخاطب بھی آپ ہیں اور سب سے پہلے اس میں شان بھی آپ کی ہے۔ امت میں ہر خیر پیغمبر سے آتی

ہے۔ امت کو جو فضیلت ملتی ہے نبی اس میں پہلے داخل ہے لیکن نبی کو ملنے والی فضیلت میں امت کی شمولیت ضروری نہیں۔ کیونکہ امت تابع اور پیغمبر متبوع ہے۔ امت کی فضیلت پیغمبر کا شرف ہے جیسے شاگرد کا کمال استاد کا اعزاز ہے۔ پس امت اگر وسط ہے تو پیغمبر سید الوسط ہیں۔ البتہ یہ واضح رہے کہ وسط میں جو شان رسول اللہ ﷺ کی ہوگی وہ امت کی نہیں ہوگی۔ جیسے وصف شہادت دونوں کو حاصل ہے لیکن اس میں جو شان آپ کی ہے وہ امت کی نہیں۔ آپ کی شان وسط امت سے جدا اور منفرد ہے باوجود اس کے کہ امت کو جو کچھ ملا ہے آپ کو وہ بھی علی وجہ الکمال حاصل ہے۔ امت کا توسط دین کی وجہ سے ہے۔ پیغمبر کا وسط ہونا دین کی وجہ سے نہیں۔ کیونکہ پیغمبر کے اعمال و اخلاق تو خود دین ہوتے ہیں۔ اگر دین کے سبب مانا جائے تو لازم آئے گا پیغمبر کے اخلاق و اوصاف وہبی نہیں کسبی ہوتے ہیں۔ دین اور پیغمبر لازم و ملزوم ہوتے ہیں۔ پیغمبر کی جبلت اور طبیعت خود اسی بات کا تقاضا کرتی ہے جو اللہ کی منشا اور مراد ہے۔ فلنولينك قبلة ترضها سے یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ رہا یہ کہ بعض جگہ جہاں وحی نہیں آئی آپ نے کسی ایسے پہلو کو اختیار فرمالیا جو اللہ کی منشا نہیں تھی تو اس پر اگلے کسی عنوان کے تحت بات ہوگی۔ ابھی وسط ہونے میں آپ ﷺ کی شان بیان ہوگی۔ اس میں امت کا کمال الگ سے بیان ہوگا۔

آپ ﷺ صاحب عدل ہیں

وسط اور عدل کی تفصیل اور نسبت واضح کی جا چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا آپ عادل ہیں۔ عادل وہ ہوتا ہے جو وصف عدالت سے موصوف ہو۔ عدالت کوئی محسوس چیز نہیں ایک صفت اور ملکہ ہے۔ آثار سے جس کا اظہار ہوتا ہے۔ اللہ نے انسان میں تین قوتیں رکھی ہیں۔ قوت عقل۔ قوت شہوت۔ قوت غضب۔ یہ قوتیں تمام اخلاق کی جڑ ہیں۔ ان میں افراط و تفریط سے برے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور ان کے اعتدال سے اچھے اخلاق جنم لیتے ہیں۔ عدالت ان کے کمال کا نام ہے۔ علامہ آلوسی اس مقام پر وسط برائے مدح کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

لانه العدالة التي هي كمال القوة العقلية والشهوية والغضبية (الوسی)

کیونکہ عدالت قوت عقل، قوت شہوت اور قوت غضب کے کمال کا نام ہے۔

ان کا کمال یہ ہے کہ یہ افراط وتفریط اور کمی بیشی سے پاک ہوں۔ معتدل اور عین درمیان میں واقع ہوں مثلاً بخل اور فضول خرچی کا نقطہ اعتدال سخاوت ہے۔ شجاعت بزدلی اور بے باکی کے وسط میں ہوتی ہے۔ رحمت اور قساوت کے درمیان عدالت ہے۔ جُربُزہ (دھوکہ بازی) اور بلادت (بیوقوفی) کا وسط حکمت ہے۔ فجور اور جمود کا اعتدال عفت ہے۔

ظاہر ہے اخلاق کی جڑیں معتدل ہوں گی تو ان سے پھوٹنے والی شاخیں بھی معتدل ہوں گی۔ اخلاق میں معتدل شخص گناہوں سے نفور اور رذائل سے دور ہوگا۔ پھر جو شخص ان قوتوں میں جتنا کامل ہوگا اس کے اخلاق اتنے ہی اعلیٰ اور صفت عدالت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ آپ ﷺ میں یہ تینوں قوتیں اتنی کامل ہیں کہ ان سے آگے انسان کے لئے کوئی درجہ کمال ممکن ہی نہیں۔ لہذا آپ کی شان عدالت بھی سب سے اکمل ہے۔ اتنی کامل کہ اسے کسی تزکیے اور گواہ کی ضرورت بھی نہیں۔ امت تو امت ہی ہے روز قیامت تمام انبیاء پر بھی شہادت گذاری جائے گی لیکن صفت عدالت میں آپ کا درجہ اتنا بلند ہے کہ آپ کی گواہی پر کسی تزکیے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ وفور عدالت کی وجہ سے آپ ہر پہلو سے کامل ومکمل اور خلق عظیم کے مقام پر فائز ہیں۔ پیغمبر عدالت میں اسی رسوخ کی وجہ سے ہی معصوم، ہر گناہ سے پاک اور ہر رذیلے سے منزہ ہوتے ہیں۔ لغت میں عدالت استقامت یعنی مضبوطی پائیداری اور ثابت قدمی کو کہتے ہیں۔ کشاف اصطلاحات الفنون میں ہے وھی متفاوتۃ والقصاھاان یستقیم کما استقامت میں درجات ہیں۔ انتہائی درجہ بمطابق حکم امر وھی لاتوجدالا فی النبی ﷺ (۴۹/۳) ڈٹ جانے کا ہے اور یہ نبی ﷺ کے سوا کسی کو حاصل نہیں

آپ ﷺ خوب سیرت ہیں

سیرت انسان کے قول وفعل کا نام ہے۔ اقوال واعمال اچھے ہوئے تو سیرت حسین ہوگی۔ برے ہوئے تو بری ہوگی۔ قول وفعل اخلاق کے تابع ہوتے ہیں۔ جیسے اخلاق ہوتے ہیں ویسے ہی اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اخلاق سیرت کا کھرا کھوٹا پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ جس کے اخلاق حسین اس کی سیرت بھی حسین۔ قوائے ثلاثہ کے اعتدال سے عمدہ اخلاق کے تین اصول پیدا ہوتے ہیں۔ قوت عقل کے اعتدال سے حکمت، قوت شہوت کے اعتدال سے عفت اور قوت غضب کے

اعتدال سے شجاعت پیدا ہوتی ہے۔ یہ تینوں قوائے ثلاثہ کا نقطہ کمال ہیں۔ حکمت، عفت اور شجاعت عمدہ اخلاق کا سرچشمہ ہیں۔ آپ اس سرچشمے کے بھی عین وسط میں کھڑے ہیں۔ اس لئے آپ سیرت میں سب سے زیادہ حسین اور اخلاق میں سب سے زیادہ معتدل ہیں۔ حکمت، عفت اور شجاعت میں کوئی آپ کا ثانی نہیں۔ آپ کا ہر خلق معتدل اور کامل ہے۔ کتب سیرت وسوانح اور کتب حدیث سے بخوبی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔

آپ ﷺ خوبصورت ہیں

حسن سیرت میں اگر کوئی آپ کا ثانی نہیں تو حسن صورت میں بھی کوئی آپ کی نظیر نہیں۔ سیرت میں احسن ہیں تو صورت میں بھی بے مثال ہیں۔ تمام مخلوقات میں آپ حسین ترین ہیں۔ جملہ انسانوں کی تقویم جب احسن ہے تو جو انسان سب سے اعلیٰ ہے اس کی تقویم کتنی احسن ہوگی۔ اللہ نے ہر انسان کا تسویہ وتعدیل کی تو جو خلاصہ موجودات ہے اس کی تعدیل میں کیا انتہا ہوگی۔ وسط عین مرکز کو کہتے ہیں۔ یہ صرف معنوی صفات کے لئے استعمال نہیں ہوتا جیسا کہ واضح ہو چکا ہے۔ آپ من کل الوجوہ وسط ہیں۔ آپ کے خصائل وشمائل وسط، آپ کا مرکز وسط، آپ کا دین وسط، آپ کی کتاب وسط، آپ کا زمانہ وسط، آپ کی امت وسط، آپ کا قبلہ وسط۔ اور جو چیز وسط ہو وہ عمدہ ترین ہوتی ہے اخلاق وعادات ہوں یا کچھ اور۔ تفسیر الثعالبی میں ہے

والوسط الخیار والاعلی من الشیء وواسطۃ القلادۃ انفس حجرفیھا

اور وسط چیز کے بہتر اور اعلیٰ حصے کو کہتے ہیں۔ ہار کا درمیانی پتھر زیادہ نفیس ہوتا ہے۔ (بقرۃ۔۱۴۳)

مفسر البقاعی نظم الدرر میں فرماتے ہیں

تدور علی العدل السواء الذی نسبتہ الی کل جانب علی التساوی۔ ویلازم الاعلی من غیرہ (بقرۃ۔۱۴۳)	وسط برابری پر ہی گھومتا اور دائر رہتا ہے جس کی نسبت ہر جانب سے مساوی ہوتی ہے۔ اور لازم ہے کہ اپنے غیر سے اعلیٰ ہو۔

آپ ﷺ شکل وشباہت، قد وقامت، رنگ روپ اور تناسب اعضاء میں بھی سب سے اعلیٰ، سب سے حسین اور سب سے خوبصورت ہیں۔ حدیث میں آتا ہے۔

عن انس ابن مالك انه سمعه يقول كان رسول الله ليس بالطويل البائن ولا بالقصير ولا بالابيض الامهق ولا بالادم ولا بالجعد القطط ولا بالسبط	حضرت انس بن مالک فرماتے ہیں حضور ﷺ نہ بہت بلند قامت تھے نہ کوتاہ قامت، نہ رنگ مبارک چونے کی طرح سفید تھا نہ بالکل گندمی، بال مبارک نہ بالکل سیدھے تھے نہ بالکل پیچدار (شمائل ترمذی)

حضرت حسان بن ثابتؓ نے کیا خوب کہا تھا

واحسن منک لم ترقط عینی — واجمل منک لم تلد النساءُ

اور آپ سے حسین میری آنکھوں نے نہیں دیکھا اور آپ سے جمیل کسی عورت نے نہیں جنا

خلقت مبرء من کل عیب — کانک قد خلقت کما تشاءُ

ہر عیب سے آپ ایسے پاک پیدا کیے گئے گویا کہ آپ کو آپ کی منشا کے مطابق تخلیق کیا گیا

آپ ﷺ عالی نسب ہیں

اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ حسب ونسب میں بھی بلند رتبہ اور عالی ہیں۔ فرمایا

لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ — آیا ہے تمہارے پاس رسول تم میں کا (التوبۃ۔۱۲۸)

اس کی ایک قرأت اَنْفَسِكُمْ سین کے زبر سے ہے۔ تفسیر روح المعانی میں ہے۔

افعل تفضیل من النفاسۃ والمراد الشرف فھو ﷺ من اشرف العرب (توبۃ۔۱۲۷)

نفاست سے تفضیل کا صیغہ ہے۔ اور مراد شرف ہے پس آپ عرب میں سب سے اشرف ہیں۔

اسی تفسیر میں علامہ الوسی فرماتے ہیں۔

قال رسول الله ان الله تعالى اصطفى من ولد ابراهيم اسماعيل واصطفى من ولد اسماعيل بنی کنانه واصطفى من بنی کنانة قريشا واصطفى من قريش بنی هاشم و اصطفانی من بنی هاشم	رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بیشک اللہ تعالیٰ نے اولاد ابراہیم سے اسماعیل کو اولاد اسماعیل سے بنی کنانہ کو، بنی کنانہ سے قریش کو قریش سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں سے مجھے منتخب فرمایا (التوبۃ۔۱۲۸)

نہایہ ابن اثیر میں ہے

انه کان من اوسط قومه ای من اشرفهم واحسبهم

آپ قوم میں اوسط تھے یعنی بلند مرتبہ اور عالی نسب تھے۔

آپ ﷺ سید الانبیاء ہیں

امت حلقہ امم کا مرکز ہے اور آپ ﷺ حلقہ انبیاء کا مرکز ہیں۔ امت امتوں میں انتخاب اور نبی نبیوں میں انتخاب ہے۔ جب آپ کی امت وسط ہے تو لازم ہے کہ آپ انبیاء میں وسط ہوں۔ نبی تو ہر ایک وسط ہے بذات خود بھی اور باعتبار امت بھی۔ آپ کی امت کو وسط کہہ کر مجموعہ امت کو وہ مقام دیا گیا جو نبی کا ہوتا ہے۔ جب امت امتوں میں وسط ہے تو آپ انبیاء کے مقابلے میں وسط ہوں گے۔ امت میں وسط ہونا وَسَطًا کی دلالت اور انبیاء میں آپ ﷺ کا وسط ہونا اس کا اشارہ ہے۔ پھر آپ ﷺ کے تمام کمالات بھی اس کی دلیل ہیں۔ جو وسط ہو وہ ہی ذی عزت، منتخب اور سردار ہوتا ہے۔ پس آپ ﷺ تمام انبیاء کے سردار اور سید الاوساط ہیں۔ سید اور سردار کے مقابلے میں باقی تمام مطیع اور تابع ہوتے ہیں۔ اور نبی کی اطاعت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی نبوت پر ایمان لایا جائے۔ سب انبیاء آپ ﷺ کی نبوت کے مقر اور آپ ﷺ کے حلقہ نبوت میں داخل ہیں۔

آپ ﷺ اول المخلوقات ہیں

وسط ہونا یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ آپ ﷺ کی تخلیق تمام مخلوقات سے مقدم ہے اللہ نے آپ کو تمام مخلوق سے پہلے پیدا فرمایا۔ کیونکہ وسط عین مرکز کو کہتے ہیں۔ جس کی مثال دائرے کے مرکز سے دی جاتی ہے۔ کسی بھی چیز کا مرکز اور اصل پہلے وجود میں آتی ہے۔ جیسے دائرہ لگائیں تو مرکز پہلے بنے گا اور ظاہر اس وقت ہوگا جب دائرے کی تکمیل کے بعد پرکار اٹھائی جائے گی۔ یا جیسے کعبہ کا مقام زمین کا مرکز ہے تو اس کا وجود پہلے ہوا اور باقی زمین بعد میں اس سے پھیلائی گئی۔ اسی طرح جب آپ مرکز ہیں تو آپ کا وجود پہلے ہوگا اور باقی کائنات کا بعد میں۔

آپ ﷺ محور کائنات ہیں

وسط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ آپ ﷺ کائنات کا مرکز اور جہان کا محور ہیں۔ پوری کائنات آپ

کے گرد گھومتی ہے۔ ہم یہاں دیکھتے ہیں ہر چیز کا کوئی نہ کوئی مرکز ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ گھر، خاندان، قوم، قبیلے کا سربراہ ان کا مرکز۔ ایٹم کا مرکز۔ چاند، زمین، سورج کا مرکز۔ مجمع النجوم یعنی کہکشاؤں کا مرکز۔ کعبہ قبلۃ المسلمین مسلمانوں کا مرکز۔ بیت المعمور سدرہ کا مرکز۔ کرسی بردہ کا مرکز۔ عرش حاملین عرش کا مرکز۔ حق متلاشیان حق کا مرکز۔ پوری کائنات کا بھی کوئی مرکز ہونا چاہئے۔ ایک چیز کے مرکز مختلف اعتبارات سے مختلف ہو سکتے ہیں۔ مرکز ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ پیمائش اور مقدار کے لحاظ سے مرکز ہو۔ اصل اور بنیاد کے لحاظ سے مرکز ہو۔ فضیلت اور انتخاب کے لحاظ سے مرکز ہو۔ آپ ﷺ اصل اور فضیلت کے لحاظ سے کائنات کا مرکز ہیں۔ آپ کی ذات کائنات کا مرکز وجود ہے کہ آپ ﷺ کی وساطت سے مخلوق میں خلعت وجود تقسیم کی گئی۔ مرکز روحی آپ ﷺ کی ذات ہے کہ جہان میں روح اور زندگی آپ ﷺ کی وجہ سے ہے۔ مرکز روحانیت آپ ﷺ کی ذات ہے کہ سلسلہ ہائے نبوت آپ ﷺ کی وجہ سے شروع ہوا اور روحانیت آپ ﷺ کے در اقدس سے مخلوق کو ملی۔ آپ ﷺ مقصود کائنات ہیں۔

آپ ﷺ انفس اور اجود ہیں

وسط میں عمدگی اور جودت کا معنی پایا جاتا ہے۔ جو وسط ہوگا وہ عمدہ اور جید ہوگا۔ نفیس اور بیش قیمت ہوگا۔ نفاست کہتے ہیں کسی چیز کو عزیز سمجھنا اور دوسروں کے حق میں بخل کرنا۔ ظاہر ہے ایسی چیز کی قدر و قیمت ہوگی اور اس کی طرف رغبت بھی ہوگی اس لئے نفیس چیز وہ ہوتی ہے جو قیمتی ہو اور اس کی طرف رغبت ہو۔ انسان کی اصل قیمت اس کی سیرت کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ اللہ نے انسان میں انسانیت کا جوہر رکھا ہے اور اس کی وجہ سے تمام مخلوق پر اسے شرف عطا فرمایا ہے۔ حسن سیرت کا مطلب ہے صاحب سیرت نے اس جوہر کی پرداخت کی ہے۔ سیرت و اخلاق جتنے عمدہ اور اعلیٰ ہوں گے اس کی نفاست اتنی زیادہ ہوگی۔ آپ ﷺ کی سیرت سب سے اعلیٰ ہے۔ معرفت الٰہی میں آپ ﷺ کا مقام سب سے بلند ہے۔ آپ ﷺ کی ذات و صفات، طبع و مزاج، اوصاف و خصائل، عادات و شمائل سب نفیس ترین اور عمدہ ترین ہیں اس لئے آپ ﷺ کونین کی قیمتی ترین متاع ہیں۔

آپ ﷺ بہترین اور منتخب ہیں

وسط ہی کسی چیز کا عمدہ اور منتخب حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے کلام عرب میں وسط خیار سے کنایہ ہوتا ہے۔ مثالیں گذر چکی ہیں۔ ابن عاشور میں ہے

فاطلقوه على الخيار النفيس كناية انہوں نے خیار اور نفیس پر کنایۃ اس کا اطلاق کیا ہے۔

اپنے قرب خاص کے لئے اس نے آپ کو چنا۔ رنگا رنگ کمالات اور عمدہ ترین اعزازات کے لئے آپ کا انتخاب فرمایا۔ آپ کے کمالات مناقب اوصاف وغیرہ اس بات کی علامت ہیں کہ مخلوق خدا میں خدا کا خاص انتخاب ہیں۔ کوئی پہلو ایسا نہیں جس کی طرف سے آپ خیر الاخیار نہ ہوں۔ کہیں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کوئی داغ ہو۔ دھبہ ہو۔ کوئی انگلی رکھنے کی گنجائش ہو۔ مخلوق میں اعلیٰ سے اعلیٰ جس قدر و کمال کا تصور کیا جاسکتا ہے وہ آپ کے لئے ثابت ہے۔

آپ ﷺ قابل تعریف ہیں۔

جو چیز عمدہ ہو، بیش قیمت ہو، مرغوب الطبع ہو، نفیس ہو، منتخب اور بہترین ہو وہ کیسے قابل تعریف نہیں ہوگی۔ تعریف کمال و نوال پر ہوتی ہے۔ وسط ہونا جامع الکمالات ہے۔ جس میں کمالات کے سوا کچھ نہ ہو اور ہر کمال جوبن پر ہو وہ ہی مستحق تعریف ہوگا۔ اللہ کی مخلوق میں اعلیٰ ترین کمالات صرف آپ کو حاصل ہیں اس لئے آپ ﷺ ہی مخلوق میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل ہیں۔

آپ ﷺ بلند اور غالب ہیں

اللہ نے آپ کو غالب اور سربلند بنا کر بھیجا۔ غلبہ آپ کا نصیب اور بلندی آپ کا مقدر بنا دی گئی۔ کیونکہ غلبہ اور اقتدار اسی کے لئے ہے جو وسط ہو۔

ويلزم العدل الجودة ويلزم العلو الغلبة والسطوة والكثرة والشدة

عدل کو عمدگی اور علو کو غلبہ، اقتدار، کثرت اور شدت لازم ہے (البقاعی)

آپ جسمانی روحانی ہر اعتبار سے سب پر غالب ہیں۔ اللہ نے آپ کو جو دین عطا فرمایا وہ بھی غالب اور جو کتاب عطا فرمائی وہ بھی غالب ہے۔ آپ صاحب سطوت و شوکت ہیں۔ جلال و شکوہ اور رعب و ہیبت آپ کے جلو میں چلتے ہیں حدیث میں ہے

من راہ بدیھة هابه و — آپ کو جو شخص یکا یک دیکھتا مرعوب ہو جاتا تھا اور جو

من خالطه معرفة احبه — پہچان کے ملتا تھا آپ کو محبوب بنا لیتا تھا (شمائل ترمذی)

آپ کے دشمن سرنگوں اور مغلوب ہیں۔ جیسا کہ فرمایا

ان شانئك هو الابتر — بے شک تیرا دشمن ہی بے نام ونشان رہے گا۔

آپ ﷺ محفوظ ومصئون ہیں

اس میں اشارۃ ہے کہ آپ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا ہے آپ شیطانی اثرات اور دشمنوں کی سازشوں سے محفوظ و مامون ہیں۔ وسط بین درمیان میں ہوتا ہے۔ اس تک اس چیز کو پھاڑے بغیر نہیں پہنچا جا سکتا جس نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے۔ جبکہ اطراف میں خلل اور فساد تیزی سے دوڑ کر آتا ہے۔ ابن عاشور میں ہے۔

ولما كان الوصول اليه لايقع الابعد — وسط کی طرف پہنچنا اس چیز کو پھاڑے بغیر ممکن نہیں جس

اختراق مايحيط به احد فيه معنى — نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے۔ اس سے حفاظت اور عزت

الصيانة والعزة — کے معنی ماخوذ ہوتے ہیں

امام رازی فرماتے ہیں

والاطراف يتسارع اليها الخلل والفساد — اور اطراف میں خلل اور فساد دوڑ کر آتا ہے۔

آپ ﷺ کا دین وسط اور معتدل ہے۔

آپ ﷺ کے وسط ہونے سے خود معلوم ہو جاتا ہے کہ آپ کا دین بھی وسط اور معتدل ہے۔ اس میں افراط ہے نہ تفریط، کمی ہے نہ زیادتی، غلو ہے نہ تقصیر۔ ہر پہلو سے معتدل اور برابر ہے۔ آپ ﷺ کی طبع مبارک میں خیر اور بھلائی ہے شر اور برائی کا شائبہ بھی نہیں۔ لینت اور نرمی ہے تنگی اور سختی نہیں۔ عمدگی اور نظافت ہے رذالت اور خساست نہیں۔ لہذا آپ ﷺ کا دین بھی معتدل اور متوسط ہوگا۔ کیونکہ دین پیغمبر کے خلق کے مناسب ہوتا ہے۔ دین میں آپ ﷺ کی سیرت اور زندگی بھی شامل ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ قرآنی حکم کی صفت اور ہو اور پیغمبر کی طبیعت اور۔ یہ ایسی بات ہے جو عمل کو اٹھاتی اور حکم میں ٹکراؤ پیدا کرتی ہے۔ قران کے حکم اور آپ کی صفات میں ہم آہنگی لازمی

ہے۔ آپ کی روشن صفات کا انکار تاریخی بدیہات کا انکار اور متواترات کی تردید ہے۔

جب آپ کا دین وسط ہے تو معلوم ہوا کہ اسمیں ہر حق کی رعایت ہے کوئی ظلم نہیں۔ کوئی زیادتی نہیں۔ کوئی عسر اور کوئی تنگی نہیں۔ سختی بھی برمحل اور نرمی بھی برموقع۔ اس میں توسط اور اعتدال پسندی ہے تطرف اور انتہا پسندی نہیں۔ ہر حکم معتدل رحمت پر مبنی ہے۔

کامل دین والا نبی

حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو اللہ نے اکمل الخلق بنایا۔ آپ کے کمالات انسانی تخمین سے ماوراء اور خصائص بشری قیاس سے سوا ہیں۔ چھتے کی ہر بوند شہد اور سمندر کا ہر قطرہ پانی ہے۔ روشنی کی ہر کرن نور اور قرآن کا ہر حرف کلام الٰہی ہے۔ اسی طرح پیغمبر کی ہر شان نرالی، ہر روپ انوکھا، ہر رنگ جدا اور ہر انداز کمال ہے۔

اللہ نے آپ ﷺ کو کامل دین عطا فرمایا ہے۔ اجمالاً یہ بات پہلے ہو چکی ہے۔ اکمال دین آپ ﷺ کی خصوصیت اور آپکا اعزاز ہے۔ آپ پر اور آپ کے واسطے سے آپ کی امت پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ حافظ عماد الدین فرماتے ہیں۔

ھذہ اکبر نعم اللہ عزوجل	یہ اس امت پر اللہ کا سب سے بڑا انعام
علی ھذہ الامۃ حیث اکمل	ہے کہ اللہ نے ان کے لئے ان کا دین کامل
تعالی لھم دینھم	کر دیا (ابن کثیر۔ المائدہ۔۳)

ایسر التفاسیر میں ہے

فھو اخبار منہ تعالی لعبادہ	نزول آیت اللہ کی طرف سے مومن بندوں
المؤمنین بما ھو انعام علیھم	کو اس انعام واحسان کی خبر دینا ہے جو اس کی
منہ وامتنان (المائدہ۔۳)	طرف سے ان پر ہوا۔

مگر اتنا کہہ دینے سے بات بنتی نہیں۔ اس اعزاز کی عظمت کیا ہے۔ جس کے لئے ہزاروں انبیاء میں سے صرف محمد ﷺ کا انتخاب ہوتا ہے؟ اکمال دین میں شان مصطفیٰ کے موتی کون سے ہیں اور اس میں مقام مصطفیٰ ﷺ کیا ہے؟ مصطفیٰ شناسی کیلئے یہ جاننا لازمی ہے۔ جس کیلئے اسے کھوجنا ضروری اور کھولنا ناگزیر ہے۔ پھر معلوم ہوگا اکمال دین میں عظمت مصطفیٰ ﷺ کے کتنے رنگ پوشیدہ اور محمد

ﷺ کی کتنی شانیں چھپی ہوئی ہیں۔

پس منظر

ہجرت کا دسواں سال اور ذی الحج کی ۹ تاریخ ہے۔ جمعہ کا دن اور عصر کے بعد کا وقت ہے۔ لاکھ سے زائد جاں نثار پیغمبر ﷺ کے ساتھ جمع ہیں۔ یہی مکہ کے شہر اور عرفات کے میدان میں فریضہ حج ادا فرما رہے ہیں۔ وہی مکہ جہاں آج سے تیئس سال پہلے دین اسلام کی ابتدا ہوئی تھی۔ جہاں پہلی مرتبہ اللہ کے کلام نے دلوں کے دروازوں پہ دستک دی تھی اور سماعتوں کے در کھٹکھٹائے تھے۔ جہاں ایک لمبی مدت کے بعد جبرائیل نے سایہء عرش بریں سے فرش زمیں پر پہلا قدم رکھا تھا۔ وہ جگہ جہاں یہ کلام اور اللہ کا پیغام نشر کرنے کے لئے داعی کا ظہور ہوا تھا۔ اللہ کے داعی اور خدا کے انتخاب محمد ﷺ نے یہیں پہلی آواز لگائی تھی۔ وہ آواز جو ابتدا میں قطرہ تھی انتہا میں سمندر ہو گئی۔ شروع میں صبا کی مسکراہٹ تھی اخیر میں صرصر کا قہقہہ ہو گئی۔ پہلے غنچے کی چٹک تھی پھر برق کی لپک ہو گئی۔

آواز گونجتی رہی۔ دعوت پھیلتی رہی۔ لوگ آتے رہے۔ کارواں بڑھتا رہا۔ مگر اکثریت ان کی تھی جن کے دلوں پر تالے، کانوں میں ڈاٹ اور آنکھوں پر عناد کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ انہوں نے اس دین کو مٹانے اور دعوت کو لوٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک طرف عزم میں پختگی تھی اور دوسری طرف اس کو دبانے میں سختی تھی۔ بالآخر پیغمبر ﷺ اور ان کے جاں نثار بے خانماں ہو کر مکہ سے نکلے اور مدینہ جا پہنچے۔

ہجرت جو بظاہر غریب الوطنی تھی درحقیقت ایک نئی مملکت، نئی معاشرت، نئی تہذیب کا نقطہء آغاز تھی۔ جن کی بنیاد یہ دین تھا۔ وہ دین غلبہ جس کا نصیب بنا دیا گیا تھا۔ مخالفانہ کوششوں سے خیال ہوتا تھا یہ ریاست اب گئی کہ تب گئی۔ نامساعد حالات کے باوجود یہ دین بڑھتا رہا اور یہ حکومت پھیلتی رہی۔ یہاں تک کہ ۲۱ سال بعد مکہ حضور ﷺ کے قدموں تلے بچھ گیا۔ لیکن ابھی کفر وشرک کے نشان باقی تھے۔ دو سالوں میں یہ نشان بھی گرا دیے گئے۔ جزیرہ عرب میں دین اللہ کا ہو گیا۔ اسلام کو یہاں رسوخ اور تمکین حاصل ہو گئی۔ حج ان پانچ باتوں میں سے ایک تھا جن پر

اسلام کی بنیاد تھی۔ آپ ﷺ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اسے ادا کرنے کا حکم تھا لیکن بوجوہ ادا نہیں کر سکے تھے۔ اب حضور ﷺ نے اپنا پہلا اور آخری حج ادا فرمایا۔ چار پانچ سو سال کے بعد یہ پہلا حج اس شان سے ادا ہو رہا ہے کہ لاکھ سے زائد رفقاء میں سے ایک بھی مشرک نہیں۔ سبھی موحد ہیں۔ یہ غلبہ اسلام کے عملی اظہار کا موقع ہے۔ اس کی ادائیگی سے یہ عمارت مکمل ہو گئی۔

یہ آپ کی عمر عزیز اور رواں سال کے آخری ایام ہیں۔ دن کا آخری وقت اور ہفتے کا آخری دن ہے۔ اسلام کی تمکین اور غلبہ ظاہر ہو چکا ہے۔ جن عبادتوں کا حکم تھا وہ آپ ادا فرما چکے ہیں۔ حج آخری فرض تھا جو ادا نہ ہو سکا تھا اب وہ بھی ادا ہو چکا ہے۔ عمل اور زبان دونوں سے آپ مناسک حج کی تعلیم بھی دے چکے ہیں۔ اس وقت اس آخری دین کے بارے میں اللہ نے یہ خوشخبری سنائی

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ — آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا (المائدہ۔۳)

اکمال دین کے معنی:

کمال کا مطلب ہے پورا ہونا۔ مکمل ہو جانا۔ اور اکمال کا مطلب ہے پورا اور مکمل کر دینا۔ امام راغب فرماتے ہیں

کمال الشیء حصول مافیہ	کوئی چیز پوری ہونے کا معنی ہے اس سے جو
الغرض منہ فاذاقیل کمُلَ	غرض ہے وہ حاصل ہو جائے۔ جب کہا جائے
ذالک فمعناہ حصل ماھو	وہ پورا ہو گیا تو اس کا معنی ہو گا اس سے جو غرض
الغرض منہ (کتاب الکاف)	تھی وہ حاصل ہو گئی۔

کمال کی ضد نقص ہے اس بارے میں امام فرماتے ہیں۔

والناقص مایحتاج الی شیء خارج منہ

اور ناقص وہ ہے جس کے علاوہ کسی دوسری چیز کی ضرورت ہو۔

اس سے معلوم ہوا جس مرحلے پر کسی چیز کو یہ خصوصیت حاصل ہو گی کہ وہاں اس سے مطلوبہ غرض پوری ہو سکتی ہے وہ مرحلہ اس کا درجہ کمال ہو گا۔ گویا کمال ایک اضافی چیز ہے جیسا کہ آئندہ مثال سے معلوم ہو گا۔ یہیں سے دینکم کہنے کی حکمت بھی معلوم ہو گئی۔ دینی کہنے سے شبہ ہوتا کہ

سارے دین از آدم تا عیسیٰ اللہ کے ہیں۔ تو کیا جب سے ناقص چلے آ رہے ہیں اور اب آ کر مکمل ہوئے۔ دینکم کہہ کر بتا دیا جس دین پر تم ہو اس کی تکمیل آج ہوئی۔ تمہارے لئے جس ھدایت کا ارادہ تھا وہ آج پوری ہوئی۔ اور یہی حقیقی تکمیل بھی ہے۔

لغت پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کمال کا مطلب ہے کسی چیز کے تمام اجزاء کو خاص ترتیب سے جمع کر لینا۔ اس سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ گویا حصول کمال میں فاعل کا اصل فعل اجتماع اجزاء ہے۔ اس اجتماع سے خود بخود کمال حاصل ہو جاتا ہے۔

ابو ہلال عسکری فرماتے ہیں

ان قولنا کمال اسم لاجتماع	بے شک ہمارا قول یہ ہے کہ جس چیز کو
ابعاض الموصوف بہ	کمال سے موصوف کیا جائے اس کے
(فروق اللغویہ۔۲۹٤)	اجزاء کو اکٹھا کرنے کا نام کمال ہے۔

اکمال دین کا مطلب ہوا آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کے تمام اجزاء جمع کر دیے۔ اب اس دین کے علاوہ تمہیں کسی دوسری چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ اجزائے دین اکٹھا کرنے سے جو غرض تھی وہ آج پوری ہو گئی۔

کمال کی مثال:

ہلال طلوع کے وقت ابروئے یار کی مانند خمیدہ اور بال کی طرح باریک ہوتا ہے۔ رفتہ رفتہ ماہ دو نیم ہو جاتا ہے۔ چاند کے وہ تمام حصے جو اندھیرے میں تھے روشن ہو جاتے ہیں۔ آپ کہتے ہیں یہ بدر کامل یعنی پورا چاند ہے۔ پہلی کا چاند ناقص ہے اور چودھویں کا مکمل۔ اس کمال کی ایک حد ہے۔ اس حد سے کم ہو تو بھی ناقص ہے اور اگر زیادہ ہو تب بھی ناقص ہے۔ نیز اس حد کا تعلق چودھویں کی شب سے بھی ہے یعنی اس حد کمال تک چودھویں کو پہنچنا چاہیے۔ اگر چودھویں سے پہلے اس حد تک پہنچ جائے تب بھی ناقص ہے اور بعد میں پہنچے تب بھی ناقص ہے۔ پہلا نقص داخلی اور دوسرا نقص خارجی ہے۔ ہر چیز میں کمال کا درجہ الگ الگ ہے۔ اسی طرح ایک چیز کی مختلف حالتوں میں بھی درجہ کمال الگ الگ ہے۔ حقیقی کمال تو بدر کامل کو حاصل ہے لیکن اس سے مجرد

کر کے دیکھا جائے تو چاند کی ہر حالت کامل ہے۔ پہلی کو چاند کی جو حالت ہونی چاہئے اگر وہی ہے تو پہلی کا چاند بھی کامل ہے۔ اسی پر باقی حالتوں کو قیاس کرو۔

نزول آیت کے پس منظر اور کمال کے لغوی معنی اور اس کی مثال کو سامنے رکھا جائے تو مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

حجیت حدیث:

دین کامل کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اب قرآن کا نزول مکمل ہو گیا ہے کیوں کہ اس کے بعد بھی کئی آیات نازل ہوئیں۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

ولا یصح ان یکون المراد من الدین القرآن لان آیات کثیرۃ نزلت بعد ھذہ الایۃ

اور دین سے قرآن مراد لینا صحیح نہیں کیوں کہ اس کے بعد بھی کئی آیات نازل ہوئیں۔

اس لئے مفسرین اکمال دین کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

یعنی الفرائض والسنن والحدود و الجھاد والاحکام والحلال والحرام

یعنی فرائض، سنن، حدود، جہاد، احکام اور حلال و حرام کی تکمیل کر دی۔ (بغوی)

سوال ہے وہ کون سا حکم تھا جو اس وقت اللہ نے اتارا پھر یہ مژدہ سنایا؟ جواب یہ ہے اس وقت کوئی حکم نازل نہیں ہوا۔ تمام احکام پہلے اتر چکے تھے۔ نزول آیت کے بعد جو بھی قرآن نازل ہوا وہ پہلے سے مقرر شدہ احکام ہی کی بعض تفصیلات پر مشتمل تھا۔ ابن عاشور فرماتے ہیں

وما نزل من القرآن بعد ھذہ الایۃ لعلہ لیس فیہ تشریع شئی جدید ولکنہ تاکید لما تقرر تشریعہ من قبل بالقرآن او السنۃ

اور اس آیت کے بعد جو قرآن نازل ہوا۔ شاید کہ اس میں کوئی نیا قانون نہیں بلکہ قرآن یا سنت میں پہلے سے مقرر احکام کی تاکید تھی۔ (المائدہ۔۳)

حج کا حکم پہلے نازل ہو چکا تھا۔ کئی مسلمان حج کر چکے تھے البتہ نبی ﷺ نے حج نہیں کیا تھا۔ اس اہم عبادت کا عملی نمونہ باقی رہتا تھا۔ آپ کے حج کرنے سے یہ بھی امت کے سامنے آ گیا اور مناسک کی زبانی اور عملی طور پر اصولی تعلیم بھی ہو گئی۔ تب اللہ نے اکمال دین کا اعلان فرمایا۔ اس سے بخوبی

معلوم ہوتا ہے آپ کا قول و فعل اللہ کے نزدیک حجت اور سند ہے۔ اگر حجت نہ ہوتا تو تکمیل احکام پر ہی اکمال کا اعلان فرما دیا جاتا۔ یا دین صرف قرآن کا نام ہوتا تو اکمال کا اعلان نزول قرآن مکمل ہونے کے بعد کیا جاتا۔ اس کے بجائے عملاً جن باتوں کی تعلیم دینا تھی جب وہ مکمل ہوئیں تب اعلان فرمایا۔ اور بالفرض یوں کہا جائے کہ احکام اس کے بعد بھی نازل ہوئے جیسا کہ عنقریب شعبی کے حوالے سے بیان ہوگا تب تو حدیث و سنت کا حجت ہونا اور واضح ہو جاتا ہے وہ اس طرح کہ اکمال دین آپ کے عمل پر موقوف تھا جیسے ہی عمل حج تمام ہوا دین کامل ہو گیا کیوں کہ دین اگر اللہ کے احکام کا نام ہے تو ان کی تکمیل سے پہلے دین کامل ہونا درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ مراد نہ لی جائے کہ دین میں احکام کی علمی شکل کے علاوہ کچھ اور بھی شامل ہے جس کی تکمیل پر کمال موقوف ہے۔ اور وہ رسول اللہ کا عمل ہی ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا آپ کا عمل اکمال دین کی شرط تھا۔ رہی کفر اور شرک کی ذلت تو وہ تقاضائے کمال ہے نہ کہ اصل کمال۔

کامل تعلیم:

کمال نام ہے کسی چیز کے جملہ اجزاء جمع کرنے کا۔ اکمال دین کا مطلب ہے اللہ نے اس کے تمام اجزاء کو جمع کر دیا۔ دین کے اجزاء اللہ کے احکام ہیں

والدین عبارۃ عن الشرائع التی شرع لنا وفتح لنا (قرطبی)

اور دین قوانین سے عبارت ہے جنہیں اللہ نے ہمارے لئے مقرر کیا اور کھولا

ان اجزائے دین کی تعیین رسول کے ذمہ ہے۔ قرآن و سنت سے استنباط مجتہدین کا فریضہ ہے یہ سب دین ہی ہے۔ اللہ نے رسول ﷺ کو دین اسلام عطا فرمایا۔ اس دین کے لئے اللہ نے تمام اجزاء جمع کر دیے۔ قیامت تک کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کے لئے آپ ﷺ کی امت کو اللہ کے نئے حکم کی ضرورت ہو۔ دراصل اکمال دین کے لئے مخصوص زمانے کی ضرورت تھی۔ اس سے پہلے یا بعد میں دین کامل کرنا بجائے خود ایک نقص ہوتا۔ کیوں کہ دین کے جتنے حصے پر عمل کی ضرورت ظاہر نہ ہوتی وہ بے فائدہ ہوتا۔ ضرورت ظاہر ہونے کے بعد اگر تاخیر کی جاتی تو انسانی احوال کا بڑا حصہ راہنمائی کے بغیر رہ جاتا۔ امام رازی فرماتے ہیں

لولم يكمل لهم قبل هذا اليوم ما كانوا محتاجين اليه من الشرائع كان ذالك تاخير للبيان عن وقت الحاجة وانه لا يجوز (المائدہ۔۳)

احکام میں سے وہ باتیں جن کے وہ محتاج تھے اگر اس دن سے پہلے ان کی تکمیل نہ کی جاتی تو ضرورت کے وقت سے بیان کی تاخیر لازم آتی۔ اور یہ جائز نہیں۔

اس سے ہمارا مقصود صرف اتنا ہے ضرورت کے وقت اظہار کو مؤخر کر دینا خلاف عقل ہے۔ اس لئے دونوں صورتوں میں اللہ کی حکمت پر داغ لگتا۔ یہ اعزاز اللہ نے محمد ﷺ کو دیا اور اس کے لئے ایک خاص زمانے کے آغاز پر آپ کو بھیجا۔ رسول اللہ ﷺ کی آمد بھی ایک مخصوص زمانے کا تقاضا کرتی تھی۔ یہیں سے ختم نبوت کی حکمت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ اس پر عنقریب بات ہوگی۔ یہ مخصوص زمانہ وہ تھا جس میں وہ باتیں بھی ظاہر ہو گئیں جو عقائد و اعمال سے تعلق رکھتی تھیں لیکن انکا ظہور نہیں ہوا تھا۔ مثلاً تمام رسولوں اور کتابوں پر ایمان لازمی ہے۔ ختم نبوت پر ایمان ضروری ہے۔ حضرت عیسیٰ تک نبوت ختم ہوئی نہ رسول پورے ہوئے نہ کتابیں مکمل ہوئیں۔ ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان لانا باقی تھا۔ آپ کی امت کو یہ سب نصیب ہوا۔

اكمال الدين لهذه الامة انهم امنوا بكل نبي وكل كتاب ولم يكن هذا لغير هذه الامة (خازن۔المائدہ۔۳)

اس امت کے لئے دین کامل کرنا یہ ہے کہ وہ ہر نبی اور ہر کتاب پر ایمان لائے اور یہ کمال ایمان اس امت کے علاوہ کسی اور کو نہیں ملا۔

اسی میں اللہ کی صفات اور عقائد کی وہ تفصیلات بھی شامل ہیں جن کے لئے خاص عقل کی ضرورت تھی۔ یہ تفصیلات ایسی تھیں جو بقیہ قوموں کے مدرکات سے ماوراء تھیں۔ اور جو چیز نفس کے مدرکات سے متفق نہ ہو ذہن میں اسے تیزی سے قبول کرنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ اس سے متعین ہو جاتا ہے کہ تمام ادیان میں مخاطبین کے حال کی رعایت کی گئی۔ پہلی قوموں کا حال ایسا نہ تھا کہ وہ ان باریکیوں کا تحمل کر سکتے۔ قرآن جیسی کتاب کے لئے امتوں میں سے اس امت کا انتخاب معنی خیز ہے۔ چنانچہ تفسیر القشیری میں ہے

ويقال اكمال الدين ان ما تقصر

اور اکمال دین کے بارے میں کہا گیا ہے بے شک

عنه عقلك من تعيين صفاته على التفصيل اكرمك بان عرفك ذالك من جهة الاخبار

اللہ کی وہ صفات جن کے تفصیلی تعین سے تیری عقل قاصر تھی تیرا اکرام کرتے ہوئے خود آگاہ کر کے تجھے ان کی پہچان کرائی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

اخبر الله نبيه صلى الله عليه وسلم والمومنين انه قد اكمل لهم الايمان فلا يحتاجون الى زيادة ابدا (الطبری)

اللہ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ایمان والوں کو خبر دی کہ اس نے تمہارے لئے ایمان کامل کر دیا ہے اب کبھی بھی تمہیں اس میں اضافے کی ضرورت نہیں ہوگی

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ بھی ارشاد ہے

انها كمال فرائضه وحدوده ولم ينزل بعد هذه الاية تحليل ولا تحريم (زاد المسير)

اس نے اپنے فرائض اور حدود کو کامل کر دیا اور اس آیت کے بعد حلال و حرام کا کوئی حکم نازل نہیں ہوا

اسی میں اعمال کے وہ تمام اجزاء بھی شامل ہیں جن کی حاجت ہو سکتی تھی۔ یہ سب بھی اس امت کیلئے جمع کر دیے گئے۔ ابن عاشور نے کہا اکمال دین دراصل اللہ کی مراد کا بیان مکمل کرنا ہے۔ اس کے بعد فرماتے ہیں۔

بحيث صار مجموع التشريع الاسلامي الحاصل بالقران والسنة كافيا في هدى الامة في عباداتها ومعاملتها وسياستها في سائر عصورها بحسب ماتدعوا اليه حاجاتها فقد كان الدين وافيا في كل وقت بما يحتاجه المسلمون

اس حیثیت سے کہ قرآن و سنت سے حاصل ہونے والا اسلامی قوانین کا مجموعہ ہر زمانے میں امت کی عبادت، معاملات اور سیاست میں راہنمائی کیلئے کافی ہو گیا۔ ان کی حاجات کی طلب کے حساب سے ہر وقت مسلمانوں کی جو ضرورت ہے پس دین اس کے لئے پورا ہے۔ (المائدہ۔۳)

مکارم اخلاق کے متمم ﷺ نے بلند اخلاق سکھائے۔ کتاب وحکمت کے معلم نے عالی اور اکمل تعلیم دی۔ ایسی تعلیم جس سے انسانی احوال کا کوئی گوشہ اور زندگی کا کوئی کونہ مخفی نہ رہا۔

تفسیر کاندھلوی میں ہے

اکمال دین کے معنی یہ ہیں کہ اس میں تمام حلال وحرام اور فرائض اور واجبات اور اصول و قواعد بیان کر دیے گئے۔ اب تمہیں دینی یا دنیوی ہدایت کے لئے کسی اور دین کی ضرورت نہیں اور نہ کسی اور نبی کی حاجت رہی۔ یہی دین تمہاری دینی اور دنیوی اور تدبیر منزلی اور تدبیر ملکی اور سیاست داخلیہ اور خارجیہ کی مشکلات میں ہدایت اور راہ نمائی کے لئے کافی اور شافی ہے۔ (المائدہ۔۳)

اس امت کا عمل کامل ہے

رسول اللہ ﷺ کی راحت بخش حیات میں دین کی تعلیم اور اس پر عمل سے عمارت اسلام کی بنیاد بھی مکمل ہوئی۔ تکمیل عمل کے ساتھ ہی اکمال دین کا اعلان کر دیا گیا۔ اللہ نے فرمایا

يٰأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً

اے ایمان والو پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ

حضور ﷺ نے پانچ چیزوں کو اسلام کی بنیاد قرار دیا۔ بنیاد کی چار چیزوں پر تو عمل ہو رہا تھا لیکن ایک چیز حج پر عمل باقی تھا۔ جب آپ نے اس پر عمل فرمایا

فاستجمع لهم الدين اداء لاركانه وقياما بفرائضه (قرطبی)

تو ان کے لئے سارا دین ارکان کو ادا اور فرائض کو قائم کرنے کے ساتھ جمع ہو گیا (القرطبی)

تب اکمال کی خبر دیدی گئی۔ تفسیر قرطبی میں ہے

وقد كانوا تشهدوا وصلوا وزكوا وصاموا	وہ شہادت دیتے، نماز پڑھتے، زکات دیتے،
وجاهدوا واعتمروا ولم يكونوا حجوا	جہاد اور عمرہ ادا کرتے تھے حج نہیں کیا تھا۔ پس
فلما حجوا ذلك اليوم مع النبي صلى	جب اس دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حج
الله عليه وسلم انزل الله تعالى وهم	کر لیا تو اللہ نے آیت الیوم اکملت لکم

بالموقف عشية عرفة اليوم اكملت	واتممت علیکم نعمتی اتاری اور وہ سہ پہر
لكم دينكم واتممت عليكم نعمتي	کو موقف عرفات میں تھے۔ اس نے ارادہ کیا
فالما اراد اكمل وضعه لهم	کہ دین کی وضع ان کے لئے کامل کر دے

علم ویقین کے باوجود جب تک حج عمل میں نہیں آیا اس وقت تک اکمال کا اعلان نہیں کیا۔ یہ بات قابل توجہ ہے جب تک آپ نے ادا نہیں کیا تب تک دین کامل نہیں ہوا۔ معلوم ہوا اصل عمل رسول اللہ ﷺ کا ہے۔ مقصود کائنات ﷺ کا عمل ہی اللہ کو مطلوب تھا اسی لئے یہ کارخانہ قدرت سجایا۔

یہ بھی پتہ چلتا ہے اس امت کا عمل بھی دوسری تمام امتوں سے کامل ہے۔ جسمانی طور پر اگر چہ ان سے نحیف ہیں لیکن ایمانی طور پر ان سے قوی اور مضبوط ہیں۔ ان کا وقت، عمل اور عرصہ عمل بھی اگر چہ تھوڑا ہے لیکن حسن وکمال میں زیادہ ہے۔ کیوں کہ ان کا دین کامل ہے۔ اس دین کا حقیقی کمال ظاہری اعمال کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کے پس پشت اللہ کی کامل معرفت کی وجہ سے ہے۔

کیوں کہ عمل میں حسن معرفت کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ رسول دوسرے انبیاء سے اور یہ امت دوسری امتوں سے اگر منفرد اور ممتاز ہے تو کمال معرفت کی وجہ سے۔ دوسری قوموں میں قوت عقل اتنی نہ تھی کہ وہ معرفت کی یہ باریکیاں سمجھ سکتے۔ ایک اور بات بھی قابل غور ہے فعل تو آپ کا اور مسلمانوں کا تھا اکمال کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی کیوں کہ عمل کی توفیق اللہ کی طرف سے تھی۔ موانع دور کر کے اس مقام تک پہنچانے میں مدد اللہ نے کی تھی۔

اسلام کی تمکین اور کفر وشرک کی ذلت:

کمال کی تعریف میں بیان کیا جا چکا ہے جس سے غرض پوری ہو جائے وہ کمال ہے۔ دیکھنا چاہیے دین سے اللہ کی غرض کیا ہے؟ تمام ادیان جو اللہ نے بھیجے ان سے غرض تھی بندے ان پر عمل کریں ابن عاشور نے فرمایا

ان مراد الله تعالى من توجيه الشرائع	شریعتوں کے تابع کرنے اور رسولوں کے بھیجے
وارسال الرسل ليس مجرد قرع	سے اللہ کی مراد یہ نہ تھی کہ تشریع کی عبارات
الاسماع بعبارات التشريع او النطوق	سے صرف سماعتوں کو کھٹکھٹایا جائے یا اس کی

لذقائق تراكيبه بل مراد الله تعالى	تراکیب کا ذائقہ چکھایا جائے بلکہ لوگوں کے
مما شرع للناس هو عملهم بتعاليم	لئے قانون بنانے سے اللہ کی مراد اپنے رسولوں
رسله وكتبه (ال عمران-۱۹)	اور کتابوں کی تعلیمات پر عمل تھا۔

دین اسلام سے عمل کے علاوہ اللہ کی ایک غرض اور بھی ہے اس بارے میں فرمایا

هُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ	وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول راہ کی سوجھ دے کر
دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ	اور سچا دین کہ اس کو اوپر کرے سب دینوں سے

چنانچہ جب یہ غلبہ اسلام کو حاصل ہو گیا۔ عرب کے مشرک ذلیل ہو گئے۔ یہودی رسوا اور عیسائی تابع ہو گئے۔ اسلام کو قوت، تمکین اور شوکت حاصل ہو گئی تو مسجد حرام میں مشرکوں کا داخلہ بند کر دیا گیا۔ تب اللہ نے اعلان فرمایا کہ یہ دین کامل ہو گیا ہے۔ ابن عاشور کہتے ہیں

فكان ذالك اجلى مظاهر كمال الدين	پس یہ حالات دین کے غلبے، طاقت
بمعنى سلطان الدين وتمكينه وحفظه	اور حفاظت کے روشن مظاہر تھے۔ اور
وذالك تبين واضحايوم الحج الذى	یہ بات واضح ہو کر اس حج پر کھلی جس میں
نزلت فيه هذه الاية (المائدہ-۳)	یہ آیت نازل ہوئی۔

تفسیر البحر المحیط میں ہے

وقال قتاده وابن جبير كماله ان ينفى	قتادہ اور ابن جبیر کہتے ہیں کعبہ سے مشرکین کو
المشركين عن البيت فلم يحج معهم	روکنا کمال ہے پس کسی مشرک نے ان کے
مشرك وقال الشعبى كماله هو عزه و	ساتھ حج نہیں کیا۔ شعبی کہتے ہیں عزت و غلبہ
ظهوره وذل الشرك ودروسه لاتكامل	اور شرک کی ذلت و پستی کمال ہے۔ فرائض
الفرائض والسنن لانها لم تزل تنزل	و سنن کا پورا ہونا مراد نہیں۔ کیوں کہ احکام
الى ان قبض (البحر-المائدہ-۳)	تو آخر وقت تک آپ پر نازل ہوتے رہے۔

لاتکامل الفرائض والسنن کی وضاحت پہلے گذر چکی ہے۔

علامہ الوسی فرماتے ہیں

بالنصر والاظهار لانهم بذالك	مدد اور غلبے کے ساتھ دین کامل کر دیا کیوں
يجرون احكام الدين من غير مانع	کہ اسی کے ساتھ وہ بلا رکاوٹ احکام دین
(المائدہ-۳)	جاری کرتے ہیں۔

مولانا عبدالماجد دریابادی اس آیت کے تحت لکھتے ہیں

یہ اکمال دین بہ لحاظ قوت بھی ہے اور بہ لحاظ احکام و قواعد بھی (تفسیر ماجدی)

یہ دین منسوخ نہیں ہوگا:

اکمال دین کے اعلان سے دین کا غیر منسوخ ہونا بھی معلوم ہوتا ہے۔ پہلے ادیان کلی طور پر منسوخ ہو گئے۔ اس دین میں بھی کئی ابتدائی احکام کو منسوخ کیا گیا۔ اب جو حکم جس طرح مقرر ہو چکا ہے اسی طرح رہے گا۔ اگر اس کے بعد بھی نسخ واقع ہو تو دین کو کامل کہنا درست نہیں۔ یہ بھی حضور کا اعزاز ہے کہ اللہ نے آپ کو ایسا دین دیا جس کو ترمیم و اضافہ کی ضرورت نہیں

تفسیر خازن میں ہے

اكمال الدين لهذه الامة انه لا	اس امت کے لئے اکمال دین یہ ہے کہ
يزول ولاينسخ ان شرعهم	یہ زائل ہوگا نہ منسوخ بلکہ ان کی شریعت
باقية الى يوم القيمة (المائدہ-۳)	تا قیامت باقی رہے گی۔

بقا اور دوام:

منسوخ نہ ہونے سے واضح ہو جاتا ہے یہی شریعت تا قیامت چلے گی۔ قیامت تک کسی نئے دین کی ضرورت نہیں ہوگی۔ یہ بقا اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب شریعت میں ہر زمانے کو ساتھ چلانے کی استعداد موجود ہو۔ اگر ایسا نہیں تو شریعت ایک بوجھ کے سوا کچھ نہیں۔

یہ استعداد کیا ہے؟ ہر دور میں رونما ہونے والے انسانی احوال کی جامع اور تمام شخصی حالات کا احاطہ کرتی ہو تاکہ عمل ممکن اور آسان ہو۔ لیکن انسانی اور شخصی احوال گنتی میں انسانی شمار سے باہر ہیں۔ اگر دین جزئیات کا تفصیلی احاطہ کرتا تو دین کی اساسی کتابیں اتنی بڑی ہو جاتیں کہ کئی لائبریریوں میں بھی نہ سماتیں۔ عقلی تقاضا ہے اس میں ایسے اصول بیان کر دیے جائیں جو

تا قیامت مشغل راہ ہوں۔ اور جو انہیں سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہو اسے انکی وضاحت اور ان سے استنباط کا حق دیا جائے۔ کیوں کہ اللہ کا وعدہ کمال کا سچا ہے۔

اس سے آپ ﷺ اور آپ کی امت کے عقلی کمال کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ نبی سب سے اعلی اور کامل عقل رکھتا ہے جس پر یہ دین نازل ہوا اور اس نے انکی مراد واضح کی۔ وہ امت بھی فہم وذکاء میں منفرد ہے جو اس کی تشریح کی اہلیت رکھتی ہے۔ کیوں کہ تبیین اور استنباط بے بہا عقل کے بغیر نہیں ہوسکتے۔

محفوظ دین:

یہ دین نا قابل نسخ اور تا قیامت باقی رہنے والا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے یہ دین ہمیشہ محفوظ رہے گا ورنہ اکمال کا اعلان بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ دین میں قرآن کے ساتھ سنت بھی شامل ہے۔ اس لئے قرآن بھی محفوظ ہے اور حضور ﷺ کی سنت بھی محفوظ ہے۔ پس قران میں تحریف ہونے یا سنت کے مشکوک ہونے کا دعوی کرنا ایمان اور اسلام سے کوسوں دور ہے۔

دلیل ختم نبوت:

نبی کی ضرورت تب ہوتی ہے جب انسانی طبقوں کے نئے احوال ظاہر ہوں۔ پرانے احکام میں حک واضافہ کرنا ہو۔ جزوی یا کلی طور پر ان میں ترمیم و تنسیخ کرنی ہو۔ اب دین کامل ہو گیا۔ کبھی منسوخ نہیں ہوسکتا۔ اس سے جو غرض ہے وہ قیامت تک کے لئے حاصل ہوسکتی ہے۔ نبی کو بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو گیا۔ اس لئے حضور ﷺ پر نبوت ختم ہوگئی۔ آپ وہ دین لائے جس نے ہر زمانے کی تمام شؤون کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب کسی ظلی بروزی نبی کی قطعا کوئی ضرورت نہیں رہی۔

ابن کثیر میں ہے

ولهذا جعله الله خاتم الانبياء وبعثه الى الجن والانس (المائدہ ۳)

اسی لئے اللہ نے آپ کو خاتم الانبیاء بنایا اور جن وانس کی طرف آپ کو مبعوث فرمایا۔

معتدل دین:

دین اسلام میں اعتدال اور توسط ہے۔ افراط وتفریط سے پاک اور کمی بیشی سے خالی ہے۔ اس دین کا ہر حکم نپا تلا ہے۔ اللہ نے میرے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو انتہائی متناسب اور متوازن دین عطا فرمایا ہے۔ اس دین کے کمال سے ہی اس کے اعتدال کا علم ہوتا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے جس تک پہنچنے سے ہی اسے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اس حد کو عبور کر جائے تو افراط ہے۔ یہ بھی کمال نہیں۔ اس حد سے پیچھے رہ جائے تو تفریط ہے۔ یہ بھی کمال نہیں۔ مثلا چاند کو حقیقی کمال نور اس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنی مقررہ حد تک پہنچ جائے۔ نہ کم ہو نہ زیادہ۔ کمی زیادتی کے درمیان ہی توسط اور اعتدال ہوتا ہے۔ ہر شے اور ہر چیز میں اعتدال ہی کمال کہلاتا ہے۔ خوبی اسی وقت خوبی کہلاتی ہے جب اس میں تناسب اور توازن ہو۔ اس کی کچھ تفصیل سید الوسط کے عنوان سے ہو چکی ہے۔

خوبصورت دین:

کمال ہو مگر حسن وزینت اور توازن وتناسب نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ جب کوئی چیز کامل ہو تو اسمیں خود بخود جودت بھی آئے گی۔ عمدگی بھی آئے گی۔ خوبصورتی بھی ہوگی اور تناسب بھی ہوگا۔ یہ لوازم کمال ہیں۔ بدر کی تابانی، گلاب کی رونق، بہاروں کے جوبن، خزاؤں کے عروج اور ستاروں کی جھلملاہٹ میں جو حسن ہے وہ کسی بیان کا محتاج نہیں۔

اللہ نے آپکو حسین ترین دین دے کر بھیجا۔ یہاں سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ پیغمبر اعظم ﷺ نبیوں میں اور آپ کی امت امتوں میں انتخاب ہے۔ کیوں کہ چناؤ اسی کا ہوتا ہے جو باکمال ہو

یہی دین غالب رہے گا:

کمال دین میں غلبہ دین کی خوشخبری بھی ہے۔ کیوں کہ ہمیشہ کمال ہی غالب آتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں جو چیز کامل ہو وہی غالب رہتی ہے۔ ناقص اور نا تمام فوج ہو تو ہار جاتی ہے۔ تہذیب ہو تو شکست کھا جاتی ہے۔ اصول ہوں تو مٹ جاتے ہیں۔ اخلاق ہوں تو دفن ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ ہو تو فنا ہو جاتا ہے۔ نظریہ ہو تو ہوا ہو جاتا ہے۔ قوم ہو تو اجڑ جاتی ہے۔ سلطنت ہو تو نابود ہو جاتی

ہے۔عمارت ہو تو گر جاتی ہے۔ یہاں ایک باریک سی بات کہنا چاہوں گا۔ وقت سب سے طاقتور ہے۔اس سے سبھی شکست کھا جاتے ہیں۔ مگر یہ دین وقت سے زیادہ قوت وکمال والا ہے۔ یہ تماشا ہر روز وشب ہمارے سامنے ہوتا رہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے

فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ

سو وہ جھاگ تو جاتا رہتا ہے سوکھ کر اور وہ جو کام آتا ہے لوگوں کے سو باقی رہتا ہے زمین میں

محمد ﷺ باکمال ہیں:

نبی کی طبیعت اور مزاج دین کے عین مطابق ہوتا ہے۔ دین اور پیغمبر لازم وملزوم ہیں۔ شہد اور مٹھاس کی طرح گندھے ہوئے۔ سورج اور نور جیسے باہم مربوط۔ کلی میں خوشبو کی طرح۔ پیغمبر دین سے ہٹ کر کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے پیغمبر کا قول اور فعل ہی نازل شدہ کتاب کی مراد ہوتا ہے۔ اس کا ہر کام خود دین ہوتا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ تمہارے لئے بھلی تھی سیکھنی رسول اللہ کی چال

دین کامل ہوتا جاتا ہے پیغمبر اس کے کامل ہونے سے پہلے کامل ہیں کیوں کہ ناقص کو اعزاز نہیں دیے جاتے۔ دین انسان کی سیرت، شخصیت اور کردار بناتا ہے۔ جس کا دین جتنا کامل ہوا اس میں اتنا ہی کمال آئے گا۔ اب جس کا عمل نہ صرف یہ کہ خود دین ہو بلکہ اسے کامل کرنے کی شرط بن جائے اس میں کتنا کمال ہوگا؟ کوئی اس کے کمال کو بیان کر سکتا ہے؟ کوئی نہیں۔

اکمال دین بیان ہے اس بات کا کہ محمد ﷺ کامل ہیں۔ مکمل ہیں۔ قوی ہیں۔ غالب ہیں۔ آپ کی ہر شان ہر رنگ ہر روپ اعتدال اور توسط والا ہے۔ آپ صورت اور سیرت میں حسین ہیں۔ اسی طرح آپ کی امت بھی کامل ہے۔

مسئلہ امامت علیؓ

یہاں ایک اور بات بھی ازحد قابل توجہ ہے کہ شیعہ کے بقول امامت اصول دین میں سے ہے۔ یہاں تک کہ اللہ پر امام کا مقرر کرنا واجب ہے۔ حضور کے بعد بلافصل خلیفہ حضرت ابوبکر نہیں بلکہ حضرت علی تھے۔ آپ کو خود اللہ نے امام مقرر کیا اور حضور کو اس کی تبلیغ کا تاکیدی حکم دیا۔ چنانچہ حجۃ

الوداع سے واپسی پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک قصبہ غدیر خم کے مقام پر ولایت علی کے عنوان سے آپ نے اس امامت کی تبلیغ ان الفاظ میں کی

من كنت مولاه فعلى مولاه جس کا میں مولیٰ ہوں علی اس کا مولیٰ ہے

علماء اہل سنت والجماعت نے اس کے بہت سے جوابات دیے۔ اور اصل بات کی وضاحت کی کہ ولایت کا اعلان امامت اور عصمت کے لئے قطعی نہیں۔ کمال دین کا عنوان بھی اس حقیقت کو واضح کرتا ہے کہ امامت نہ اصول دین میں سے ہے اور نہ اللہ نے حضرت علی کو امام مقرر کیا۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کمال دین کا اعلان اس وقت ہوا جب آپ اصول وفروع یعنی عقائد واعمال کی قولی اور عملی تبلیغ کر چکے تھے۔ اگر نصب امام اور بطور امام حضرت علی کو مقرر کرنا اصول دین میں سے ہوتا تو اس کا اعلان اور تبلیغ کمال دین کے اعلان سے پہلے ہونی چاہیے تھی۔ اس لئے کہ اصول کی تبلیغ سے پہلے تک دین ناقص ہے اور اسے کامل نہیں کہا جا سکتا۔ بالفرض تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ اعلان ولایت دراصل علی کی خلافت بلافصل کا اعلان تھا تب بھی امامت کا اصول دین میں سے ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اعلان کمال کے بعد اس کو بیان کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسئلہ امامت یار لوگوں کا خود ساختہ ہے اور اصول سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ ورنہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اصول کی تعلیم سے پہلے غلط طور پر اللہ کمال کا اعلان فرما دے۔

حقیقی کمال:

اس دین کو حقیقی کمال حاصل ہے۔ پہلے ادیان کو بھی کمال حاصل تھا لیکن وہ کمال اضافی یا مقید تھا۔ وہ ادیان اپنے زمانے اور مقام کے لحاظ سے کامل تھے۔ ان امتوں کے عقائد اور اعمال کو کمال مطلق حاصل نہ تھا۔ مفسر کاندھلوی سابقہ شریعتوں کے بارے میں فرماتے ہیں

> حضرات انبیاء سابقین کو جو شریعتیں عطاء کی گئیں وہ ناقص نہ تھیں بلکہ اپنے اپنے وقت اور اس خاص زمان اور اس خاص مکان اور اس خاص خطہ کے لحاظ سے کامل تھیں ان کا کامل ہونا ایک مخصوص قوم اور محدود زمانہ کیلئے تھا اسی وجہ سے دوسرے کے آنے سے شریعت سابقہ کے کچھ احکام منسوخ ہو جاتے تھے۔ (معارف القرآن کاندھلوی۔ المائدہ۔۳)

اس امت کیلئے اللہ نے سب عقائد و اعمال کو مکمل فرما دیا جیسے چاند کا حقیقی کمال چودہ کو ہوتا ہے لیکن پہلے کی حالتیں بھی اپنی جگہ کامل ہوتی ہیں۔ اُس امت یا زمانے کے لئے جن اجزاء کی ضرورت تھی وہ اللہ نے نازل فرما دیے تھے مگر حقیقی کمال اس دین کو حاصل ہوا اور کمال مطلق دین محمدی کے حصے میں آیا۔ کیوں کہ دین کا تعلق انسانی احوال سے ہوتا ہے جیسے جیسے یہ احوال ظاہر ہوتے ہیں اسی طرح اللہ کا حکم اترتا رہتا ہے۔

اب یوں کہو اس وقت اللہ نے جتنا دین دیا اتنا ہی عمل اللہ کو مطلوب تھا کیوں کہ ان کی قوت مدرکہ ناقص تھی۔ اس لئے وہ دین کامل تھے یا یوں کہو اس وقت تک انسانی معاشرہ کے جو احوال ظاہر ہوئے یا ایک محدود زمانے تک ظاہر ہونے والے تھے ان کے مطابق اللہ نے احکام نازل فرمائے تھے۔ لہٰذا ان محدود احوال کے لحاظ سے وہ ادیان بھی کامل تھے۔

جبکہ حضور ﷺ کے زمانے میں تمام انسانی احوال ظاہر ہو چکے تھے۔ قوت مدرکہ اس معیار تک پہنچ چکی تھی کہ معرفت کے دقائق قبول کر سکتی تھی اور ان احوال میں رونما ہونے والے تغیرات میں اللہ کی مراد اور رضا واضح کر سکتی تھی۔ لہٰذا دین کے تمام اجزاء جمع کر دیے گئے۔ قیامت تک ظاہر ہونے والے شخصی اور انسانی احوال اور ان میں رونما ہونے والے ہر تغیر کے لئے اصول بیان کر دیے گئے۔ اس لئے اس دین کو حقیقی کمال نصیب ہوا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ باقی ادیان کے لئے کمال کا اعلان نہیں فرمایا گیا۔ جب اللہ نے اس دین کو کامل کہا تو ہو ہی نہیں سکتا کہ اس دین میں حقیقتِ کمال نہ ہو اور اللہ اسے کامل کہہ دیں۔ گو کہ چاند کی طرح اسے بھی تدریجاً کمال نصیب ہوا لیکن اس کی ہر حالت اپنی جگہ کامل ہی تھی۔ ہمیان الزاد کے مصنف شیخ محمد بن یوسف فرماتے ہیں

ولا یخفی ان دین المسلمین کامل فی کل وقت فاول حکم نزل کان الدین کاملا ولا یتصف بالنقص ولو کان سینزل بعدہ احکام کثیر فاذلا واجب ولا حرام الاما کان فیہ فکما

اور مخفی نہیں کہ مسلمانوں کا دین ہر وقت کامل ہے اس وقت سے جب پہلا حکم نازل ہوا اور نقص سے موصوف نہیں اگر چہ اس کے بعد بھی کثیر احکام نازل ہوتے رہے کیوں کہ ہر واجب اور حرام جو اس میں ہے تو دین کا کمال اسی کے ساتھ تھا جو اس میں ہے اور جب اس

لہ بماقبہ واذانزل فی غیرہ حکم اٰخر زاد او نقص فکمال الدین فی ھذا الوقت الاٰخر بمانزل فیہ الی ان لایبقی مایزل فیختم علی تمامہ الی القیامۃ

کے علاوہ کوئی تھوڑا یا زیادہ حکم نازل ہوا تو اس وقت دین کا کمال اس نازل شدہ حکم کے ساتھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ احکام کا نزول ختم ہو گیا پھر قیامت تک اس کے پورا ہونے کا فیصلہ کر لیا (المائدہ۔۳)

ابن عاشور کے بقول مسلمانوں کی جماعت کے ابتدائی احوال سادہ تھے۔ پھر ان کی ہمہ گیری میں اضافہ ہوا۔ پس دین ان کے احوال میں ان کی کشادگی کی مقدار کے ساتھ حاجات دور کرنے اور ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی تھا۔ کیوں کہ دین کی تعلیم تدریج کے ساتھ ہوئی تا کہ اس کا جماؤ مضبوط ہو جائے۔ کہتے ہیں

حتی استکملت جامعۃ المسلمین کل شؤون الجوامع الکبری وصاروا امۃ کاکمل مالکون امۃ فکمل من بیان الدین مابہ الوفاء بحاجاتھم کلھا

یہاں تک کہ جماعت المسلمین نے مسلمانوں کو اکٹھا کرنے والی تمام بڑی شانیں پوری کر لیں۔ وہ اکمل امت کی مانند ہو گئے تب بیان دین کے ساتھ وہ سب باتیں مکمل کر دی گئیں جن سے ان کی تمام حاجات پوری ہوں

اکمال دین کی جس تفسیر پر امام رازی نے کسی کا اعتراض پیش کر کے جواب دیا اس کو ایک اور انداز سے رد کرتے ہوئے پھر فرماتے ہیں

ولکن احوال الامم الامیۃ غیر مستوفاۃ فلماتوفرت کمل الدین لھم (المائدہ۔۳)

اور لیکن امت کے احوال امتوں میں پورا لینے والے نہیں تھے پس جب وہ بکثرت ہوئے تو دین ان کے لئے مکمل ہو گیا

دین کا کمال کیا ہے؟

سوال پیدا ہوتا ہے کمال دین کی صورت کیا ہے؟ اتنا تو معلوم ہو گیا کہ دین کامل ہے لیکن اس میں کمال کیا ہے؟ ہو سکتا ہے ایک کی نظر میں کوئی چیز کامل اور حسین ہو دوسرا اسے ناقص یا بدصورت سمجھے۔ کہتے ہیں حسن نظر میں ہوتا ہے۔ کمال کا معیار کیا ہے؟

معیار خود لفظ کمال سے ہی معلوم ہو جاتا ہے۔ موصوف بہ کمال چیز کے اجزاء کو اس ترتیب سے

اکٹھا کرنا کہ اس سے جو غرض ہے وہ پوری ہو جائے۔ یہ کمال ہے۔ جو چیز غرض کو جتنے احسن انداز سے پوری کرے گی وہ اتنی ہی باکمال ہوگی۔ وہ منظر کامل ہے جو ذوق نظر کی تسکین کردے۔ وہ آواز کامل ہے جو ذوق سماعت کے لئے سکون افزا ہو۔ مکان سے غرض اس میں رہنا سہنا اور موسمی حالات سے بچنا ہے۔ جس مکان سے یہ غرض اچھے طریقے سے پوری ہو جائے وہ مکان کامل ومکمل ہے۔

انسان کا واحد مقصد اللہ کی معرفت اور اس کی رضا حاصل کرنا ہے۔ انہیں حاصل کرنے کا ذریعہ دین ہے جس پر عمل کرنا شرط ہے۔ دین سے غرض یہ ہے کہ اس پر ہر حالت میں عمل ممکن ہو تاکہ انسان اپنا مقصد حاصل کر سکے۔ جو دین اس غرض کو جس قدر احسن طریقے سے پورا کرے گا وہ اتنا ہی کامل ہوگا۔ انسان صرف روح یا محض جسم نہیں۔ جسم وروح کا مجموعہ انسان ہے۔ دونوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جہاں ان میں ارفع امکانات ہیں وہیں کچھ داخلی خارجی کمزوریاں بھی ہیں۔ پھر انسانوں میں مختلف طبقے ہیں ہر ایک کی طبیعت، مزاج اور سوچ مختلف ہے۔ ذہنی اور نفسیاتی تقاضے ہر ایک کے علیحدہ ہیں۔ مقامی حالات کے مطابق ان کا رہن سہن اور طرز بود وباش فطرتاً الگ ہے۔ کھانے پینے کی اشیاء ہر جگہ کی الگ الگ ہیں۔ کسی کی طبیعت ترک لذت کی طرف مائل کسی کی حصول لذت کی طرف۔ کوئی سرمایہ دارانہ ذہنیت رکھتا ہے اور کوئی فیاضانہ۔ کسی کیلئے اپنا خیال بھی مشکل اور کوئی دوسروں کو سنبھالنے کا عزم رکھتا ہے۔ کوئی بچا کے خوش ہوتا ہے کوئی لٹا کے خوش ہوتا ہے۔ ہر زمانے میں تغیرات اور تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ ہر دور اپنے جلو میں نئے تمدنی مظاہر اور زندگی برتنے کے نئے رنگ لیکر طلوع ہوتا ہے۔ جو دین ہر زمانے، ہر طبقے اور ہر ذہن کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکے وہ کامل نہیں کہلا سکتا۔ انسانی نفسیات کا احساس کرنا، حالات کی رعایت رکھنا، سہولت اور آسانی کا خیال کرنا کمال کے لازمی نتائج ہیں۔ موضوع کی مناسبت سے یہ چند باتیں عرض کر دی ہیں ورنہ یہ بجائے خود ایک مستقل موضوع ہے۔ اس پر ابن عاشور نے جو کلام فرمایا اس کا مختصر مفہوم پیش خدمت ہے۔ فرماتے ہیں

ابتدا میں بشری جماعتوں کے حالات ایک معمول اور سادہ رسوم ورواج پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اسباب حاجات کے حساب سے آہستہ آہستہ اکٹھے ہوئے۔ پہلے فرد کا پھر خاندان کا پھر قبیلے کا نظام اکٹھا ہوا ایک معاشرہ وجود میں آیا۔ یہ زندگی کی قناعت، ہمتوں کی کمی اور اسباب کے کم ہونے کی حالت تھی۔ سفر کی مشقت راستے کے خطرات کی وجہ سے جماعتوں میں دوری تھی۔ اس وجہ سے وہ آمنے سامنے نہ ہو سکتے حالانکہ اسی سے امتیں باہم اخلاق شعور اور عادات حاصل کرتی ہیں۔

پس فکری حضارۃ میں رکاوٹوں کے مجموعے نے باہمی تعاون سے پھیر دیا اس حالت میں قوموں سے کیسے امید رکھی جا سکتی تھی کہ انہیں اس اصلاح کی دعوت دی جائے جو ان کے مدرکات کے دائرے سے وسیع ہو۔ اس لئے اللہ کی حکمت قدیم زمانوں میں سب کی اصلاح کرنے کے لئے ایک جامع شریعت مقرر کرنے سے متعلق نہ ہوئی۔ اور حق اس دوران تمام امتوں میں مشترک طور پر باقی رہا۔ پھر نقل مکانی جنگوں اور فتوحات سے لوگ باہم متعارف ہوئے۔ اس وقت کئی شریعتیں آئیں۔ چوتھی صدی عیسوی میں انسان زیادہ قریب ہوئے۔ اخلاق وعادات میں اخذ و اختلاط پایا گیا۔ امتیں ایک دوسرے تک پہنچ گئیں۔ مشرق ومغرب نے باہم توجہ کی۔ اس اختلاط وتمازج سے جو حسین لگا اسے لے لیا اور جو برا جانا اس سے احتیاط برتی۔ اس سے ایک نئی بیداری پیدا ہوئی۔ گوناگوں تہذیب وقوانین کی بنیاد رکھی گئی۔ افکار تغیرات قبول کرنے پر آمادہ ہوئے۔ امتیں اپنی عادات اور احوال کے بارے میں نئی تعلیمات قبول کرنے پر تیار ہوئیں۔ وقت اس مراد کو پہنچ گیا جو آخری اور عام شریعت کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

مناسب وقت اور مناسب قوم میں اللہ نے اس کا ظہور پسند کیا۔ اس کے اصول فطرت پر مبنی ہیں۔ دیکھنے والے کو کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی جو عقل سلیم کے مطابق نہ ہو۔ اسی اصل کی وجہ سے اسلام تمام امتوں کے لئے تمام زمانوں میں بہتر دین بن گیا۔ اور فطرت میں وہ پرانے آداب بھی داخل ہیں جن کے درست ہونے پر تمام عقلاء بشر کا اتفاق ہے۔ اس اصل کے نو مظاہر ہیں۔

(۱) عقائد کی اصلاح کی۔ ایسے اعتقاد پر ذہن کو اٹھایا جس میں کسی تردد کی ملاوٹ نہیں۔ جو ملمع سازی اور اوہام وخرافات سے پاک ہے۔ پھر یہ عقیدہ ایک بڑے کی فرماں برداری پر مبنی ہے اور

اس اعتراف پر کہ یہ ایک پوری صفات کے کمال کے ساتھ موصوف ہے۔ اس اعتراف سے اس کی فرماں برداری ایک اختیاری چیز بن جاتی ہے۔ پھر اس اعتراف کی وجہ یہ ہے تاکہ یہ کمالات معتقد کا مطمع نظر ہو جائیں اور وہ انہیں اختیار کرے پھر تمام لوگوں کو اپنے عقائد کی تطہیر پر آمادہ کیا تاکہ اختیار کی ابتدا ان میں متحد ہو جائے۔ اور عقائد کی اصلاح اہم ہے اسلام نے جس کی ابتدا کی اور اس کے زیادہ درپے ہوا۔ کیوں کہ فکر کی اصلاح ہر اصلاح کا مبداء ہے۔ پھر اسی اسلامی عقیدے سے عزت نفس، اصابت رائے، فکر کی آزادی اور دوسرے فضائل کے علاوہ لوگوں میں مساوات پیدا ہوتی ہے۔

(۲) اس نے نفوس اور نظام حیات کی اصلاح کو تزکیہ اور تشریع کے ساتھ جمع کر دیا۔ ایسے وقت میں جب بڑے بڑے دین زندگی کے نظام تک ذرا بھی نہ پہنچ سکے۔ بعض اس تک چلے لیکن پورا حق ادا نہیں کر سکے۔ ان ادیان کا بڑا اہتمام مواعظ اور عبادت کی طرف پھر ہوا تھا۔

(۳) دلیل سے بات کرنا، مخاطبین کو کئی طرح سے الزام دینا اور ترغیب و ترہیب کے ساتھ احکام کی علتیں بیان کرنا اس دین کی خصوصیت ہے۔ اور یہ مخاطبین کے ذہنی مرتبوں کی پاسداری کرتا ہے۔

(۴) یہ دین تمام انسانوں کے لئے دعوت عامہ لیکر آیا۔ اور اس سے پہلے کوئی دین اس کی طرف سبقت نہیں کر سکا۔

(۴) دوام اور ہمیشگی بھی اس کی ایک خصوصیت ہے۔ کسی رسول نے اس بات کی دعوت نہ دی کہ اس کی شریعت ہمیشہ باقی رہے گی۔ بلکہ کوئی رسول اور کوئی کتاب ایسی نہ تھی جسمیں ایک آنے والے رسول کی بشارت نہ دی گئی ہو۔

(۵) فروعی احکام میں کمی کی۔ ان کے اصول لایا اور تفریعات کو مجتہدین کے استنباط پر چھوڑ دیا

(۶) ادیان کے تاکیدی احکام سے مقصود ان پر عمل ممکن کرنا ہے۔ صحیح تربیت ہی نفوس اور شری خیالات کے درمیان حائل ہو کر نفوس کے قریب ہوتی ہے۔ یہ اصول اخلاق میں سے ہے۔ دوسری شریعتیں لوگوں کو احکام کی پیروی بجا آوری کے ساتھ آمادہ کرتی تھیں۔ اسلام نے بجا آوری

کے ساتھ دوسرا طریقہ بھی اختیار کیا اور ان ذرائع کو بند کر دیا جو لوگوں کو فساد تک پہنچا ئیں۔

(۷) لوگوں کے ساتھ نرمی کی گئی۔ یہاں تک نرمی کی صورت میں قانون کا ظہور چاہنے کے باوجود بتقاضائے مصلحت لوگوں کو ان کے فائدوں پر ابھارنے پر اکتفا کیا۔ سابقہ شریعتیں پیروی پر شدت کے ساتھ ابھارتی تھیں۔ لہذا وہ بقا کے لئے درست نہ ہوئیں۔ کیوں کہ ان میں امتوں کے سخت حال کی خاص زمانے میں رعایت کی گئی۔

(۸) اسلام میں شریعت کو (ہر مکان اور زمان میں) حکومت کے ساتھ ملایا گیا۔ یہ صرف اس کی خصوصیت ہے۔ کیوں کہ شریعت سازی کے کوئی معنی نہیں مگر یہ کہ امت کے لئے قانون کی بنیاد رکھی جائے۔ اور قوۃ و حکومت کے بغیر قانون کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ امت کو نظام اور عمل میں متحد کرنے اور حکومت کو شریعت سے ملانے کے ساتھ شریعت کا عام ہونا ممکن ہوتا ہے۔

(۹) اصول دین کی وضاحت کی گئی۔ قرآن میں ان باتوں کی تکرار کی گئی جن سے شریعت کی دلیلیں چھانی گئیں۔ اس سے شریعت باطل تاویلات سے پاک ہو گئی۔

مفسر عثمانیؒ نے جامع خلاصہ یوں ارشاد فرمایا

یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر اور قوانین و احکام میں پورا توسط اور اعتدال موجود ہے۔ جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیان سماویہ میں محدود و نا تمام تھے ان کی تکمیل و تعلیم اس دین قیم سے کر دی گئی، قرآن و سنت نے حلت و حرمت وغیرہ کے متعلق نصاً یا تعلیلاً جو احکام دیے ان کا ایضاح و ظہور تو ہمیشہ ہوتا رہے گا لیکن اضافہ یا ترمیم کی مطلقاً گنجائش نہ چھوڑی، سب سے بڑا احسان تو یہ ہی ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا مزید برآں اطاعت و استقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دستر خوان تمہارے لئے بچھایا۔ حفاظت قرآن، غلبہ اسلام اور اصلاح عالم کے سامان مہیا فرما دیے

(المائدہ۔۳)

رحلت النبی ﷺ:

سدا رہنے کے لئے اس دنیا میں کوئی نہیں آیا۔ دنیا ایک عارضی ٹھکانہ ہے۔ جو بھی آتا ہے اپنا وقت

پورا کر کے چلا جاتا ہے۔ اپنی ذمہ داری پوری کر کے جائے یا غفلت میں وقت گذار کر جائے۔ عشاق کو دید سے سیری ہوتی ہے۔ ان کی روح دید اور وصل کے لئے تڑپتی اور مچلتی ہے۔ موت ایک پل ہے جو دوست کو دوست سے ملاتا ہے۔ آپ ﷺ نبی بن کر تشریف لائے۔ بعثت نبوی کا مقصد اور آمد نبی کی غرض پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اللہ نے اکمال دین کا اعلان کر کے آگاہ فرما دیا کہ آپ کو بھیجنے کا جو مقصد تھا وہ پورا ہو چکا ہے۔ مقصد پورا کرنے کے بعد واپس لوٹنا ہی مسافر کا کام ہے۔ اکمال دین آپ کے انتقال پرملال کی نشانی اور رحلت وطن کی علامت ہے۔ اس کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے سمجھا۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سوا تمام صحابہ خوش ہوئے

فانه بکی فسئل عنه فقال هذه الایة تدل علی قرب وفاة رسول الله صلی الله علیه وسلم فانه لیس بعد الکمال الا الزوال (رازی۔ سالمائدہ ۳)

آپ رضی اللہ عنہ رونے لگے۔ رونے کی وجہ پوچھی گئی تو فرمایا یہ آیت دلیل ہے کہ حضور ﷺ کی وفات قریب ہے۔ کیوں کہ کمال کے بعد زوال ہی ہوتا ہے۔

اسی طرح کی روایت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی مروی ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو

بکی عمر فقال له النبی صلی الله علیه وسلم مایبکیك قال ابکانی انا کنافی زیادة من دیننافاما اذا اکمل فانه لم یکمل شیء الا نقص فقال صدقت (ابن کثیر۔ المائدہ ۳)

عمر رضی اللہ عنہ پر گریہ طاری ہو گیا حضور ﷺ نے پوچھا تمہیں کس چیز نے رلایا؟ کہا میں روتا ہوں کہ ہم اپنے دین میں زیادتی پر تھے جب مکمل ہو گیا تو ہر چیز مکمل ہونے کے بعد ناقص ہی ہوتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا تو نے سچ کہا۔

اس سے بھی سانحہ وفات کا استنباط کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کے صرف ۸۱ روز بعد آپ ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کے نزول کے کل دو مہینے اکیس دن بعد انتقال فرمایا۔ نکتہ رس و دقیقہ سنج اصحاب نبی آیت مضمون ہی سے سمجھ گئے تھے کہ اب دین ہر طرح مکمل اور مستحکم ہو چکا۔ نبی کے

مشن کی تکمیل ہو چکی نبی کو اب دنیا میں مزید قیام کی ضرورت کیا رہی اور زمانہ مفارقت نبوی کا قریب آ گیا۔ (تفسیر ماجدی۔ المائدہ ۳)

مقام مصطفی ﷺ:

دین کامل کرنا ایک اعزاز ہے۔ اس ایک اعزاز میں کتنے اعزاز پوشیدہ ہیں یہ بتایا جا چکا ہے۔ اکمال دین دراصل میرے مصطفی کا اعزاز ہے کیوں کہ لکم سے پہلے اس میں لك ملحوظ ہے۔ یہ ایسا اعزاز ہے جو اللہ کی ساری مخلوق میں صرف حبیب خدا ﷺ کو حاصل ہوا۔ ہمیں اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے کہ یہ اعزاز رسول اللہ ﷺ کو کیوں دیا گیا؟ اکمال دین میں مقام مصطفی اس سوال کے جواب پر موقوف ہے۔

اعزازات بلاسبب عطا نہیں ہوتے۔ باکمال لوگ ہی اعزاز حاصل کرتے ہیں۔ ذات میں جب تک کمال موجود نہ ہو تب تک تمغے نہیں ملتے کیوں کہ اعزاز فضل و کمال کے بعد ہی حاصل ہوتا ہے۔ ساٹھ سالہ پاکستانی تاریخ میں سینکڑوں فوجی آبروئے وطن پر نثار ہوئے۔ نشان حیدر کیلئے گنے چنے آٹھ دس جاں بازوں کا انتخاب ہی ہوا۔ کیوں کہ یہی افراد وہ کمال حاصل کر سکے جو نشان حیدر پانے کے لئے ضروری ہے۔ اس کے لئے فداکارانہ جاں بازی اور شجاعت و بسالت کا خاص کمال چاہیے۔ اس نشان کے ملنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ صاحب تمغہ کو مطلوبہ کمال پہلے حاصل ہو چکا ہے۔ کسی بھی اعزاز میں تین باتیں ہوتی ہیں۔

(ا) اعزاز کا اس کام سے ربط و تعلق جس پر اعزاز ملتا ہے۔

(ب) اس کے ساتھ خاص کمال اور خاص مقام متعلق ہوتا ہے

(ج) اسی سے اس شخص کا مقام و مرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے جسے اعزاز دیا گیا۔ اعزاز اس مقام کا اظہار اور اس رتبے کی نشان دہی کرتا ہے۔

(د) بڑے اعزاز میں صرف اعلان، سند، سرٹیفکیٹ، شیلڈ یا تمغہ ہی نہیں ہوتا بلکہ مراعات بھی اس کے ساتھ ہوتی ہیں مثلاً رقم وغیرہ۔

اب دیکھنا چاہیے مصطفی ﷺ کو وہ کونسا مقام اور کمال حاصل ہے جس پر اللہ نے اپنے حبیب کو یہ

اعزاز عطا فرمایا۔ ابتدا میں یہ بات معلوم ہو چکی ہے اللہ کو اس دنیا میں انسان سے اپنی معرفت مطلوب ہے۔

لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا	تاکہ آزمائے تم کو کہ کون تم میں اچھا کرتا ہے کام۔

عمل سے ہی معرفت میں ترقی ہوتی ہے۔ اللہ کی پہچان حاصل کرنا ہی انسان کا کمال ہے۔ اور یہی کمال اللہ کو مطلوب بھی ہے۔ معرفت جتنی بڑھتی ہے بندے کی طرف سے اخلاص اور اللہ کی طرف سے محبت اور عنایات میں بھی اتنا ہی اضافہ ہوتا ہے۔

ہر انسان کے لئے معرفت کا ایک خاص درجہ ہے۔ جو اللہ کے علم میں مقدر ہے۔ دین اسی لئے عطا فرمایا۔ ایک خاص مقام معرفت سب سے جدا، سب سے اعلیٰ اور سب سے اونچا تھا۔ جس سے اوپر کسی بھی بشر کے لئے رسائی کی کوئی گنجائش نہیں۔ کوئی مرتبہ نہیں۔ وہ مقام معرفت جو ایک صرف ایک کا مقدر اور ایک کا نصیب تھا۔ سارے انسان اپنی پوری قوت صرف کر کے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہ ایک ذات والا صفات، وہ ایک ہستی محمد ﷺ کی تھی۔ جو اعمال اللہ نے آپ ﷺ پر لازم کیے تھے ان میں سے حج بھی تھا۔ جیسے ہی آپ ﷺ نے دوران حج وقوف فرمایا وہ مقام معرفت آپ نے حاصل کر لیا۔ ادھر وہ مقام معرفت طے ہوا، اور محبوبیت کا وہ مخصوص درجہ آپ کو ملا ادھر اللہ نے اعلان فرما دیا

اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا	آج میں پورا کر چکا تمہارے لئے دین تمہارا اور پورا کیا میں نے تم پر احسان اپنا اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے اسلام کو دین

معلوم ہوا کمال میں کوئی آپ ﷺ کے ہم پلہ نہیں۔ معرفت میں کوئی آپ ﷺ کا ثانی نہیں۔ اور محبوبیت میں کوئی آپ ﷺ کی نظیر نہیں۔ یہ ہے **مقام مصطفی** ﷺ۔ ابن عاشور نے جو فرمایا صحیح فرمایا کہ آپ ﷺ اللہ کی مراد کے متمم ہیں۔ دین دینے سے اللہ کی جو مراد تھی اس کی تکمیل آپ ﷺ نے کی۔ کائنات بنانے سے اللہ کا جو مقصود تھا اسے آپ ﷺ نے پورا فرمایا۔ جو غرض تھی وہ حاصل ہو گئی۔ جو مراد تھی وہ پوری ہو گئی تو اس کے بعد آپ بھی دنیا سے پردہ فرما گئے۔ جس ہستی کی

خاطر کارخانہ قدرت سجایا گیا تھا وہ مقصود کائنات تمام کر کے خلد بریں کی مکیں ہو گئی۔

رہے نام اللہ کا

جب یہ جہان آپ ﷺ کے لئے بسایا گیا تو آپ کے بعد اس کو باقی رکھنے کی کیا ضرورت؟ اکمال دین علامت تھی کہ مراد پوری ہو گئی۔ علامت تھی کہ نبوت کا خاتمہ ہے۔ علامت تھی کہ آپ کے تشریف لیجانے کا وقت نزدیک آ گیا ہے۔ علامت ہے کہ اس جہان کی بساط بھی بس اب لپیٹے جانے کو ہے۔ بہت دیر نہیں مگر کچھ وقت لگے گا۔ کچھ عرصہ یہ طلوع و غروب ہوتا رہے گا۔ رتیں بدلتی رہیں گی۔ اللہ کی حکمت کے تحت جب آپ ﷺ کی وہ تمام شیون جنکا تعلق مخلوق سے ہے ظاہر ہو گئیں روئے زمین پر دین صرف اللہ کا ہو گیا تو یہ بنجارہ بھی لاد دیا جائے گا۔ حج جو اللہ کے لئے بندے کی دیوانگی و فرزانگی اور عشق و محبت کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس سے اس کی فضیلت بھی عیاں ہوتی ہے۔ کیوں کہ اسی کی ادائیگی کے بعد آپ کو یہ فضل و شرف اور مرتبہ و مقام عطا ہوا۔ اس سند سے معلوم ہوا آپ ﷺ دنیا سے کامیاب و بامراد تشریف لے گئے۔ کمال معرفت اور رضا لازم و ملزوم ہیں۔ اس اعزاز کے ساتھ اللہ نے اپنے حبیب کو مراعات کیا عطا فرمائیں اور رضا کی خوشخبری کیا سنائی؟

اس بارے میں قاضی ثناء اللہ تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں

وجاز ان یکون المراد باکمال الدین بلوغہ صلی اللہ علیہ وسلم فی معارج القرب الی مرتبۃ یغبطہ الاولون والاخرون حتی غفر لکمال محبوبیتہ جمیع ذنوب امتہ حتی الدماء والمظالم (المائدہ۔۳)	اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تکمیل دین سے مراد ہو رسول اللہ ﷺ کو قرب کے اس مرتبے تک پہنچا دینا جو اگلے پچھلے باکمال انسانوں کے لئے قابل رشک ہے یہاں تک کہ آپ کے مرتبہ محبوبیت پر فائز ہونے کیوجہ سے ہی اللہ نے آپ کی امت کے تمام گناہ معاف فرما دیے خواہ وہ اللہ کے حقوق سے تعلق رکھتے ہوں یا بندوں کے حقوق سے حد یہ کہ آپس خوں ریزیاں اور مظالم بھی معاف کر دیے گئے (مظہری اردو)

خاتمہ

الحمد للہ ثم الحمد للہ۔ ۱۰ ذی الحجہ ۱۴۲۸ کی رات جو کام شروع کیا تھا کمپوزنگ سمیت اس کا ایک حصہ آج ۳۰ صفر ۱۴۲۹ ہجری کو مکمل ہو گیا۔ خوبی اللہ ہی کے لئے ہے۔ جس کی بارگاہ والا سے بے مایہ دانش اور تہی دست عمل کو یہ توفیق ارزانی ہوئی۔ ایک بے علم و ہنر کو اس نے یہ سعادت بخشی۔ اور مجھ سے اپنے حبیب ﷺ کی سیرت و شان پر یہ عنبریں ارمغان مرتب کروا دیا۔ یہ اس کا کرم، اس کی دیا، اس کی مہربانی اور اسی کی عطا ہے۔

گر قبول افتد زہے عز و شرف

پڑھنے والوں سے التجا ہے دعا فرمائیں مجھ سمیت اللہ میرے والدین کریمین اور اساتذہ و شیوخ کی مغفرت بھی فرمائے اور مجھے مزید حوصلہ اور توفیق بھی عطا کرے تا کہ اس سلسلے کے بقیہ عنوانات بھی پایہ تکمیل تک پہنچ کر اپنی خوشبو سے مشام عشاق کو معطر کر سکیں۔

مراجع و مصادر

۱) جامع البیان فی تاویل القرآن ابن جریر الطبری (۳۱۰ھ)
۲) تفسیر القرآن العظیم عماد الدین اسماعیل بن عمر بن کثیر (۷۷۴ھ)
۳) تفسیر معالم التنزیل حسین بن مسعود البغوی (۵۱۶ھ)
۴) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والمثانی شہاب الدین بن محمود الالوسی (۱۲۷۰ھ)
۵) تفسیر البحر المحیط ابو حیان محمد بن یوسف (۷۵۴ھ)
۶) تفسیر فتح القدیر الشوکانی (۱۲۵۰ھ)
۷) تفسیر زاد المسیر ابن جوزی (۵۹۷ھ)
۸) تفسیر مفاتیح الغیب فخر الدین محمد بن عمر الرازی (۶۰۶ھ)
۹) تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور ابراہیم بن عمر البقاعی (۸۸۵ھ)
۱۰) تفسیر بحر العلوم سمرقندی (۳۷۵ھ)
۱۱) تفسیر اللباب ابن عادل (۸۸۰ھ)
۱۲) تفسیر انوار التنزیل واسرار التاویل ناصر الدین عبداللہ بن عمر البیضاوی (۷۹۱ھ)
۱۳) تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل عبداللہ بن احمد النسفی (۷۱۰ھ)
۱۴) تفسیر علامہ معین الدین بن صفی نیشاپوری (غرائب القرآن ورغائب الفرقان) (۷۲۸ھ)
۱۵) تفسیر النکت والعیون ابو الحسن علی بن محمد الماوردی (۴۵۰ھ)
۱۶) تفسیر ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم ابو السعود محمد بن محمد (۹۸۲ھ)
۱۷) تفسیر الدر المنثور فی التاویل بالماثور جلال الدین عبدالرحمن بن ابی بکر السیوطی (۹۱۱ھ)

۱۸) تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل ابوالحسن علی بن محمد الخازن (۷۲۵ھ)
۱۹) تفسیر الجواہر الحسان فی تفسیر القرآن ابوزید عبدالرحمٰن بن محمد الثعالبی (۸۷۵ھ)
۲۰) تفسیر التحریر والتنویر ابن عاشور (۱۳۹۳ھ)
۲۱) تفسیر اضواء البیان محمد الامین بن محمد المختار الشنقیطی (۱۳۹۳ھ)
۲۲) تفسیر فی ظلال القرآن سید قطب (۱۳۸۷ھ)
۲۳) تفسیر لطائف الاشارات القشیری امام عبدالکریم بن ہوازن القشیری (۴۶۵ھ)
۲۴) تفسیر الجامع لاحکام القرآن ابوعبداللہ محمد بن احمد القرطبی (۶۷۱ھ)
۲۵) روح البیان فی تفسیر القرآن اسمٰعیل حقی (۱۱۲۷ھ)
۲۶) تفسیر البحر المدید فی تفسیر القرآن المجید ابن عجیبہ (۱۲۲۴ھ)
۲۷) تفسیر الوسیط فی تفسیر القرآن الکریم محمد سید طنطاوی (۱۹۲۸ء)
۲۸) ایسر التفاسیر ابوبکر الجزائری (۱۹۲۱ء)
۲۹) تفسیر تیسیر الکریم الرحمٰن فی تفسیر الکلام المنان عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی
۳۰) تفسیر تیسیر التفسیر اطفیش اباضی (۱۳۳۲ھ)
۳۱) تفسیر کتاب اللہ العزیز الہوازی اباضی (القرن ۳ھ)
۳۲) ہمیان الزاد الی دار المعاد محمد بن یوسف اباضی (۱۳۳۲ھ)
۳۳) المفردات فی غریب القرآن ابوالقاسم الحسین بن محمد راغب اصفہانی (۵۰۲ھ)
۳۴) تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز دہلوی (۱۲۳۹ھ)
۳۵) تفسیر مظہری عربی اردو قاضی ثناءاللہ پانی پتی
۳۶) تفسیر معارف القرآن مفتی محمد شفیع (۱۳۹۶ھ)
۳۷) تفسیر معارف القرآن مولانا ادریس کاندھلوی (۱۳۹۴ھ)
۳۸) موضح قرآن شاہ عبدالقادر دہلوی (۱۲۳۰ھ)
۳۹) ترجمہ شیخ الہند مع تفسیر عثمانی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی (۱۳۶۹ھ)
۴۰) تفسیر ترجمان القرآن ابوالکلام آزاد (۱۹۵۸ء)

۴۱) تفسیر ماجدی مولانا عبدالماجد دریابادی
۴۲) تفسیر جواہر القرآن شیخ القرآن مولانا غلام اللہ خان (۱۴۰۰ھ)
۴۳) لغات القرآن مولانا عبدالرشید نعمانی
۴۴) النہایہ فی غریب الحدیث والاثر ابن اثیر
۴۵) لسان العرب محمد بن مکرم بن منظور الافریقی
۴۶) تاج العروس من جواہر القاموس محمد بن محمد مرتضی زبیدی
۴۷) الفروق اللغویہ ابوہلال عسکری (۴۰۰ھ)
۴۸) القاموس الوحید وحید الزمان کیرانوی (۱۹۹۵ء)
۴۹) فرہنگ آصفیہ مولوی سید احمد دہلوی (۱۹۱۸ء)
۵۰) مصباح المنیر فی غریب الشرح الکبیر
۵۱) کشاف اصطلاحات الفنون شیخ محمد اعلیٰ تھانوی

طوبیٰ ریسرچ لائبریری

اسلامی اردو، انگلش کتب،

تاریخی، سفرنامے، لغات،

اردو ادب، آپ بیتی، نقد و تجزیہ

toobaa-elibrary.blogspot.com